شہنشاہِ سخن

غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر

ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی

مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ، کراچی

شہنشاہِ سخن

مرزا غالبؔ

کے فارسی کلام پر

ناقدانہ نظر

مصنّف

سیّد عارف شاہ گیلانی

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ۔ کراچی

بیادِ

ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن صاحب

اشاعت اول	سنہ ۱۹۷۰ء مطابق سنہ ۱۳۹۰ھ
صفحات	۴۲۹
تعداد	دو ہزار
طابع	الحاج حکیم محمد تقی دہلوی
کتابت	محمد رفیق
ناشر	مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی
مطبع	مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی
قیمت	اٹھارہ روپیہ

فہرست مضامین

فہرست مضامین

بابِ دُوم

(کلام پر تبصرہ)



عملِ چغتائی (غیر مطبوعہ)

حرفِ اوّل

درتۂ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اِس کتاب کا عنوان دراصل میرے اُس تحقیقی مقالہ کا موضوع ہے، جو میں نے بزبانِ انگریزی اگست ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کے سلسلے میں بمبئی یونیورسٹی کو پیش کیا تھا، اور جس کو ممتحنین کی حسبِ ذیل رائے کی روشنی میں خلعتِ قبولیت سے سرفراز کیا گیا تھا:۔

"مسٹر گیلانی نے مرزا غالبؔ کے کلام اور متعلقہ ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اور اس کی فارسی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اُس کی فارسی شاعری اس کی اردو شاعری سے زیادہ مقتدر رہی ہے، مگر آج تک کسی ادیب کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی، غالبؔ کا اردو اور فارسی کلام اَدَق ہے، یعنی عام فہم نہیں ہے، اسی لئے اُس کا مطالعہ قدرے دِقّت طلب ہے، لیکن ہمیں خوشی محسوس ہوتی ہے، کہ مسٹر گیلانی ان تمام دقتوں پر مکمل عبور حاصل کرنے میں بکلّی کامیاب ہوئے ہیں، انہوں نے بڑی مستعدی اور دیدہ ریزی سے شاعر کے اُن کاملانِ فن کے کلام سے تطبیق کی ہے، جس کا اس نے اِتباع کیا ہے، مسٹر گیلانی کا زیرِ نظر مقالہ ہند و پاکستان کے فارسی ادب کی صنفِ شاعری میں ایک بیش بہا اور قابلِ قدر اضافہ ہے، اگرچہ ہمیں مصنّف کے چند خیالات سے اتفاق نہیں ہے، مگر یہ نہایت معمولی اور غیر اہم نِکات ہیں، اور اِس پُر مغز، مفید اور رائے صائب سے مملو مقالہ کی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔"

بعد میں، ضروری حک واصلاح اور ترمیم اور اضافے کے بعد ۱۵، نومبر ۱۹۵۶ء کو حکومت سندھ کی اجازت سے یہی مقالہ کتاب کی شکل میں سندھ گورنمنٹ پریس، واقع شاہراہ عبداللہ ہارون[1]، کراچی سے طبع کرواکر شائع کیا گیا، اب کم وبیش چودہ سال کے بعد اس کا اردو ایڈیشن مزید اضافہ کے بعد نئے عنوان اور نئی شان سے قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ ع

گر قبول اُفتد زہے عِزّو شرف

میرے لئے کلامِ غالبؔ کا مطالعہ طالب علمی کے زمانے سے انتہائی انبساط کا موجب رہا ہے، جب کہ پہلی مرتبہ سندھ مدرسۃ الاسلام[2]، کراچی کے لائق اُستاد عبدالقیوم خان[3] شیروانی اپنے مخصوص انداز میں اردو شعراء کے کلام کی بالعموم، اور مرزا غالبؔ کے کلام بلاغت نظام کی بالخصوص باریکیاں اور خوبیاں بیان فرماتے تھے، یہی وجہ ہے، کہ میں غالبؔ کا شیدائی ہوں، اور اس کے "گنجینۂ معانی" اور "نقشہائے رنگ رنگ" کا دلدادہ، سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا،

---

[1] اس کا اصلی نام وکٹوریا روڈ تھا، موجودہ نام اکتوبر ۱۹۶۹ء میں رکھا گیا ہے،

[2] یہ مسلمانانِ سندھ کی اوّلین اور قدیمترین درسگاہ ہے، جس کو مرحوم خان بہادر حسن علی آفندی نے ۳۱- اگست ۱۸۸۵ء کو قایم کیا تھا، بابائے ملّت حضرت قائداعظم محمد علی جناح اس عظیم تعلیمی ادارے کے ممتاز ترین تلمیذ تھے، مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "مارچ آف ایجوکیشن"، شمارۂ اکتوبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۷، یہ سہ ماہی رسالہ میری نگرانی میں شائع ہوتا ہے،

[3] آپ انبالہ کے متوطن تھے، آپ کو انگریزی، اردو اور ریاضی پر مکمل عبور تھا، بیس سال تک سندھ مدرسہ کرانیکل کے ایڈیٹر بھی رہے، مجھ پر بیحد مہربان تھے، آپ نے اکتوبر ۱۹۶۹ء کو بعمر ۷۲ سال وفات پائی،

صوبۂ بمبئی کے محکمۂ تعلیم میں میرا تقرر ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کو بمقام دھارواڑ[1] کرناٹک کالج میں ہوا تھا، میری تمنا تھی، کہ کسی طرح بمبئی پہنچ کر ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کا اعزاز حاصل کروں، جوئندہ یابندہ، میری امید برآئی، کیونکہ پرنسپل فیرن صاحب[2] اور اسمٰعیل یوسف کالج[3]، جوگیشوری، بمبئی کے پرنسپل جناب ڈاکٹر محمد بدل الرحمٰن صاحب[4] کی وساطت سے میرا تبادلہ ۱۷ رنومبر ۱۹۳۹ء کو صوبہ کی قدیم ترین اور

---

[1] بلگام کے جنوب میں واقع یہ صحت افزا مقام روم کی طرح سات ٹیلوں پر آباد ہے، اس پُر فضا اور رُوح پرور شہر میں میں نے ڈھائی سال گزارے ہیں، یہاں کے امرود اور ملغوبہ آم مشہور ہیں، یہاں سے کچھ فاصلہ پر ضلع کنارا میں واقع ہلیال کے جنگلات میں وہ مقام موجود ہے، جہاں رامچندرجی نے سیتا اور لچھمن کی معیت میں "بن باس" کاٹا تھا، یہ مقام میں نے دیکھا ہے، [2] اے۔ سی فیرن صاحب ویلز کے رہنے والے تھے تاریخ کے پروفیسر تھے، تاہم سے بیزار تھے، مسلمان بچوں کے لئے "مسلم طلبا امدادی فنڈ" قائم کر رکھا تھا، ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوکر دھارواڑ میں اقامت گزین ہو گئے تھے، [3] یہ کالج امیر نہوہ (نہوہ بمبئی کے قریب چھوٹا سا جزیرہ ہے) سر محمد یوسف کے گیارہ لاکھ روپے کے عطیہ سے حکومت بمبئی نے مسلمان بچوں کیلئے ۱۹۳۰ء میں قائم کیا تھا، [4] آپ "اندلس میں مسلمان" کے مصنف مولوی خلیل الرحمٰن کے منجھلے فرزند تھے، کچھ عرصہ کیلئے اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی اور عربی کے صدر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں، اور مارچ ۱۹۳۰ سے لیکر مئی ۱۹۴۷ء تک جوگیشوری کالج کو بام عروج کو پہنچایا، آپنے ۱۵-۱۶ مئی کی درمیانی شب میں بعارضۂ قلب اکیاون سال کی عمر میں وفات پائی، اور کالج کی مسجد کے برآمدہ میں مدفن پایا، آپنے الجاحظ پر ایک سیر حاصل مقالہ بزبان انگریزی یادگار چھوڑا ہے، پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" کی جلد چہارم صفحہ ۴۴ پر انکے تبحر کو سراہا ہے، آپ ایک وسیع الاخلاق انسان اور شفیق اُستاد تھے، آپ نے بمبئی کے مسلمانوں کی اسی طور پر خدمت کی، جس طرح سر ڈاکٹر ضیاء الدین نے مسلمانانِ ہند کی کی تھی،

بہترین درسگاہ ایلفنسٹن[1] کالج بمبئی میں عمل میں آیا، اس مشہور و معروف کالج میں مجھے تین، مشفق و مہربان پرنسپل صاحبان[2] کی رفاقت اور سرپرستی کا نوسال تک شرف حاصل رہا ہے، یہ تھے تو اہل ہنود، مگر مجھ پر بیحد مہربان تھے،

بمبئی پہنچ کر میں نے پہلی فرصت میں ڈاکٹر رحمٰن کے خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کر دیا، وہ بہت خوش ہوئے، اور اسی وقت مقالہ کا مضمون تجویز کیا، جس کا موضوع اردو گو شعرار کی فارسی شاعری تھا، چنانچہ جلد ہی "کتابیات" تیار کر لی گئی، ادھر یونیورسٹی نے "فیلو شپ" کی بھی منظوری دیدی،

دوران کتب بینی، میں نے شدت سے محسوس کیا، کہ صرف غالب ہی کے فارسی کلام پر مقالہ تیار کرنا زیادہ مناسب و موزوں ہوگا، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کی حیات اور اس کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر موضوع تجویز فرما کر یونیورسٹی سے منظور کرایا۔

میں نے دن رات ایک کر کے متعلقہ کتب کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا، اور

---

[1] یہ کالج ۱۸۵۶ء میں قائم ہوا، اور بمبئی کے سابق گورنر لارڈ ماؤنٹ اسٹوآرٹ ایلفنسٹن کے نام سے منسوب کیا گیا، اس کالج کا ہر پروفیسر آگے چل کر پرنسپل کے عہدہ پر ضرور فائز ہوتا ہے،

[2] جی۔بی جتھار صاحب، بی۔این۔سیل صاحب اور کے۔آر گنجیکر صاحب میرے پرنسپل تھے، اول الذکر غالب سے کم ظریف نہ تھے، آپ کا شمار ہندوستان کے ماہرین اقتصادیات میں ہوتا تھا، سیل صاحب فلسفہ کے پروفیسر تھے، اور گنجیکر صاحب ریاضیات میں کیمبرج یونیورسٹی کے "اسٹار رینگلر" تھے، ملازمت میں میرا پہلا پرنسپل آر۔پی پٹوردھن صاحب تھے، آپ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے عہدے سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے تھے، یہ چاروں حضرات منصف مزاج تھے، اور کام کی قدر کرتے تھے،

ضروری اقتباسات اخذ کر ڈالے، مگر اکتوبر ۱۹۴۶ء تک مقالہ کی ابتدا نہ ہو سکی، کتابیں فرصت کے پُرسکون لمحات ہی میں لکھی جاتی ہیں، میرے لئے فرصت عنقا تھی، اُستادِ مکرّم کے متواتر تقاضوں کے باوجود طبیعت حاضر نہ ہوئی، نیز شاعر کے کلیاتِ نثر فارسی کی غیر موجودگی بھی رکاوٹ بنی رہی، کیونکہ یہ نسخہ باوجود سعیٔ بلیغ کے دستیاب نہ ہوسکا تھا، ایسے میں قبلہ ڈاکٹر صاحب یہ فرما کر کہ "زمانہ ترقی کر رہا ہے، اور آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے"، مجھ سے کبیدہ خاطر ہو گئے، ان کی رنجش نے تازیانے کا کام کیا، ان کی یہی ادا اس کتاب کا باعث ہوئی، بے شک ؎

صد دُرستی در شکستِ خضر ہست

اِس جہان رنگ و بو میں ہر کام وقت کا مرہون منت ہے، آخر کار وہ وقت بھی آگیا، جب میں نے مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔

موسم گرما کی تعطیلات کے بعد جب ۲۰۔جون ۱۹۴۶ء کو کالج کھلا تو اسٹاف کے اِجلاس میں پرنسپل سِیَل نے مرکزی حکومت کا ایک سرکلر پڑھ کر سنایا، جس کی رُو سے آئندہ ترقی کا انحصار صرف اعلیٰ تعلیم پر تھا، میں نے اُسی وقت مقالہ تیار کرنے کا عزم بالجزم کر لیا، اور کالج سے سیدھا بھنیڈی بازار پہنچا، اور شرف الدین و اولادہٗ کی دکان پر جا کر تیسری بار کلیاتِ نثر کا تقاضا کیا، کاغذ کی ایک پڑیا لا کر میرے سامنے رکھ دی گئی، میں نے شوق اور خوف کے ملے جُلے جذبات سے پڑیا میں سے ایک بوسیدہ سی کتاب نکالی جس کا ہر ورق ایک دوسرے سے جدا تھا، خوبیٔ قسمت سے وہ کلیات ہی کا نسخہ نکلا، جس کو منشی نولکشور نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے شائع کیا تھا، اب میرے سامنے ایک درخشاں مستقبل تھا، اب کوئی مجھے اس مستقبل سے ہمکنار ہونے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا، قارئین کرام میرے جذبات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، چنانچہ اس مقالہ کی تیاری میں "شوق" اور "خوف"، برابر کے شریک ہیں،

میں سیدھا اپنے گھر (۳۳-اے سینٹ پال روڈ، باندرہ) آیا، اور اپنی اہلیہ اختر سلطان اور ان کے برادرِ خورد قمر الزمان خان کو واقع سے آگاہ کیا، قمر ہمارے

کالج میں زیرِ تعلیم تھے، چنانچہ امورِ خانہ داری اُن کے حوالے کر کے میں نے پھر ایک مرتبہ مستعدی سے مطالعہ شروع کر دیا، ہفتہ عشرہ میں کلیات کو کھنگال ڈالا، اور ضروری اقتباسات اخذ کر ڈالے، چنانچہ ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو لکھنا شروع کر دیا، اور ۵۔ نومبر کو پہلا باب تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، ان کو یقین نہیں آرہا تھا، بہر حال، وہ بیحد خوش ہوئے، اور مجھے گلے سے لگا لیا، لیکن صد افسوس! کہ جب ۱۰۔ جولائی ۱۹۴۷ء کو مقالہ تیار ہوا، تو وہ جان آفرین سے مل چکے تھے،

میرا ایمان ہے، کہ مرزا غالبؔ گزشتہ صدی کا وہ ممتاز ترین نمایندہ ہے جسکی ذات والاصفات پر برّصغیر ہندوپاکستان کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے، وہ فارسی کا غیر منقسم ہندوستان کا آخری مسلّم الثبوت شاعر ہے، صرف ابوالفرج رونیؔ امیر خسروؔ اور مُلّا فیضیؔ اس کے پیشرو مانے جا سکتے ہیں،

یہ بھی مسلّم الثبوت امر ہے، کہ غالبؔ اردو شاعری کا شہنشاہ ہے لیکن حیرت کا مقام ہے، کہ خود اس کو اردو پر کوئی ناز نہ تھا، بلکہ وہ عمر بھر اپنی فارسی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا، اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نیست نقصان، یکدو جزو است، از سواد ریختہ
کان دژم برگی، ز نخلستان فرہنگ منست

فارسی بین، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو، کہ بیرنگ منست

کی درخشد جوہر آئینہ، تا باقیست زنگ؟
صیقلی آئینہ ام، این جوہر، آن زنگ منست

بقول غالبؔ، جب تک ریختے کا "زنگ" باقی ہے، اُس کی فارسی کا آئینہ اُس کی اصلی اور جامع شخصیت کے جمال کو منعکس نہیں کر سکتا، مگر لطف کی بات تو یہ ہے، کہ اسی "برگِ دژم اور نقشِ "بیرنگ" نے اس کو بقائے دوام بخشا، اور شہنشاہِ سخن بنایا، ورنہ اُس کے فارسی کے "نقشہای رنگ رنگ" آج بھی

اپنی محرومئی قسمت پر نوحہ خواں ہیں، ملاحظہ ہو۔

درین دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست
دکان کشودہ ام، وقیمت گہر گویم

غالبؔ پر تحقیق کرنے کی سب سے بڑی وجہ میرا ذوق ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ بجز امیر خسروؔ اور فیضیؔ کے، میں اس کو ہندی نژاد فارسی گویان سے افضل و اعلیٰ تصور کرتا ہوں، تیسری وجہ یہ ہے، کہ وہ برصغیر میں قدیم مکتبۂ خیال کا آخری نمائندہ ہے، اور آخری اور وقیع وجہ یہ ہے، کہ اس کی محبوب فارسی شاعری نے داد نہ پائی، اسی لئے میں نے قلم اٹھایا،

غالبؔ وہ خوش نصیب شاعر ہے، جس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یادگار غالب[1] پہلی کتاب ہے، جس نے شاعر کو بطریقِ احسن ادبی دنیا سے روشناس کرایا، اس کتاب میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے غالبؔ کی فارسی تصنیفات کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے، حسد کے دیوِ سبز چشم کی آنکھوں پر پٹی کو کھولا ہے، اور فارسی کلام کا ناقدانہ اور منطقی انداز میں تجزیہ کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آبِ حیات میں غالبؔ کا مزے لے لے کر ذکر کیا ہے، لیکن چونکہ ان پر استاذ محمد ابراہیم ذوقؔ کا اثر غالب تھا، اُس میں غالبؔ کے افکار و اسلوب کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں، چنانچہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ یادگار وہ واحد اور آخری کتاب ہے، جس نے آزادؔ کی آزادہ روی کو لگام دی، اور غالبؔ کی بے داغ شخصیت پر بیجا، تحقیر آمیز اور بے تکے اعتراضات کی تردید و تکذیب کی، اس اعتبار سے حالیؔ نے ایک غلطی کا بروقت ازالہ کر کے نیازمندی کا حق ادا کیا ہے، بقول بابائے اردو مولوی عبد الحق:۔

---

[1] آبِ حیات اور یادگار پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء میں یکے بعد دیگرے دہلی اور الہ آباد سے شائع ہوئی تھیں،

"یادگار نے پہلی مرتبہ غالب کی قدر و منزلت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی، یہ حالی کا طفیل ہے کہ ہم غالب کی شاعری کی سچی قدر کرتے، اس کی یادیں جلسے ترتیب دیتے، اس کے کلام پر مضامین لکھتے، اس کے دیوان کی شرحیں چھاپتے ہیں، یادگار نے غالب کو زندۂ جاوید کر دیا اور خود یہ کتاب اپنی ادبی خوبیوں اور حسن بیان سے زندۂ جاوید رہے گی" [۱۱]

یادگار کے بعد ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان اردو کے نسخۂ حمیدیہ (نسخۂ بھوپال) کو متعارف کرایا، چونکہ وہ غالب کے اردو کلام کے سحر اور حسن بیان سے بہت زیادہ متأثر تھے، اس لئے انہوں نے جرمنی سے واپس آتے ہی جس خوش اسلوبی اور دلپذیر پیرایہ میں غالب کے ذہنِ رسا کو سراہا ہے، وہ صرف اُنہی کا حصہ ہے، بعد میں یہ عالمانہ مقدمہ محاسن کلام غالب کے عنوان سے شائع ہوا، جس کا پہلا جملہ حاصلِ کتاب ہے:۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ویدِ مقدس اور دیوان غالب"۔ [۱۲]

اگرچہ محاسن معایب سے پاک ہے، مگر فارسی شاعری کے تجزیئے سے معرّیٰ ہے، محاسن کے جواب میں ۱۹۲۹ء میں ایک اور کتاب بعنوان غالب بزبان انگریزی حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی، عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے "کتابچہ" میں غالب کے فن کو مغربی نقطۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اس کا سخت لہجے میں خاکہ اُڑایا ہے، البتہ افادیت کے اعتبار سے اِس کی رُو سے شاعر کے فن کے

---

[۱۱] اردو مجلہ، پچیسویں جلد صفہ ۲۳،

[۱۲] محاسن کا نیا اور دیدہ زیب اڈیشن بعنوان "صد سالہ فخری ایڈیشن"، حال ہی میں کراچی سے شائع ہوا ہے،

ادوار کا تعین کیا جا سکتا ہے، مصنّف کے زورِ بیان کی داد نہ دینا حقیقت کو چھپانا ہے، اِس میں بھی فارسی سے متعلق کوئی ذکر نہیں۔

۱۹۳۷ء میں "غالبیات" میں تین نادر کتابوں کا اضافہ ہوا، مولانا غلام رسول مہر نے غالب، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے غالب نامہ، اور مولوی اِمتیاز علی عرشی رامپوری نے مکاتیب غالب لکھ کر غالب کے شیدائیوں پر احسان عظیم کیا ہے، یہ اتحادِ ثلاثہ، یہ تینوں کتابیں شستہ زبان میں لکھی گئی ہیں، غالب وُہ واحد کتاب ہے جس میں شاعر کے خطوط کو اساس بنا کر مزید قابلِ قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں، اکرام صاحب کی کتاب اور بھی زیادہ دقیع اور گرانقدر ہے، کیونکہ انہوں نے نہ صرف شاعر کے فن کے ادوار متعیّن کئے ہیں، بلکہ ہر دَور سے مختص کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، اِن دونوں حضرات نے بھی فارسی کلام کے ذکر سے اجتناب کیا ہے، عرشی صاحب نے شاعر سے متعلق چند نئے پہلو اُجاگر کئے ہیں، ۱۶۷ صفحات پر مشتمل فاضلانہ اور عالمانہ مقدّمہ کتاب کی جان ہے، مکاتیب میں بھی فارسی کلام پر تبصرہ نہیں ہے،

ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب کے سِوا بقیہ کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں، تادمِ تحریر شاعر کے فارسی کلام پر کوئی مُستقل اور مستند کتاب نہیں لکھی گئی، اور انگریزی میں لکھنے کی تو کسی نے زحمت ہی گوارا نہیں کی، زیرِ نظر کتاب کا انگریزی قالب اِس خصوص میں ایک سعیٔ ناچیز ہے،

یہ تو مجھے معلوم نہیں، کہ میں کس حد تک شاعرِ فردا کی زندگی کے حالات اور اس کے فن کی خاطر خواہ ترجمانی میں کامیاب ہوُا ہوں، لیکن اِتنا ضرور عرض کرونگا، کہ میں نے یہ کتاب شاعر کے جملہ مصنفات کے آزاد مطالعہ کی روشنی میں لکھی ہے۔ چنانچہ میرے تصریحات غیر جانبدارانہ، غیر متعصّبانہ اور غیر جذباتی ہیں، میں نے غالب کو اصلی رنگ اور روپ میں پیش کیا ہے، مثلاً ایک طرف، جہاں میں نے اس کے ذہنِ بلند پایہ اور فکرِ رسا کو کرسی نشین کیا ہے، وہاں دوسری طرف،

اُس کی کسی فروگذاشت کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے، الغرض، ایک بے لاگ واقعہ نگار کی حیثیت سے، میں نے اُس کی عالی مرتبتی، شہرت اور ہر دلعزیزی، اور اس سے بیزاری اور اُس سے منسوب حکایات و شکایات کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ساتھ پُورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے،

مجھے غالبؔ کی جدّت طرازی، بذلہ سنجی اور شوخی بیحد پسند ہے، میں اُس کی مجتہدانہ روشِ زندگی کو عزیز رکھتا ہوں، مجھ کو اس کی افسردہ حالی پر اُس سے گہری ہمدردی ہے، میں اس کے ساتھ اس کی پریشان حالی میں برابر کا شریک ہوں، مگر مجھے اُس کے عجیب و غریب اور بعید از قیاس ازدواجی زندگی سے متعلق خیالات پر ترس آتا ہے، تاہم اُس نے میرے قلم سے اپنی فراست و فطانت کی ستایش میں بھرپور خراجِ تحسین حاصل کیا ہے ، بتصرف غالبؔ:۔

عارفؔ از من زندہ گشتہ نام غالبؔ درجہان
"از لوا جان در تنِ ساز بیانش کردہ ام"

وہ عجوبۂ روزگار ہے، وہ میرا ہیرو ہے، وہ ہند و پاکستان کے ادب کا آخری تاجدار ہے، مجھے حالیؔ کے ساتھ مکمل اتفاق ہے، جب وہ لکھتے ہیں کہ

"میرا خیال ہے، کہ اِس ملک میں مرزاؔ پر نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا،" [۱۳]

بانکی پور کیٹلاگ کے مؤلّف نے کہا ہے:۔

"غالبؔ ہندوستان میں طرز قدیم کا آخری شاعر ہے، اور اردو اور فارسی شاعری کا آخری علمبردار، اگرچہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا، اور ہندوستان ہی میں پرورش پائی، مگر بلحاظ مرتبہ وہ ایرانی الاصل شعراء سے ہرگز کم نہیں ہے، اور یہ یقین کے ساتھ

---

[۱۳] یادگار، صفحہ ۳

کہنا پڑتا ہے، کہ پھر سرزمین ہند سے اُس کا ثانی اُبھرتا نظر نہیں آتا،"[۱۴]
جی ہاں، غالبؔ ہر اعتبار سے برّصغیر کا آخری کلاسیکی شاعر ہے، اور زباندانی کے اعتبار سے تو وہ اقبالؔ سے بھی سبقت لے جاتا ہے، اقبالؔ ہمارا قومی شاعر ہے، اُن کا کلام اسلام کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک خاص پیغام لے کر آئے تھے، اُن کا مقصدِ حیات قوم کے نیم جان قالب میں زندگی کی حرارت کو فروغ دینا، اور اس کو "خودی" کے تحفظ پر کمربستہ کرنا تھا، اقبالؔ کے اسی پیغامِ حیات، حریت کی بیباکی اور جرأت رندانہ نے لامحالہ برّصغیر میں عام بیداری اور سیاسی بصیرت کو پروان چڑھایا، جس کے نتیجہ میں مسلمانانِ ہند بیشمار سیاسی عفریتوں سے نبرد آزما ہو کر مملکت خداداد پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، خود اقبال غالبؔ سے بیحد متأثر تھے، جس کا اعلان انہوں نے مندرجۂ ذیل اشعار میں کیا ہے:-

(۱) نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعت پرواز پر
شاہدِ مضمون تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گل شیراز پر[۱۵]
آہ! تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں[۱۶] تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
(بانگِ درا)

---

(۲) غالبؔ و حلاجؔ و خاتون عجم[۱۷] شور ہا افگند در جانِ عجم
این نواہا روح را بخشد ثبات گرمیٔ او در درونِ کائنات
(جاوید نامہ)

---

[۱۴] صفحہ ۲۶۹-۲۷۰، [۱۵] خواجہ حافظ،
[۱۶] جرمن شاعر گوئٹے [۱۷] ایرانی شاعرہ قرۃ العین،

غالب تلمیذ روحانی ہے، وہ اپنے فن میں منفرد اور یکتائے روزگار ہے وہ بہانگ دُہل کہتا ہے:

ہم بعالم زاہلِ عالم برکنار اُفتادہ ام
چوُن امامِ سُبحہ بیرون از شمار افتادہ ام

اِظہار میں جھول، ذُو معنی اور دُور از کار محاوروں کا استعمال اور غیر مربوط، بے ہنگم اور سپاٹ خیالات اس کے شاندار تیرتھ میں باریاب ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے، جدت طرازی، تخیل کی بلند پروازی، روانی اور موزونئ الفاظ، منظر نگاری، سُوز و گداز، مشاہدۂ نفس، معنیٰ آفرینی اور زُورِ بیان اس کی خداداد شاعری کی ممتاز خصوصیات ہیں، وہ ہر اعتبار سے ہند و پاکستان تلمرِ و سخن کا شہنشاہ ہے، اسی مناسبت سے اس کتاب کا نام بھی شہنشاہ سخن رکھا گیا ہے،

نواب ضیاء الدین احمد خان نیرّ ورخشاں کی رباعی ملاحظہ ہو:۔

اُستاد من، آن حق آگہ، غالب — اِقلیم سخن را شہنشہ، غالب
میداشت عصای کندہ، چو مہر بدست — بُد نقش بر آن، یا اسد اللہ الغالب

گزشتہ سال غالب کی صد سالہ برسی اقصائے عالم میں بڑے اہتمام سے منائی گئی، پاکستان اور ہندوستان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، روس نے تو شاعر کے نام سے ایک خاص پھول منسوب کیا ہے، جس کو غالب لِلی یا سمن غالب کہتے ہیں، اس موقع پر متعدد تقریبات، محفلیں اور مشاعرے منعقد کئے گئے، یادگاریں قائم کرنے کے بلند بانگ اعلانات کئے گئے، متعدد کتابیں شائع کی گئیں، رسائل اور جرائد نے خصوصی ایڈیشن نکالے، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے "فیچر" پیش کئے، اس طرح، شاعر کی حیات اور شاعری کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا گیا، جس سے اُس کی اپنی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی ہے، کہ

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ اند
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ سب کچھ ضرور ہوا، لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے، کہ ثقافت اسلامی کی علمبردار مملکت پاکستان میں اب تک کوئی مستقل تحقیقی ادارہ قائم نہ ہو سکا، جس کے تحت شاعر کی تصنیفات کو موجودہ مذاق کے مطابق از سر نو مرتب اور مدوّن کیا جائے، اور اُس سے متعلق نئے لٹریچر کا اضافہ کیا جائے، ایسا ادارہ اقبال اکیڈمی کے طور پر ہو، اور اس کو حکومت کی سر پرستی حاصل ہو،

شکر کا مقام ہے کہ باوجود عدم سر پرستی کے ملک میں ایسے مخلص اولوا ارباب علم و ادب موجود ہیں، جو شاعر کے کلام کی اشاعت میں شب و روز مصروف و منہمک رہتے ہیں، پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنی نگرانی میں غالب پر متعدد کتابیں شائع کروائی ہیں، خود اپنے شہر میں "ادارۂ یادگارِ غالب" نہایت مفید خدمت سر انجام دے رہا ہے،

شاہراہ بوعلی سینا، ناظم آباد، کراچی پر غالب دار المطالعہ اور لائبریری کا قیام ایک نیک فال ہے، بلدیۂ کراچی اور حبیب بینک کا یہ قابلِ ستائش اقدام لائق صد مبارک باد ہے، یہی ادارہ آگے چل کر غالب اکیڈمی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب، متولی ہمدرد دواخانہ پاکستان، یہ خدمت بطریق احسن سر انجام دے سکتے ہیں، آپ کے برادر بزرگ جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے مرزا غالب کے مزار سے متصل دس لاکھ روپے کے خرچ سے غالب اکیڈمی قائم کی ہے، جس کی رسم افتتاح ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء کو جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ادا کی تھی،

برسی کے سلسلہ میں شاعر سے متعلق ایک نادر "نو دریافت" کا اضافہ ہوا ہے، وہ ہے غالب کے اردو دیوان کی اولین روایت کا وہ قلمی نسخہ، جس کو ہمارے شاعر نے ۱۸۱۶ء مطابق ۱۲۳۱ھ میں بقلمِ خود لکھا تھا، اور جس کے ضائع کر دینے کا وہ وقتاً فوقتاً اعلان کرتا رہا،[۲۴] اُس نسخے کو نثار احمد فاروقی امروہوی سے حاصل

---

۲۴ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲۔ اور ۱۸۵،

کر کے محمد طفیل صاحب نے اکتوبر ۱۹۶۹ء میں نقوش کے غالب نمبر حصّۂ دوم میں " ادارۂ فروغ ادب لاہور" کی جانب سے بعنوان، نودریافت، بیاضِ غالب، بخطِ غالب شائع کیا ہے، اور اس کو عکسی صورت میں پیش کیا ہے، اس نسخے کو "نسخۂ بھوپال" کی رعایت سے نسخۂ لاہور سے موسوم کیا گیا ہے،

نقوش کی یہ اشاعت ۳۷۲ صفحات کو محیط ہے، جس میں ۲۴۶ صفحات بیاض کے لئے مختص ہیں، غالب کے اشعار پر، صادقین کی تیرہ غیر مطبوعہ تصویریں بھی ہیں،

بیاض سے متعلق " اہتمام یہ کیا گیا ہے، کہ ایک صفحہ پر بخطِ غالب عکس، اور سامنے کے صفحہ پر خوبصورت کتابت، صفحہ بہ صفحہ، بلکہ مصرع بہ مصرع " نیز، " اس بیاض کی فضیلت یہ ہے، کہ مروّجہ دیوان اور بیاض میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس میں اُنیس[۱۹] غزلیں اور تیرہ[۱۳] رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں، " [۱۸]

بیاض میں کل ۲۵۳ غزلیات ہیں، جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶۵۴ ہے، اس " نودریافت " سے محققین کے لئے نئی راہیں کھل گئی ہیں، " ادارۂ فروغ ادب " اور محمد طفیل صاحب لائق صد مبارکباد ہیں،

فارسی میری دوسری مادری زبان ہے، جس کا اکتساب میں نے کراچی میں مقیم ایک علم پرور صفوی خاندان میں ایک رکن کی حیثیت سے رہ کر کیا ہے، [۱۹] اور تحقیق کی لذّت میں نے اُستاذِ گرامی شمس العماء ڈاکٹر عمر ابن محمد داؤد پوتا صاحب

---

[۱۸] محمد نقوش، بیاض غالب صفحہ ۴

[۱۹] شاہزادہ محمد رضا آصف صفوی مورث اعلیٰ تھے، موصوف ایک عالم مُتبحر اور مقتدر شاعر تھے، خطاطی میں " مشکین قلم اور زرین رقم " سے ملقب تھے، آپ کی اہلیہ محترمہ آسیہ بیگم قندھار کے قزلباش خاندان کی چشم و چراغ تھیں، " بی بی بزرگ " بھی اعلیٰ پایہ کی

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

سے پائی ہے، ؎۲۰

میں نے اپنی کتاب میں غالبؔ سے متعلق صیغہ واحد غائب استعمال کیا ہے، اِس میں بھی اُس کی انفرادیت کارفرما ہے،

میں نے انگریزی ایڈیشن ڈاکٹر داؤد پوتا صاحب کے نام معنون کیا تھا، اب حسب الوعدہ، موجودہ کتاب کو جناب ڈاکٹر محمد بدل الرحمٰن صاحب کے اِسمِ گرامی سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، بقول سام مرزا سامیؔ:۔

حاصل عمر نثار رہِ یاری کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کاری کردم

آخر میں، میں عزیزی عبداللہ خاورؔ کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں، جنہوں نے میری کتاب کے انگریزی ایڈیشن کو اردو قالب میں لانے کے لئے میرا پورا پورا ہاتھ

(باقی صفحہ ۲۸ سے آگے)
شاعرہ تھیں، آپ کے یہاں پانچ بچے پیدا ہوئے، چار لڑکے اور ایک لڑکی، سلیمانؔ، سلمانؔ، سلیم، سالمؔ لڑکے، اور ماہ صیامؔ لڑکی، آغا مرزا سلیمانؔ سب سے بڑے تھے، اور انہوں نے مجھ کو اپنے گھر لاکر علم کی لازوال دولت سے مالامال کیا، آپ ڈی۔جے۔سندھ کالج کراچی میں فارسی کے پروفیسر تھے، آپ کو علوم متداولہ پر پورا عبور حاصل تھا، آپ نے ۱۹۴۴ء میں تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی، اور علی باغ میں مدفن پایا،

؎۲۰ ڈاکٹر صاحب صوبہ سندھ کی فقید المثال ہستی تھے، آپ کو عربی، فارسی، انگریزی اور سندھی پر عبور حاصل تھا، اِن زبانوں میں متعدد تالیفات اور تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، آپ ۱۹۳۹ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک سندھ کے ناظم تعلیمات تھے، آپنے بعارضۂ قلب پینسٹھ سال کی عمر میں ۲۲۔نومبر ۱۹۵۸ء کو وفات پائی، اور اگلے روز بھٹ شاہ کے مقام پر سندھ کے پایۂ ناز صوفی شاعر سید شاہ عبداللطیف ابن شاہ حبیب کے مزار کے جنوب میں مدفون ہوئے، مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو مارچ آف ایجوکیشن شمارہ اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۸۳،

بتایا، خاور صاحب اعلیٰ ادیب اور زباندان ہونے کے علاوہ ایک قابل اور مقتدر معلّم بھی ہیں، ان کا صحیح مقام کالج ہے۔ نہ کہ معمولی اسکول، میں اپنے عزیز تلمیذِ سابق عبدالرؤف خاں اور ان کے رفیق کار محمد انعام الرب صاحب انصاری کا بھی بیحد ممنون ہوں، جنہوں نے ازراہ محبت کتاب کی تدوین میں میرے ساتھ مکمل تعاون کا ثبوت دیا ہے، میں اپنے دوست جناب سید امجد علی صاحب کا مرہون احسان ہوں، جنہوں نے اِس کتاب کی نوک پلک درست کی، اور مجھے اپنے گراں بہا مشوروں سے نوازا، نیز، میں وطن عزیز کے مصوّرِ اعظم جناب عبدالرحمٰن چغتائی (پرائیڈ آف پرفارمنس) کا بیحد ممنون و مشکور ہوں، جنہوں نے حسبِ دستور، بکمال محبّت شاعر کی رنگین تصویر عنایت فرماکر کتاب میں جان ڈال دی ہے، میں ”مدینہ پبلشنگ کمپنی“ اور ”مشہور آفسٹ پریس“ کے مالک اور مدارالمہام جناب الحاج حکیم محمد تقی صاحب دہلوی کا دل سے شکر گذار ہوں، جنہوں نے ازراہِ ادب نوازی اور غالب شناسی، خاکسار کو اقلیم سخن کے شہنشاہ کی مزید خدمت پر مستعد و آمادہ کیا، میں جناب محمد رفیق خوشنویس کا بھی ممنون ہوں، جن کے فن کا یہ کتاب شاہکار ہے،

جَزَاھُمُ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ خَیْرًا

سید عارف شاہ گیلانی
بروز جمعتہ المبارک ۲۲۔ شوال المکرم ۱۳۸۹ھ
مطابق یکم جنوری ۱۹۷۰ء

”العارف“
۷۶۔ ڈی، بلاک ”ف“
تیموریہ، کراچی۔۳۳

Telephone : No. 61093

DR. A. C. S. GILANI
M.A. PH.D., WPES (I - Sr. Retd)

AL - ARIF
D-76, BLOCK "F"
TAIMURIA
KARACHI-33

Dated.........................196

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کس حد تک شاعرِ فردا کی زندگی کے حالات اور اُس کے فن کی خاطر خواہ ترجمانی میں کامیاب ہوا ہوں، اِتنا ضرور عرض کروں گا، کہ میں نے یہ کتاب شاعر کے جملہ مصنّفات کے آزاد مطالعہ کی روشنی میں لکھی ہے، چنانچہ میرے تصریحات غیر جانبدارانہ، غیر جذباتی اور غیر متعصبانہ ہیں، میں نے غالب کو اصلی رنگ اور روپ میں پیش کیا ہے، مثلاً ایک طرف، جہاں میں نے اُس کے ذہنِ بلند پایہ اور فکرِ رسا کو کرسی نشین کیا ہے، وہاں دُوسری طرف، اُس کی کسی فروگذاشت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، الغرض، ایک بے لاگ واقعہ نگار کی حیثیت سے میں نے اُس کی عالی مرتبتی، شہرت اور ہر دلعزیزی، اور اُس سے بیزاری اور اُس سے منسوب حکایات و شکایات کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے ساتھ پُورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے،

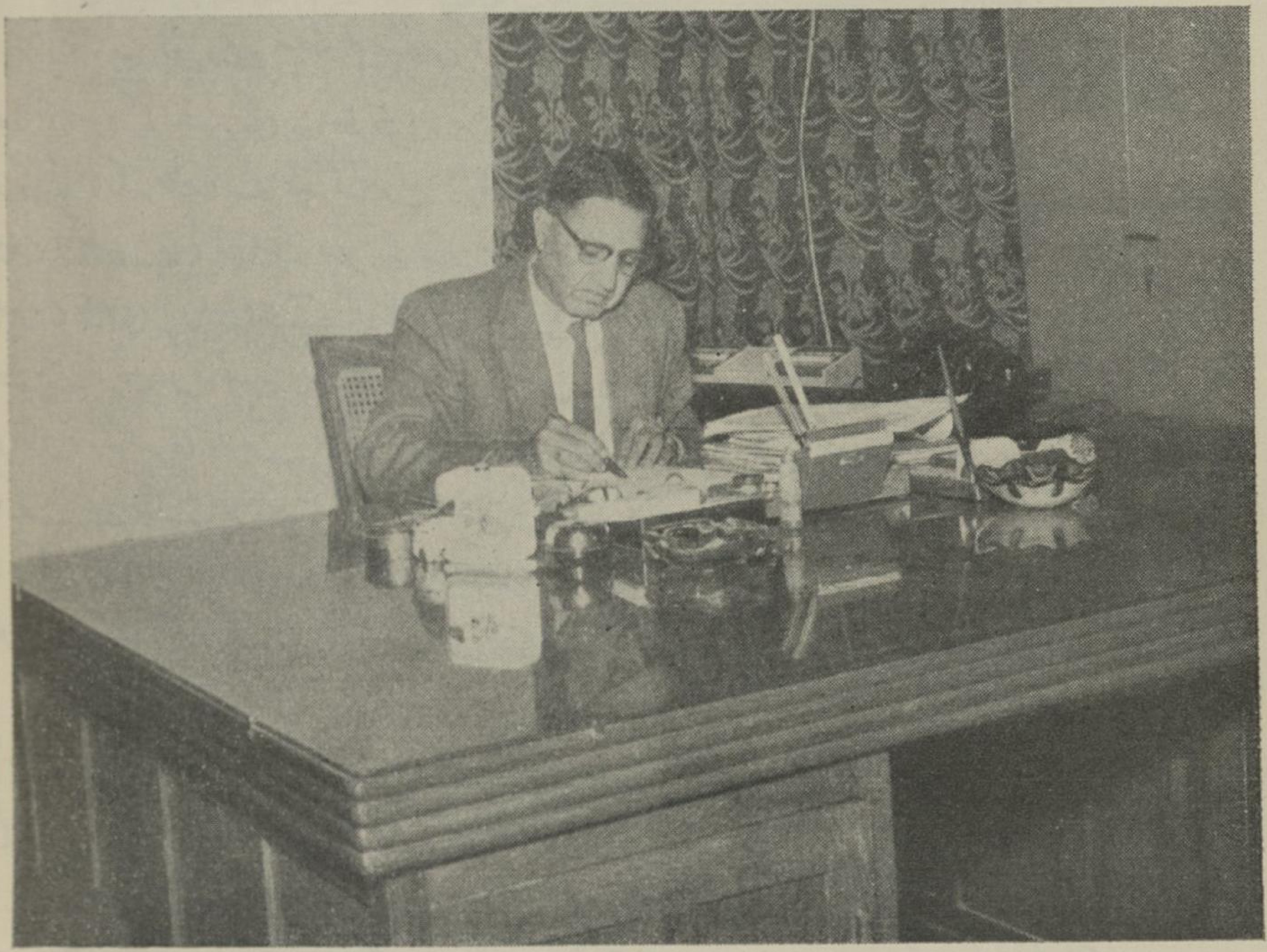
مجھے غالب کی جدّتِ طرازی، بذلہ سنجی اور شوخی بےحد پسند ہے، میں اُس کی مجتہدانہ روشِ زندگی کو عزیز رکھتا ہوں، مجھے اُس کی افسردہ حالی پر اُس سے گہری ہمدردی ہے، میں اُس کے ساتھ اُس کی پریشان حالی میں برابر کا شریک ہوں، مگر مجھے اُس کے عجیب و غریب اور بعید از قیاس اِزدواجی زندگی سے متعلق خیالات پر ترس آتا ہے، تاہم، اُس نے میرے قلم سے اپنی فراست و فطانت کی ستائش میں بھرپور خراجِ تحسین حاصل کیا ہے، وہ عجوبۂ روزگار ہے، وہ میرا ہیرو ہے، وہ ہند و پاکستان کے ادب کا آخری تاجدار ہے۔

عارف

۱۵- مئی ۱۹۷۰ء

۸- ربیع الاوّل ۱۳۹۰ھ

نمونۂ نگارش مصنّف



مُصنّف

باب اوّل

سوانح حیات

بود غالبؔ عندلیبی از گلستانِ عجم
من زغفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

فصلِ اوّل

مقدّمہ

(۱) عصرِ غالب

غالبِ نام آورم، نام و نشانم مپرس

غالبؔ کی شاعری کے سب سے واضح اور بہتر تصوّر کے لئے اُس کے پس منظر کا تفصیلی جائزہ اشد ضروری ہے، حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کو ایسا پُرآشوب دور ملا تھا، جب اِنتشار اور بے یقینی عام تھی، عصرِ غالبؔ کو بے یقینی، انقلاب اور نشأۃ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے، ہم اس پر چار عنوان کے تحت بحث کریں گے یعنی سیاسی سماجی، مذہبی اور ادبی۔

سیاسی طور پر یہ انقلاب کا دور تھا، جب سلطنتِ مغلیہ کا خزاں رسیدہ درخت بادِ مخالف کے تھپیڑے کھا کھا کر بیخ و بن سے ہِلا جا رہا تھا، دیر اثر سمیّت اپنا کام کر چکی تھی، سلطنت کے دل کے تمام شریانوں سے خون بہہ رہا تھا، مُلک کے افق پر بے اطمینانی کے سیاہ بادل اُمڈ رہے تھے اور ان بادلوں میں آنے والی تباہی اور طوفان کے آثار پنہاں تھے۔

بادشاہ سلامت سے شاہی اختیارات چھِن چُکے تھے، وہ انگریز کے ہاتھوں میں ایک کھلونا اور آلۂ کار بنا ہُوا تھا، انگریز بازئ سیاست کو جیتنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، برطانوی تدبّر کا دُور رس پنجہ ملک کی نیم آزاد ریاستوں کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا، یہ درست کہ ان ریاستوں نے عرصۂ دراز تک اس جابر قوت کی

خونی کھیل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر ڈرامہ کا آخری سین ۱۸۵۷ء میں نظر آیا، جب آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی اور ناکام ہوئی۔

اس ہیجانِ عظیم کے بعد عام اور وسیع پیمانہ پر جو کشت و خون، المناک حالات اور دِلدوز واقعات رُونما ہوئے، اُن کے تصور ہی سے جسم کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قلم کانپنے لگتا ہے، عمارات کو بارُود سے اُڑایا گیا، مخدّرات حرم کو گھروں کی چار دیواری سے جبراً نکالا گیا، بادشاہ سلامت کی تذلیل کی گئی، اُس کو تخت سے اُتارا گیا اور مُلک بدر کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں اُس کو نظر بند کیا گیا اور پھر وہیں کس مپرسی اور غربت کے عالم میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، یہی نہیں بلکہ اس کی آخری آرامگاہ پر ہل چلایا گیا اور اس کو ہموار کر کے پولو گراؤنڈ بنائی گئی۔[۴۳]

یہ واقعات فولادی اعصاب کو بھی پارہ پارہ کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ پھر اُس شاعر پر کیا کچھ گذری ہو گی جس کا دل درختوں کے پتوں سے گذرتی ہوئی ہوا کی سنسناہٹ سُن کر شاخِ گل کی طرح لرزنے لگتا ہے!

اس چند روزہ عذاب نے ادبی فضا میں تلاطم پیدا کر دیا، تباہی کی ایک عظیم طوفانی لہر دہلی پر سے گذری اور مشاہیر علم و ادب کو بہالے گئی اور جو تباہی سے بچ بھی گئے وہ محض مُلک گیر تباہی یا اپنے زخموں پر اشکباری کے لئے رہ گئے تھے غالب نے علاوہ روزنامچے (دستنبو) کے اردو خطوط میں بھی ان واقعات کا جابجا تذکرہ کیا ہے۔

سماجی ماحول کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ ہندو مسلم اتحاد جتنا مکمل و مستحکم اِس دور میں رہا ہے، اِس سے پہلے کبھی نہ تھا، اس اتحاد کا محرک، ایک جابر، ظالم اور بیرحم قوم کی غلامی کا جُوآ تھا جسے ہندو اور مسلمان یکجہتی سے اُتار پھینکنا چاہتے تھے اور ایک نئے عہد کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے، لیکن محرومئ قسمت نے انکی کوششیں ناکام بنا دیں اور اُن کے خواب خاک میں مل گئے، غیر ملکی سامراج مستحکم ہو گیا، عوام کے دلوں میں ایک دُوسرے کے لئے اتنی نفرت پیدا کر دی گئی کہ وہ ایک دوسرے کا

---

۴۳ ظفر نے بروز جمعہ ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء کو وفات پائی۔



۱۸۵۷ء میں ہمایوں کے مقبرے کے اندر بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا ایک منظر

گلا کاٹنے کے لئے تیار ہو گئے، لوگ ذہنی توازن کھو بیٹھے، اُن کے اُبلتے ہوئے جذبات کو دیوانگی کی حد تک ہوا دی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا سب سے زیادہ قابل نفرین اور عالمگیر اُصول جہانبانی قائم ہوا، یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو۔

مغربی طرزِ فکر اور غیر ملکی اسلوبِ زندگی کی درآمد نے ایک نئے نظریے کو جنم دیا اور نئی اور تازہ وارد سماجی رسموں نے عوام کے ذہنوں کو پوری طرح متأثر کرنا شروع کر دیا۔

اِسی دَور میں سماجی اصلاحات بھی شروع ہوئیں، ستّی کی رسم کہن ختم کی گئی جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا تھا ؎

چوں زنِ ہندی کسی در عاشقی مردانہ نیست
سُوختن با شمع مُردہ کارِ ہر پروانہ نیست

ستی کے ساتھ ٹھگوں کا قلع قمع ہوا، ریلوے، ڈاک اور تار کا نظام آیا، شاہراہوں کا ایک جال بچھ گیا جس سے حمل و نقل میں برق رفتاری پیدا ہوئی، فاصلے سمٹے، نئے سماج کی تشکیل پورے جوش و خروش سے شروع ہوئی۔

مذہبی طور پر یہ کثیر التعداد تحریکوں کا دور تھا، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہؒ ان کے صاحبزادوں اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے سارے مُلک کو مذہبی مباحث سے چونکا دیا تھا، اُن کا مقصد اُس رطب و یابس کو صاف کرنا تھا جو مذہب کی بُنیادوں میں جمع ہو گیا تھا، اِن مخلص الوالعزم حضرات نے باطل اور جامد عوامی رسموں کے خلاف جہاد کر کے اِسلام کے خالص و مصفّا اُصولوں کا درد اکیا، دُوسری طرف سرسید احمد مرحوم کی تحریروں خصوصاً بعض قرآنی آیات کی عجیب و غیر مانوس تحریفوں نے علمائے اسلام میں غیض و غضب پیدا کر دیا۔ علمائے نے پورے زور و شور سے سرسید کی مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی امور میں علماء اور عوام ایک مرکز پر آگئے۔

ادبی نقطۂ نظر سے یہ نشأۃ ثانیہ کا دور تھا، فارسی جواب تک سرکاری زبان تھی، اس کی جگہ اردو اور انگریزی نے لے لی تھی، چھاپہ خانہ (پریس) کے رواج سے توسیع علوم

کا کام آسان اور بہتر ہو گیا تھا، ملک کے اہم شہروں میں متعدد تعلیمی ادارے قائم ہو گئے، کلکتہ کا مشہور مدرسہ وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا، ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج سر ولیم ڈنکن نے قائم کیا، ۱۷۸۴ء میں کلکتہ کے مقام پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ قائم کرنے کا سہرا سر ولیم جونس کے سر رہا، لارڈ ویلزلی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم کیا، یہ ادارہ خصوصی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے استفادہ کے لئے وجود میں آیا تھا، یہاں ان کو عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی، اس کالج کے مشہور اساتذہ میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ، جان بیلی، سر ولیم کرک پیٹرک، فرانسس گلیڈون اور سر جمیس ایڈمانسٹن شامل تھے۔

آگرہ کالج کی بنیاد ۱۸۲۲ء میں پڑی، یہاں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی، دہلی کالج ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا اور تقریباً پچاسی سال کی مدتوق عمر گذار کر ۱۸۷۷ء میں بند ہو گیا، ان اداروں کے علاوہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ انتظام تھے، عیسائی مشنریوں نے چند چھوٹے اداروں کا ایک ایسا جال پھیلا دیا تھا جن میں نام نہاد غیر مذہبی تعلیم دی جاتی تھی، صوبہ جات بمبئی، بنگال اور مدراس میں یونیورسٹیاں بھی قائم ہوئیں۔

کامٹی آف پبلک انسٹرکشن (نظامت تعلیمات) کا قیام ۱۸۲۳ء میں عمل میں آیا، ۱۸۲۵ء میں لارڈ میکالے کی مشہور تجاویز شائع ہوئیں اور ۱۸۲۹ء میں انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا جس کی مہنگی قیمت اردو اور فارسی کو ادا کرنا پڑی۔

اس وقت غیر تو اس نئی زبان کے حصول میں پورے جوش و خروش سے لگ گئے اور اس کے نتیجہ میں اُنہوں نے بڑی تیزی سے ہمہ گیر ترقی کی، مگر مسلمانوں نے اسے غاصبوں کی زبان سمجھتے ہوئے نہ صرف اس کی تحصیل سے گریز کیا بلکہ اس کے خلاف ایک مسلسل مہم چلا دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملک کے نظم و نسق سے علیحدہ ہو گئے، علاوہ سر سید کی دُور اندیشی کے قوم کی سیاسی بے دخلی واضح نظر آ رہی تھی، سر سید کی جری اور مدبرانہ رہنمائی اور قیادت نے لوگوں کے ذہنوں کو جلا دی، اُنہوں نے اپنی حماقت کا احساس کیا،

اور علی گڑھ کے مرکز پر جمع ہو کر وہ ادارہ قائم کیا جو دیانت داری کے ساتھ ملّت کا نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے، مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں کو وہ مقام عطا کیا جس کی بدولت پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔

جان گلکرائسٹ کی پُرجوش اور مخلصانہ سرپرستی میں اردو انگریزی کے دوش بہ دوش ترقی کرتی رہی، مصنفین اور شعرا کا ایک مستقل گروہ جمع ہو گیا، اسی زمانے میں پہلی بار شاہ ولی اللہؒ اور دوسرے فضلاء مثلاً شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کے ترجمے کئے، شاہ اسمٰعیل شہید نے اسلام کے اصولوں اور بعض پیچیدہ اور مابہ النزاع مسائل پر تحقیقی مقالے لکھے۔

میر امّن اور رجب علی بیگ سرور نے اردو نثر میں نئے اسالیب کی بنیاد ڈالی، منشی کریم الدین نے شعرائے ہند کا تذکرہ طبقات الشعرا لکھا، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ نے اِصلاحی افسانے لکھے، سرسید نے مختصر افسانے، تجزیاتی مضامین اور خطبات لکھ کر اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

شعرا میں ظفر و ذوق، علوی و آزردہ، نیّر و نصیر، عیش و احسان، مومن و ممنون شیفتہ و صہبائی، جوہر و تفتہ ممتاز حیثیت کے مالک تھے مشاعرے قلعۂ معلّی میں بھی ہوتے تھے اور شہر میں بھی، ممنون کا مکان خصوصی طور پر مرجع شعرا تھا، نیز دہلی کالج کے زیر انتظام ماہانہ نشستیں ہوا کرتی تھیں۔

حقیقتاً یہ عظیم انقلابات، گہما گہمی، سیاسی کشمکش اور ادبی اور علمی ارتعاش کا دور تھا، جس میں کبھی اُمید کی جلوہ نمائی ہوتی تھی اور کبھی دہشتیں سر اٹھائے دکھائی دیتی تھیں، یہ واقعی عظیم دور تھا۔

(۲) سنگِ میل حیاتِ غالب

غالب کی زندگی طویل و مسلسل سانحات کا نام ہے، جس میں بیشمار سنگ گراں تھے، ان میں سے ہر ایک نے غالب کے خون آلود دِل کو اور زیادہ جراحت آشنا کیا۔ غالب کی ابتدائی زندگی لاڈ اور پیار سے بگڑ چکی تھی، لیکن وہ غیر شعوری طور پر خاندان میں

پے درپے سوگوار واقعات سے متاثر ہوا اور اس طرح جذبات میں یاسیت آگئی، بچپن تو مسرّت کے خواب شیریں کے مانند گذرا، لیکن جلد ہی زمانہ اپنی پوری سفاکی سے اِس مسرور و شاداں بچے کے درپے آزار ہوگیا۔

اب ہوش میں آنے کا زمانہ آگیا تھا، شادی تفکرات کا ہجوم ساتھ لائی، مقدمۂ پینشن کی ناکامی نے حوصلوں کو پست کردیا، شاہی دربار کے دروازے اس پر اس لئے بند ہوگئے کہ بعض افراد اپنی عظمت کو خطرے میں دیکھ کر اُس کی موجودگی کے خلاف ہوگئے تھے، حبسِ بیجا نے عزّت گنوائی اور کسی دُور دراز ملک کو ہجرت کرنے کا سودا سمایا جہاں سے واپس نہ آنے کا عزم محکم تھا، حقیقت میں ہمارا شاعر اپنی عالی نسبی اور وقیع نیک نامی پر یہ ظالمانہ دست اندازی کبھی فراموش نہ کرسکا، یہی نہیں بلکہ بھائی کی کم عمری میں دیوانگی نے ہجوم افکار میں اور اضافہ کیا جس پر عارفؔ کی ناگہانی موت مُستزاد ہوئی۔ قرض نے زندگی کو مزید تلخی دی، سلطنت مغلیہ کا خاتمہ اور دوست واحباب کی تباہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

طویل و مسلسل بیماری نے اعصاب کو ہلادیا تھا، قویٰ کمزور ہوگئے تھے، جذبات سرد پڑگئے تھے، غدر کے بعد پینشن کا رک جانا اور اعزازات کا چھن جانا ایک ایسا خون آشام دشنہ تھا جو گوشت و پوست سے گذر کر ہڈیوں تک پیوست ہوگیا، اس کے ساتھ ہی ساتھ فنّی صلاحیتوں کے سلسلے میں ناقدر شناسی، سرد مہری، حسد، اور طعن و تشنیع نے بددلی اور افسردگی سے ہم کنار کردیا، غالبؔ کے سوا کوئی دُوسرا شخص مدتوں پہلے ہی ان دل شکن حالات کی بھینٹ چڑھ جاتا، اگر یہ مشکلات حائل نہ ہوتیں تو غالبؔ کی شاعری میں اس سے بیشتر بیش بہا اور درخشاں موتی نظر آتے، اُس نے کہا ہے۔

"منم، اگر از روزگار نہ بسیار، بلکہ اندک آسایش
یافتمی، بہ نیروئے فکر، پنجۂ ارباب فن برتافتمی"، [۱]

---

[۱] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۵۰

طنز و مزاح کی جھلکیاں جو غالب کی تحریروں میں بکثرت ملتی ہیں انہی یاس انگیز واقعات کا ردعمل ہیں، اس نے مردانہ وار زمانے کی نامساعدت کا مقابلہ کیا، اور غیر معمولی ہمت اور ناقابل شکست قوت ارادی کے ساتھ زندگی کے طوفانوں کو برداشت کیا، استقامت کے ساتھ میدان میں جما رہا اور جھکنے اور پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا، تقدیر غیض و غضب کا اظہار کرتی رہی اور وہ مسکراتا رہا۔

(۳) غالب کی فارسی شاعری سے بے اعتنائی کے اسباب

ہمارے نزدیک غالب اردو میں "شہنشاہ سخن" کہلاتا ہے، لیکن اس کی اصلی شاعری اس کے ان بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) فارسی اشعار میں پوشیدہ ہے جن کی حفاظت اس نے مشرق کے شکّی عاشق کی طرح کی اور جن کے متعلق اس نے کہا ع

فارسی بین، تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ

پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی فارسی شاعری مقبول نہ ہو سکی؟ ہمارے اندازے اور تجزیہ کے مطابق وہ وجوہات مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

اوّلاً زمانہ موافق نہ تھا، ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ناصر علی اور بیدل کے پیروکاروں نے فارسی شاعری کے ذوق کو مسخ کر دیا تھا، ان کی شاعری ایک جامد نقالی تھی جس میں نہ تو تازگی و توانائی کی رمق تھی اور نہ ہی تخلیقی قوت کا شائبہ، سرقہ اپنی بدترین صورت میں مروّج تھا، بقول غالب ے

غالب درین زمانہ بہ ہر کس کہ وا رسی
مضمونِ غیر و لفظ خودش بر زبانِ اوست
مضمونِ شعر لوٹ بود فی زماننا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

سرقہ کی بدترین شکل یہ تھی کہ جیسے نئی بوتل میں پرانی شراب بھر دی جائے، اس زمانے کی شاعری میں تخیل پیچیدہ اور نامانوس، لدھڑ اور ناہموار ہوتی تھی، اس تخیل کا لباس یعنی زبان کمزور اور کرخت الفاظ کی پیوندکاری تھی، جو

مقامی ٹکسال کی پیداوار تھی، قتیل، واقف، حاکم اور اختر اور اسی ذیل کے شعرا ایسے مذاق کے نمایندے ہیں، یہ شعرا باوجود پُر گو ہونے کے زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے، اِنہوں نے اپنی شاعری کے ہنگاموں سے عوام کے کانوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ شایستہ اور پُروقار شاعری کی سماعت کے اہل نہ رہے، ظاہر ہے کہ اندریں حالات غالبؔ کی ندرتِ فکر اور باریک بینی سے لطف اندوز ہونے کا مذاق مفقود تھا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اب منظرِ عام پر اردو زبان آ گئی تھی اور یہ زبان نہ صرف بلوغ و شعور کی منزل پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی بلکہ فارسی زبان پر اپنی بالادستی ثابت کرنے میں بھی کوشاں تھی، اردو نے رعایا اور راعی دونوں کو اسیر کر لیا تھا، میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ نے زمانے کے ادبی ماحول میں تہلکہ ڈال دیا تھا، نتیجتاً فارسی کو نظر انداز کر کے لوگ سنجیدگی کے ساتھ اردو کی طرف متوجہ ہونے لگے، فارسی عدم توجہی کا شکار ہو کر غیر مقبول ہونے لگی، خود ہمارا شاعر نئی زبان کی قوت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایسے زمانے میں ہمارا شاعر شیریں اور جذباتی زبان میں نغمہ سرائی کرتا رہا مگر یہ نغمے صدا بصحرا بن کر رہ گئے، دراصل بلبل باغ کے بجائے بازار میں گا رہا تھا، ورنہ اس کے نغموں اور فن میں کوئی خرابی نہ تھی، محض زمانہ بدل گیا تھا، حالات دگرگوں ہو گئے تھے، وہ ایک تنہا فرد تھا جو ایک متروک راستہ پر گامزن تھا اور مخالفت اور تضحیک کے باوجود اپنے اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا، غالبؔ پیدایشی شاعر تھا، ذوقِ نغمہ ودیعت فطری تھی، لہٰذا اسے دوستوں کی تحسین یا دشمنوں کی نفرین کی کوئی پرواہ نہ تھی، وہ شدّت پسند انقلابی تھا اور ہمیشہ دھارے کے خلاف تیرتا رہا، اسے اس تصور میں پوشیدہ مسرّت اور رُوحانی لذّت محسوس ہوتی کہ ایک دن اُس کی کوہ کنی بار آور ہو گی، وہ فخریہ کہتا ہے ؎

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ اند
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

غالب کی فارسی شاعری کی عدم مقبولیت کا تیسرا سبب "حسد کا سبز چشم دیو" ہے جس نے بڑی حد تک لوگوں کے دلوں میں بے التفاتی کا رویہ فارسی شاعری کے خلاف پیدا کر دیا، غالب کی شخصیت ہمہ گیر تھی، جب اس کے اِرد گرد ٹمٹماتے ہوئے ستاروں نے شہنشاہِ سخن کا پُرشوکت نغمہ سُنا تو اس کے خلاف سازش میں لگ گئے تاکہ آفتابِ عالمتاب کی تابندگی کو دھندلا کر دیا جائے، اس کے خلاف ایک بالمقصد مہم چلائی گئی جس کا واحد مقصد اس کے اشعار کی تذلیل و تضحیک تھی، عوام کی ذہنیت خود ساختہ قائدین کے اشاروں پر ادلتی بدلتی ہے، بنا بریں غالب کی فارسی شاعری سے نفرت، حقارت اور مسخرگی کا عام سلوک کیا گیا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے اختتام کے ساتھ ہر اس چیز پر ضربِ کاری پڑی جس کا تعلق اسلامی ثقافت سے تھا، اردو اور فارسی کی چتا پر انگریزی زبان اُبھری اور معاً دونوں زبانوں کو بیدخل کر دیا، اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ مسلمان نئی ضرب سے تلملا رہے تھے، ذہنی طور پر مفلوج تھے اور قوت فیصلہ سے محروم ہو کر راہ عمل متعین کرنے میں قاصر ہو رہے تھے، انہیں اپنی قومی اور تہذیبی ورثہ کا اندازہ کرنے کی بھی مہلت نہ تھی، چنانچہ انہیں اپنی ثقافت سے دور کا بھی لگاؤ باقی نہ رہ گیا تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چُن چُن کر اپنی تہذیب و ثقافت کے آثار کو مٹانے کے درپے ہوں، اگر بروقت سر سید بیداری کا علم بلند نہ کرتے تو ان کا مستقبل محض سادہ ورق بن کر اُن کے سامنے ہوتا۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ غالب اپنے فارسی کلام کا کوئی مکمل مجموعہ نہ پیش کر سکا، علاوہ "گل رعنا" کی منظومات کے، جو بوجہ قلیل ہونے کے، اس کے صحیح آرٹ کی ترجمانی نہیں کرتیں، اور کوئی وقیع انتخاب نہ تھا، نیز یہ اس زمانے کی تخلیق ہیں جب غالب کی فکر و اسلوب کی تشکیل ہو رہی تھی، ہنوز تکمیل نہ ہوئی تھی، نواب رامپور کو جو مجموعہ پیش کیا گیا تھا وہ عوام کی نظروں سے ایک مدت تک پوشیدہ رہا اور ۱۹۴۱ء میں چھپا،

چھٹا اور نسبتاً وقیع سبب ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے متعلق غالب کی دُرُشت کلامی اور سنگین گرفت ہے، ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے عوام کے جذبات کو بلا وجہ مجروح کیا اور مُلکی شاعری کی توہین و تحقیر کر کے عوام کی ہمدردی سے محروم ہو گیا، قتیل اور اُس کے ہمنواؤں کے خلاف گرزآزمائی خود غالب کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوئی کیونکہ معاصر شعرا میں سے بیشتر قتیل سے متاثر تھے، اپنے استاد کے خلاف معاندانہ تنقید سے برافروختہ ہو کر قتیل کے تلامذہ نے غالب کی شاعری کو بڑی تلخ اور تند زبان میں مطعون کیا اور رائے عامہ کو اُس کے کلام کے خلاف کر دیا۔

ساتواں سبب یہ ہے کہ گو غالب کا اسلوب اعلیٰ اور پُرشکوہ ہے، لیکن بلند آہنگ اور غیر سلیس بھی ہے، انتہائی گتھے ہوئے اسلوب کے ساتھ تخیل میں ابہام بھی پایا جاتا ہے جس کی بنا پر اُس کی فارسی شاعری سے بے اعتنائی برتی گئی۔

(۴) سخن ناشناسی

غالب کا شعر اُس کی نثر سے زیادہ ارفع ہے اور اس کی نثر اُس کے شعر سے اعلیٰ ہے، اُس کی شاعری کی پذیرائی کماحقہ نہیں ہوئی، یہ مانا کہ حالات ناسازگار تھے، مگر ہمارے خیال میں اُس کے فارسی کلام کو زرِ کم عیار قرار دینے میں قصداً ناانصافی برتی گئی ہے، غالب اپنے پُردرد اور پُرسوز کلام میں بے روح، بے ذوق اور سخن ناشناس معاصرین کی شکایت کرتا ہے، اگر اُس کے فن کی سچی داد دی جاتی تو اُس کی زندگی کا کرب و درد اور اس کی تلخ نوائی کم ہو جاتی، ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی شاعری نظامی، انوری سعدی، حافظ اور جامی جیسے نغز گو شعرا کے مقابل نہیں لائی جاتی، لیکن کیا اُس کی شاعری نظیری، عرفی، ظہوری اور حزیں کے ہم پلّہ نہیں جن کا فن کسی قوم کیلئے باعث صد افتخار ہو سکتا ہے؟ اصل میں غالب کی انتہائی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے مُلک میں پیدا ہوا، جو غیروں کی پذیرائی اور اپنوں کی تضحیک کا عادی تھا، یہ بے حسی یہ کور ذوقی اور یہ زوال پذیر اور مغلوب خیالات غالب کے عہد کی رُوح پر افسوسناک طنز ہے، اگر وہ سلطنت مغلیہ

کے دورِ اولین میں پیدا ہوتا تو زمانے کے بہترین شعرا کے اعزازات میں برابر کا شریک ہوتا۔

(۵) تعلّی

دوسروں پر چھا جانے اور اُن پر حکم چلانے کا شوق بلاشبہ خود فریبی اور ضِد کی پیداوار اور بیجا غرور کا مظہر ہوتا ہے، اور یہ شوق مشرق کے بیشتر شعرا میں پایا جاتا ہے، جہاں تک ہمارے شاعر کا تعلق ہے یہ بات باوثوق طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس میں غلبہ حاصل کرنے یا احکامات جاری کرنے کا جذبہ نہ تھا اور نہ رشک اور نفرت کا احساس، چونکہ وہ زبان کی باریکیوں پر عبور رکھتا تھا، اِس لئے وہ اُس کے اصول و قواعد سے جاہلانہ انحراف یا محاورہ و روزمرہ کی بربادی گوارا نہیں کر سکتا تھا، جیسا کہ اِس باب میں اُس کی تلخ نوائی سے ظاہر ہے۔ اس کے اس رویّہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جس کا نتیجہ علمیت و ذکاوت کے مقابلہ کی شکل میں ظاہر ہوا، غالبؔ ایک بیباک اور نڈر سپاہی تھا، وہ دن کو رات نہیں کہہ سکتا تھا، الحق مُرٌّ اس کی دیانت اور صیانت کے نتیجہ میں ناخوشگوار ادبی مباحثہ رُونما ہوا، پھر یہ کہ غالبؔ نے اپنے آپ کو فارسی زبان کا سب سے بڑا محقق کبھی نہیں کہا، اُس کو اپنے نقائص کا اسی طرح علم تھا جیسے دوسرے کے محاسن کا، حقیقت یہ ہے کہ اس میں اپنے بدترین دشمن کی کاوشوں کی بھی داد دینے کا جذبہ موجود تھا، وہ کہتا ہے ؎

سخن چون زہمدم بہ پیغارہ نیست
مرا از پذیرفتنش چارہ نیست

اس نے رُودکی سے لے کر فیضیؔ تک اساتذۂ ادب کا اعتراف کیا ہے، بلکہ خوشی کے ساتھ اُن کی پیروی کی ہے، فارسی زبان سے لگاؤ نے گاہ گاہ اُسے مُلکی مشاہیر کے عیوب کی طرف اشارہ کرنے پر مجبور کیا، ہمارے نزدیک اُس نے ہندوپاک کے ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے، کیونکہ اصولِ زبان سے انحراف پر اُس نے جتنی گرفتیں کی ہیں آج تک انہیں رد نہیں کیا جا سکا،

علاوہ ازیں تعلّی عین فطرت انسانی ہے، اور ایک ایسے شاعر میں یہ خصوصیت زیادہ فطری معلوم ہوتی ہے جو اپنے فن کی صلاحیتوں کا اِدراک رکھتا ہے اور دوسروں پر فضیلت کا مُدّعی ہے، یہ جذبہ ہمارے تمام شعرا میں مُشترک ہے، رودکی مسعود، خاقانی حافظ، عُرفی، قاآنی اور اقبال جیسے شعرا نے بھی تعلّیاں کی ہیں، عُرفی اور قاآنی نے تو اس آرٹ کو "قبیح حسن" درجہ تک پہنچا دیا ہے۔

ہمارے شاعر کی تعلّی نا آسودگی اور ذہنی انتشار کی مرہونِ منت ہے کیونکہ جب غالب نے اپنی شاعری کے خلاف کھُلی سازش ہوتے دیکھی تو وہ اپنی ستایش آپ کرنے لگا، شاعر فنکار ہوتا ہے، اُس کا فن لوگوں کی سرپرستی سے پروان چڑھتا ہے اور جب یہ سرپرستی نہیں ملتی تو وہ خودستائی پر آمادہ ہو جاتا ہے، دنیا بڑی ستم ظریف ہے، یہ کسی کو ایک راہ پر نہیں چلنے دیتی، اس کی خود غرضانہ پالیسی ہمت شکن اور مایوس کن ہے، یہ بڑی دوغلی ہے، یہ نہ ہنستے کو ہنستا ہوا دیکھ سکتی ہے اور نہ روتے کو روتا ہوا دیکھ سکتی ہے، اگر کوئی ہنستا ہے تو یہ اُس کے ہنسنے پر روتی ہے اور اگر کوئی روتا ہے تو یہ اُس کے رونے پر ہنستی ہے۔ ؎

کس قدر بے اعتبار ہے دنیا
کس قدر ناہنجار ہے دنیا

فصلِ دُوم

سوانح حیات

آگرہ میں

(از ۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۲ء)

فضائے آگرہ جولانگہِ مسیح دمیست
زمن بہ ہم نفسان وطن مبارک باد

غالب برّصغیر ہندوپاک کے اُن زیرک اور دُور اندیش ادباء میں سے ہے، جنہوں نے اپنے سوانح نگار کی ضروریات پہلے ہی سے محسوس کرلی تھیں، چنانچہ اس نے اپنی زندگی کے متعلق بیش بہا سرمایۂ معلومات چھوڑا ہے جو طویل اور بسیط ہے، یہ تفصیلات اُس کے شہرۂ آفاق اردو خطوط[1] اور فارسی کلیاتِ نثر میں بکھری پڑی ہیں۔

چونکہ ہمارے شاعر نے اپنی زندگی دو اہم تاریخی شہروں میں گذاری ہے، ہم نے اس کے سوانح کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں آگرہ کی زندگی اور دوسرے میں دہلی کی زندگی کے واقعات کی تفصیل ہو گی۔

---

[1] اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی، ان خطوط کو غالب کی جستہ جستہ سوانحعمریاں کہنا چاہیے، یہ خطوط ہلکے پھلکے انداز میں لکھے ہوئے ہیں مگر ان کی نقالی نہیں ہو سکتی۔

۱- نام

غالبؔ کا پورا نام محمد اسد اللہ بیگ خاں تھا، اُس کی تحریروں میں اس کے متعلق متواتر اشارات اور حوالے ملتے ہیں، بعض اوقات وہ اشعار میں پورا نام نظم کرتا ہے۔ ؎

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

از آن جہت کہ ستائش نگارِ نوا.بی
ترا ہم اے اسد اللہ خان مبارک باد

غالبِ نام آورم، نام ونشانم مپُرس
ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

وُہ عام طور پر اسد اللہ خاں کے نام سے موسوم تھا اور بیشتر مرزا غالبؔ کے نام سے شعر کی دنیا میں وہ غالبؔ کہلاتا ہے، ”مرزا“ اُس کے ترکی نسب پر دالّ ہے،

۲- عرفیت

جاگیرداروں اور سرداروں میں عرفیت کا عام رواج تھا، عام طور پر اِس سے محبت اور وجاہت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، چونکہ باپ کی عرفیت ”مرزا دولہا“ تھی، اس لئے غالبؔ نے اپنی شادی کے بعد ”مرزا نوشہ“ کی عرفیت اختیار کی غالبؔ کو یہ عام طرزِ خطاب پسند نہ تھا، کیونکہ تفتہؔ (منشی ہر گوپال) کو اس کے بارے میں بڑی بیزاری کے ساتھ لکھا ہے۔

”صاحب مطبع کے خط کے لفافہ پر لکھا ہے ’مرزا نوشہ صاحب غالبؔ‘ للّٰہ غور کرو، کتنا بے جوڑ جملہ ہے ...... تم نے بھی میرا نام نہیں بتایا..... دہلی کے عوام کو تو یہ عُرف معلوم ہے، مگر کلکتہ سے ولایت تک کوئی اِس نالائق عُرف کو نہیں جانتا“ ؎۲

؎۲ خطوط غالب از مہیش پرشاد صفحہ ۴۴-۴۵-

۳- خطابات و اعزازات

غالبؔ کو آخری مغل تاجدار نے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو عطا کیا جب اُس کو خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا[۳]، حکومت برطانیہ نے سالانہ خلعت منظور کیا اور گورنر جنرل ہند کے دربار میں کرسی ملی، نواب یوسف علی خاں کو لکھا ہے۔

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاستِ دودمانی کا رکھتا ہوں، معاش اگر قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں، گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر، اور سات پارچے اور جیغہ، مالائے مروارید، خلعت ہے" [۴]

میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط میں یوں لکھا ہے۔

"عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے لئے ہوتا ہے، بنا رہا، خانصاحب، بسیار مہربان القاب، خلعت، سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید، بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے، بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں،" [۵]

غالبؔ کو دربار اودھ سے بھی خلعت ملا تھا، [۶]

۴- تخلص

غالبؔ نے مختلف اوقات دو مختلف تخلص اختیار کئے، ابتدا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اسد اللہ الغالب کے خطاب گرامی پر اپنا تخلص اسدؔ رکھا، لیکن بعد میں بدل کر غالبؔ کر دیا، ایک مرتبہ منشی شیو نرائن نے غالبؔ کو وہ

---

[۳] کلیات نثر صفہ ۱۷۱-۱۷۲، [۴] عود ہندی۔ نولکشور صفہ ۲۵،

[۵] خطوط غالب از مہیش پرشاد صفہ ۲۰۵،

[۶] ایضاً صفہ ۲۶۲،

غزل بھیجنے کی فرمائش لکھی جس کے مقطع کا مصرعہ ہے:۔

"اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں،، غالب نے جواب میں لکھا۔ [۷]

"بھائی حاشا، ثم حاشا، اگر یہ غزل میری ہو، اس غریب کو میں کیوں کچھ کہوں، لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت، اس سے آگے ایک شخص نے میرے آگے یہ مطلع پڑھا اور کہا قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے ؎

اسدؔ اِس جفا پر بتوں نے وفا کی
میرے شیر، شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی ان سے کہا کہ اگر مقطع میرا ہو تو مجھ پر لعنت، بات یہ ہے ایک شخص میر امانی اسد ہو گذرے ہیں یہ مقطع اور یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام میں ہے اور تذکروں میں مذکور رہے۔" [۸]

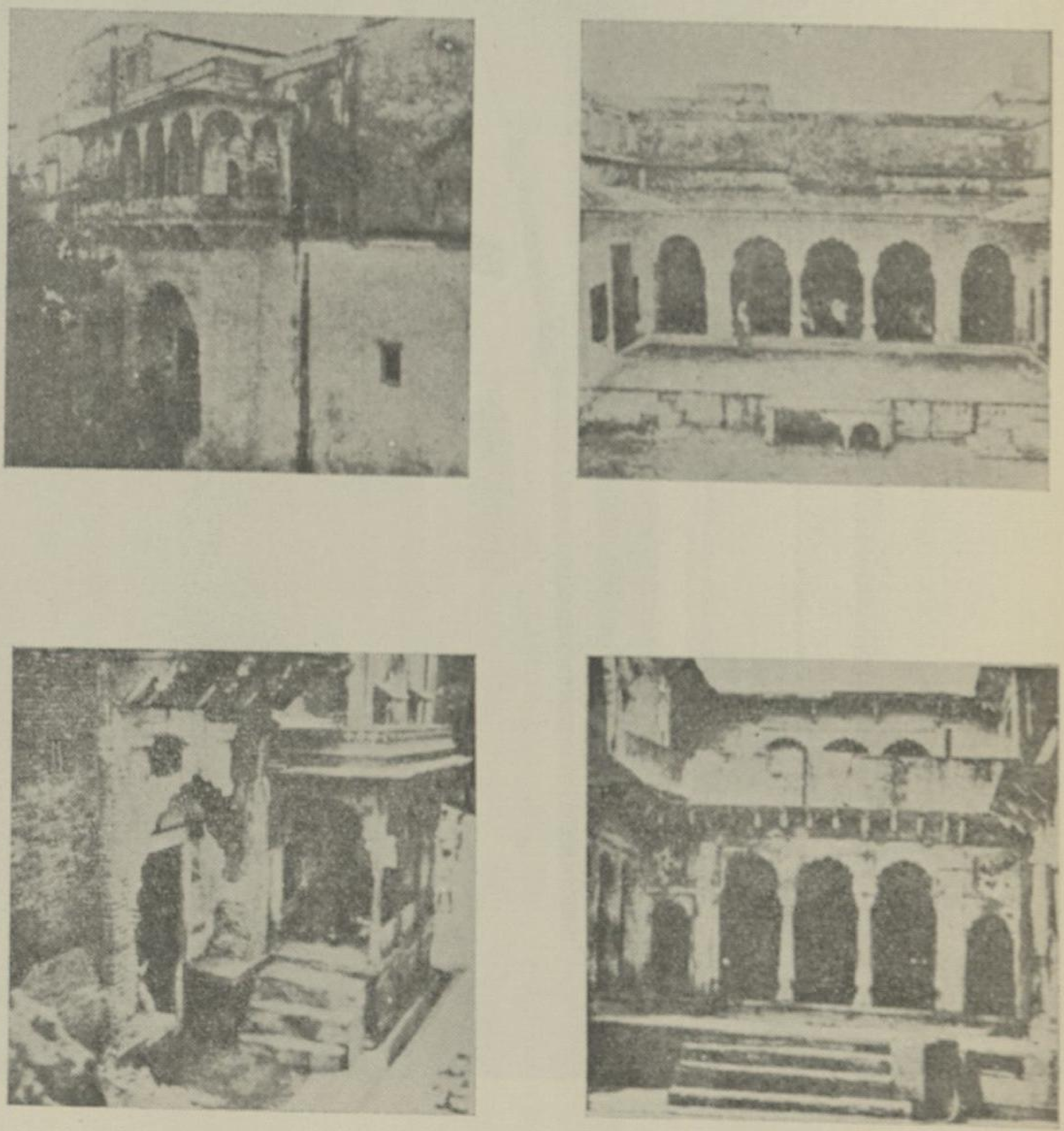
حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے اسدؔ تخلص ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ ترک کیا کیونکہ اس سال کے بعد اس کی کسی غزل میں یہ تخلص نہیں ملتا، وہ اپنے تخلص پر نازاں بھی ہے اور سخن ناشناسی اور ناقدری پر متأسف بھی ہے، کہتا ہے

ہر کجا "غالب"، تخلص در غزل بینی مرا
می تراش آن را و "مغلوبی"، بجائیش می نویس

---

[۷] ایضاً صفہ ۳۹۵ ، [۸] پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف "آب حیات"، صفحہ ۵۰۰ میں لکھا ہے کہ جھجر میں ایک شاعر رہتا تھا جس کا تخلص اسدؔ تھا، ایک بار کسی شخص نے اس کا شعر غالبؔ کے سامنے پڑھا، یہ سن کر غالبؔ نے ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں اپنا تخلص بدلا، ہمارے نزدیک یہ آزادؔ کی دیگر ایجادات کی طرح من گھڑت ہے، غالبؔ نے اس نکتہ کی وضاحت خود شیو نرائن والے خط میں کردی ہے، آزادؔ دولت شاہ سمرقندی کی طرح کم اعتبار تذکرہ نویس ہے۔

جائے ولادت مرزا غالبؔ، آگرہ



۱-۲- کلاں محل ۳-۴- کٹرہ گڈریوں والا۔



قاسم جان کی گلی دہلی میں غالبؔ کا مکان

۵۔ تاریخِ ولادت

غالبؔ کی صحیح تاریخ پیدائش کے متعلق سب متفق ہیں، وہ آگرے میں بروز چہارشنبہ بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو پیدا ہوا، ولادت کے وقت عزت النسا بیگم کو کیا معلوم تھا کہ اس کا نونہال ہندوستان کی ادبی افق پر آفتاب جہانتاب بن کر چمکے گا اور اپنا دبستانِ شاعری الگ قایم کرے گا۔

علاؤالدین احمد کے نام مکتوب میں لکھا ہے:

"ہرچند یہ قاعدہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں، چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے لئے یہاں بھیجا گیا ہوں۔" [۵]

فارسی دیوان کے خاتمہ پر غالبؔ نے ایک دلچسپ رباعی لکھی ہے جس میں تاریخ پیدائش بھی ہے۔ ؎

غالبؔ کہ چون ناسازی فرجام نصیب
ہم خوفِ عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالم قدس
ہم "شورش شوق" آمد و ہم لفظِ "غریب"

۶۔ نسب

غالبؔ کو اپنی خاندانی نجابت پر بجا فخر تھا، اس کی نجابتِ نسبی کے بارے میں کلیاتِ نظم و نثر دونوں میں لطیف و نغز اشارات موجود ہیں، وہ اپنے خاندان کا سلسلہ وسطی ایشیا کے ایک ممتاز ترک قبیلے ایبکوں سے ملاتا ہے۔ یہ قبیلہ

۵۔ مہیش پرشاد صفہ ۳۲۷،

اپنا سلسلہ سلاطین سلجوقیہ کے توسط سے افراسیاب، فریدون اور جمشید سے قائم کرتا ہے، اس کے اجداد جنگجو، تیغ زن، تیر انداز اور بہادر سپاہی تھے،

کہا جاتا ہے کہ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں ولد ترسم خاں ہندوستان میں آئے اور لاہور میں نواب معین الملک کی ملازمت میں داخل ہو گئے، اپنے آقا کی وفات کے بعد وہ دہلی چلے گئے، ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں سپہ سالارِ شاہ عالم نے انہیں ایک اعلیٰ منصب پر مامور کیا اور دہلی کے قریب پرگنہ پہاسو ذاتی اخراجات اور ماتحت فوج کے مصارف کے لئے عطا کیا، وہ دہلی ہی میں مقیم ہو گئے، یہیں اُن کا سب سے چھوٹا لڑکا عبداللہ بیگ خان پیدا ہوا جو ہمارے شاعر کا پدر ہے۔

سراج الدین احمد کو ایک بار غالب نے لکھا ہے۔

"ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد، و بزرگان من از آنجا کہ با سلجوقیان پیوندِ ہم گوہری داشتند، بعہدِ ایرانیان رایت سروری و سپہبدی افراشتند، بعد سپری شدنِ روزگار جاہ مندیٔ آن گروہ چون نارواییٔ و بےنوائیٔ رُوی آورد، جمعی را ذوقِ رہزنی از جای برد، و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت، نیاگانِ مرا بہ توران زمین شہرِ سمرقند آرامشگاہ شد، از آن میان نیای من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور ہمرہی معین الملک گزید، چون بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند، بہ دہلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہادر پیوست، از آن پس پدرم عبداللہ بیگ خان بہ شاہجہان آباد بوجود آمد، و من بہ اکبر آباد۔" [۱]

دِرَفشِ کاویانی میں غالب لکھتا ہے۔

"بالجملہ سلجوقیان بعد از زوال و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند، از آن جملہ سلطان زادہ

---

[۱] کلیات نثر صفحہ ۱۵۴

تُرسم خان کہ ما از تخمۂ اُوئیم سمرقند بہرِ اقامت گُزید تا در عہد سلطنتِ شاہ عالم نیای من از سمرقند بہ ہندوستان آمد۔" ؎[۱]

غالب اپنے شاہانہ سلسلۂ نسب اور سپاہیانہ وراثت پر بجا طور پر فخر کرتا ہے اور عظیم اجداد کی تعریف میں یوُں نغمہ سرا ہوتا ہے ؎

غالب از خاکِ پاکِ تُورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم

ترک نژادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگانِ قوم پیوندیم

ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی زماہ دہ چندیم

فن آبائی ماکشا ورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم

ساقی کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم است
میراثِ جم کہ می بود اینک بمن سپار
زین پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

آقای بزرگ شیرازی المتخلص بہ وفا کے نام ایک خط میں لکھا ہے ؎

خلیجم ولی نور چشمِ محیطم — غریبم ولی رُوشناس جہانم

بہ مضمارِ دعوئ خداوندِ رخشم — در اقلیمِ معنی جہان پہلوانم

گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم — گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم

دِل و دست تیغ آزمائی ندارم — رہ و رسمِ کشور کشائی ندانم

چہل سال توقیع معنی نوشتم — سزد گر نویسند صاحبقرانم

ذوق کے مشہور سہرے کے جواب میں غالب نے یہ کہہ کر حریف کو ساکت و صامت کیا ؎

---

[۱] درفش کاویانی صفحہ ۵۴،

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

یہ واقعی حیرت ناک امر ہے کہ ایک ایسے قبیلہ کا رُکنِ رکین جو تیر اندازی اور شمشیر زنی میں مہارت و شہرت رکھتا تھا، اس نے عنان توجہ دنیائے شاعری کی طرف پھیری اور اِس فن میں بھی ویسا ہی کمال کر کے دکھایا جیسا اس کے اجداد نے میدان جنگ میں کر کے دکھایا تھا،

۷۔ غالب کا والد

توقان بیگ خان کی زبان ترکی تھی، اُس کے سات بچے تھے، چار بیٹے اور تین بیٹیاں، صرف دو بیٹوں کا ذکر تاریخ میں آتا ہے، نصر اللہ بیگ خاں بڑا بیٹا تھا اور عبد اللہ بیگ خان چھوٹا بیٹا تھا، مؤخر الذکر دہلی میں پیدا ہوا، باپ کی وفات پر دونوں بھائیوں نے اپنے اجداد کا پیشہ سپہ گری اختیار کیا، عبد اللہ خان پہلے نواب آصف الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوا، کسی وجہ سے وہاں سے استعفا دے کر حیدر آباد پہنچا، وہاں تین سو سپاہیوں کا افسر مقرر ہُوا اور عرصہ تک رہا، بعد میں کچھ مقامی ہنگاموں کی وجہ سے یہ ملازمت ترک کرنا پڑی،

اس کے بعد ہم اس کو راجہ بختاور سنگھ والی الور کی ملازمت میں پاتے ہیں، یہاں بھی قبل اس کے کہ کوئی اعلیٰ منصب حاصل کرتا راج گڈھ کے ایک باغی سردار کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا جہاں وہ لڑتا ہوا مارا گیا، یہ سانحہ ۱۸۰۲ء میں وقوع پذیر ہوا، اس وقت غالب کی عمر پانچ سال تھی۔

وزیر اعظم حیدر آباد نواب مختار الملک کے سر رشتہ دار منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں غالب نے اپنے باپ کی ملازمت کی مہمات کا تذکرہ یوں کیا ہے،

باپ[۱۲] میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا ملازم ہُوا، کئی برس وہاں رہا، وہ نوکری ایک خانہ جنگی بکھیڑے میں جاتی رہی، والد نے

---

[۱۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴-۲۵،

گھر آکر الور کا قصد کیا، راجہ بختار سنگھ کا نوکر ہوا، وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔"[۱۲]

کہا جاتا ہے کہ غالب کا باپ خانہ داماد تھا[۱۳]، عبداللہ بیگ خاں نے دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی، چھوٹی خانم بڑی، غالب منجھلے اور مرزا یوسف بیگ خاں سب سے چھوٹے تھے۔

۸۔ غالب کا چچا

۱۸۰۲ء میں باپ کے مرنے کے بعد غالب کی پرورش کا بار اس کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ذمہ پڑا جو اُس وقت ایک نامی گرامی جنگجو سپاہی اور مرہٹوں کی جانب سے آگرہ کا صوبہ دار تھا، جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپہ سالار لارڈ لیک نے قلعہ پر حملہ کیا تو نصر اللہ خاں نے شہر کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں، اگر نواب احمد خاں بنگش والی لوہارو اپنے بہنوئی کو لارڈ لیک کی اجازت سے اپنی ملازمت میں شامل کر کے بریگیڈیئر نہ بنا دیتا تو نصر اللہ خاں کی ملازمت کا یقیناً خاتمہ ہو جاتا، چار سو سپاہی ماتحت ہوئے، نیز تاحیات پرگنہ جات سونک اور سونسہ نواح آگرہ میں عطا کئے گئے، ان پرگنوں سے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی تھی جو اُس کے ذاتی اخراجات اور سپاہیوں کے مصارف کے لئے کافی تھے۔

جب غالب نو برس کا تھا تو اُس کا چچا ہاتھی سے گر کر مر گیا، اس کے مرنے کے بعد لارڈ لیک نے سونک اور سونسہ کی جاگیریں فیروز پور جھرکا میں شامل کر دیں اور اس کے معاوضہ میں مرحوم کے متوسلین کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی، مگر والی لوہارو نے ذاتی بغض سے کام لیتے ہوئے، یہ رقم ادا کرنے کے بجائے، عیاری سے خفیہ طور پر ایک دوسرا حکم حاصل کر لیا جس کی رو سے محض تین ہزار روپیہ سالانہ کی رقم مقرر ہوئی، یہ ترمیم جیسا کہ آیندہ اوراق سے معلوم ہوگا، خاندان لوہارو اور غالب کے

---

[۱۲] اردوئے معلیٰ صفہ ۲۴-۲۵، [۱۳] ایضاً

مابین مستقل رنجش کا سبب بن گئی اور اسی وجہ سے ہمارا شاعر ذہنی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوا اور مرتے دم تک مبتلا رہا۔

اس مسئلہ پر غالبؔ نے بہت کچھ لکھا ہے، نمونہ کے طور پر منشی حبیب اللہ ذکا کے نام لکھتا ہے

"نصر اللہ بیگ خان میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے (آگرہ کا) صوبیدار تھا اس نے مجھے پالا، ۱۸۰۶ء میں جرنیل لارڈ لیک کا عمل ہوا، صوبیداری کمشنری ہوگئی، اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا، میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا، چار سو سواروں کا بریگیڈیئر مقرر ہوا، ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی جاگیر عین حیات علاوہ مرزبانی کے تھے کہ بمرگ ناگاہ مرگیا، رسالہ برطرف ہوا ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی، وہ اب تک پاتا ہوں، پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا اور آٹھ برس کا تھا جو چچا مرگیا۔"[۶۶]

عبد الغفور سرور کے نام خط میں لکھا ہے:۔

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال کا مقرر ہوا، انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال، اس میں خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات سو روپیہ سال، میں نے سرکار انگریز میں بہ غبن ظاہر کیا۔"[۶۷]

۹۔ غالب کا بھائی

مرزا یوسف بیگ خاں مرزا غالبؔ کا چھوٹا بھائی تھا، غالبؔ اس سے دو سال

---

۶۶ اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۔۲۵، ۶۷ ایضاً صفحہ ۱۱

بڑا تھا، تیس سال کی عمر میں وہ پاگل ہوگیا، ستم بالائے ستم یہ کہ غدر کے دوران اس کی بیوی، بیٹی اور بچے اس کو ایک بوڑھے چوکیدار اور ملازمہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جے پور چلے گئے، اُسے ایک انگریز سپاہی نے ۱۹ اکتوبر[۱۵] ۱۸۵۷ء کو قتل کر دیا[۱۶] غالب نے دستنبو میں لکھا ہے:-

"برادر کہ دو سال از من کوچک است در سی سالگی خرد بہ باد داد و دیوانگی و کالیدگی گزید، سی سال است کہ آن دیوانۂ کم آزار بی خروش است و بی ہوش می زید، خانۂ وی از من جداست، و کما بیش دوری دو ہزار گام درمیان" [۱۷]

غالب نے یوسف کی وفات پر مندرجہ ذیل مثنوی لکھی ہے جس کا تیسرا شعر سعدی اور فردوسی کے پاکیزہ تخیل اور طرز بیان کی یاد دلاتا ہے، ؎

دریغ آنکہ اندر درنگ سہ بیست　سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہ خاکِ بالین رختش نبود　بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا برین مردہ بخشایشی　کہ نادیدہ در زیست آسایشی
سروشی بہ دلجوئی او فرست　روانش بہ جاوید مینو فرست

۱۰۔ غالب کی والدہ

غالب کی والدہ عزت النسا بیگم آگرے کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی تھی، متعدد گاؤں غالب کے نانا کی جاگیر میں تھے، نیز وہ فوج کے ریٹائرڈ عہدہ دار تھے، اسی وجہ سے اُس کو کمیدان کہتے ہیں، خود آگرہ میں اُس کی وسیع جائداد تھی، ۴۴

اِسی بنا پر غالب کو اپنی خاندانی نجابت پر فخر تھا، اگر اس کو بچپن میں

---

[۱۵] ایضاً صفحہ ۱۲ ؎　[۱۶] ایضاً صفحہ ۲۹۹ و دو دیسی حکایات صفحہ ۲؎

[۱۷] کلیات نثر صفحہ ۳۹۳ ۴۴ خطوط: ۳۸۰-۳۸۱؎

یتیمی کا داغ نہ نصیب ہوتا تو یقیناً ہندوستان اس دُرِّ نایاب سے قطعاً محروم ہو جاتا جو اُفقِ ادب پر آفتابِ عالمتاب بن کر چمکا، بجا طور پر اُس کو دعویٰ ہے ؎

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند
بسخن ناصیۂ فرّ کیانم دادند
ہر چہ از دستگۂ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم، ہمہ از آن جملہ زبانم دادند

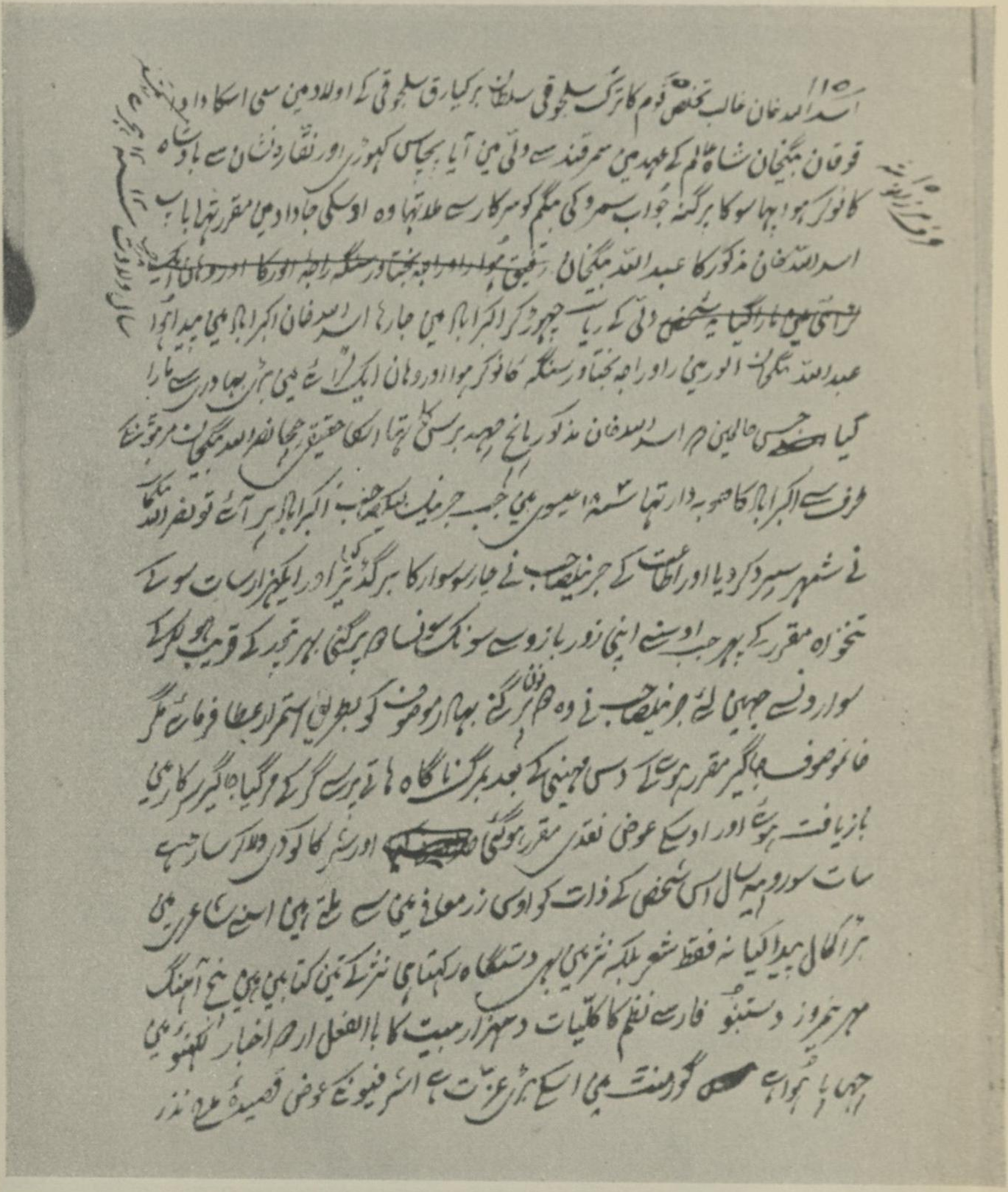
۱۱- علمی استعداد

غالبؔ کی تعلیم کے متعلق بہت کم تفصیلات دستیاب ہیں، قیاس غالب ہے کہ تعلیمیافتہ والدین کے آغوشِ تربیت میں اُس کے لئے بہترین اور کامل تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا گیا ہوگا اور اس شہر کے کسی ممتاز فاضل کے سامنے زانوئے ادب ضرور تہ کیا ہوگا۔ اور یہی ہوا، کیونکہ اس دَور کے سوانح نگار مالک رام، حالیؔ اور مہر آگرے کے مولوی محمد معظم کی شاگردی پر متفق ہیں۔[۱۸]

شیخ معظم اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور معقولات و منقولات میں یگانۂ روزگار تھے، رام بابو سکسینہ نے اپنی مشہور کتاب "اردو ادب کی تاریخ" میں نظیرؔ اکبر آبادی کی شاگردی سے اختلاف کیا ہے، یہ قیاس محض قیاس نہیں ہے، کیونکہ خود غالبؔ اور اس کے سب سے زیادہ معتبر سوانح نگار حالیؔ نے اس شخص کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، علاوہ ازیں غالبؔ کا پُر شکوہ طرزِ بیان نظیرؔ کے قصباتی اور عامیانہ انداز سے بالکل مختلف ہے، دونوں کے طرزِ فکر، طرزِ ادا اور پیش کش

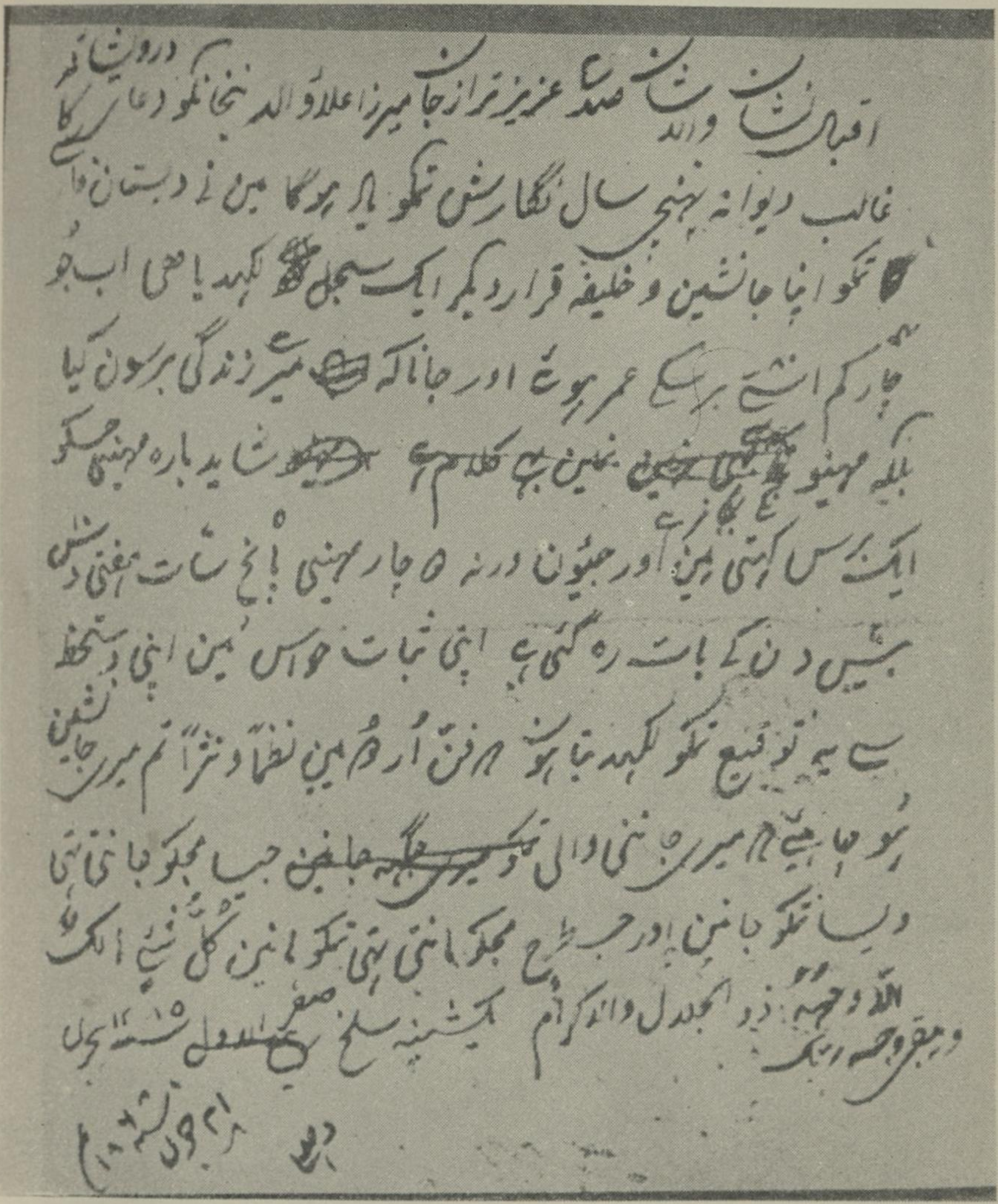
---

[۱۸] ذکرِ غالب صفہ ۱۸، یادگارِ غالب صفہ ۱۴ اور غالب صفہ ۵



اسد اللہ خان غالب تخلص قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اسکا دادا
قوقان بیگخان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ
کا نوکر ہوا تھا سو کا پرگنہ جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اوسکی جاگیر میں مقرر تھا باپ
اسد اللہ خان مذکور کا عبد اللہ بیگخان ~~رئیس ہوا اور راجہ بختاور سنگھ راجہ الور کا اور وہاں ایک~~
~~لڑائی میں مارا گیا یہ شخص~~ دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا اسد خان اکبرآباد میں پیدا ہوا
عبد اللہ بیگخان الور میں راو راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بہادری سے مارا
گیا جس کی حالیں اسد خان مذکور پانچ چھ برس کا تھا اسکا حقیقی چچا نصر اللہ بیگخان مرہٹوں کی
طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا سنہ ۱۸۰۳ عیسوی میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ
نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر اور ایک ہزار سات سو کی
تنخواہ مقرر کی پھر جب اوس نے اپنی زور بازو سے سونک سونسا دو پرگنے ہولکر کے قریب لڑ کر
سواروں سے چھین لئے جرنیل صاحب نے وہ دو پرگنے بہار موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے مگر
خان موصوف جاگیر مقرر ہوئے کے دس مہینے کے بعد یکایک ہاتھی پر سے گر کے مر گیا جاگیر سرکار میں
بازیافت ہوئی اور اوسکے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور ... سات سو
سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اوسی زر معاوضہ میں سے ملتے ہیں اسنے عمر میں
ہر ایک کمال پیدا کیا نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے نثر کی تین کتابیں ہیں پنج آہنگ
مہر نیمروز دستنبو فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل ازروئے اخبار لکھنؤ میں
چھپا ہوا ہے گورنمنٹ میں اسکی عزت ہے اکثر ... کے عوض قصیدہ مدح نذر

تذکرۂ مظہر العجائب (۱۸۶۴ء) میں اپنے بارے میں



اقبال نشان والا شان عزیز تر از جان میرزا علاؤالدین خانکو دعا کے بعد درویش ...

غالب دیوانہ پہنچے سال نگارش تمکو یاد ہوگا میں نے دبستان والی

تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل لکھ دیا تھا اب جو

چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا

بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے کلام ہے شاید بارہ مہینے مجھکو

ایک برس کہتے ہیں اور جیوں ورنہ ۵ چار مہینے پانچ سات ہفتے دس

بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی تمام ہوش و حواس میں اپنی دستخط

سے یہ توقیع تمکو لکھدیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین

ہو چاہیے کہ میرے جاننے والے تمکو میری جگہ جانیں جب مجھکو جانتے تھے

ویسے تمکو جانیں اور جس طرح مجھکو مانتے تھے تمکو مانیں کل شیء ہالک الا وجہہ

ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ ہجری

۲۱ جون ۱۸۶۸ء

مکتوب بنام نواب علاؤالدین علائی مورخہ ۲۱ جون ۱۸۶۸ء

کے انداز میں نمایاں فرق ہے، نظیر صرف ایک آزاد خیال شاعر تھا، اگرچہ تاریخ میں اسکول ماسٹر کی حیثیت سے اُس کا تذکرہ ملتا ہے، مگر غالب کی اُستادی کی حاصل کرنے کا کوئی ثبوت مہیا نہیں، مالک رام کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے میر اعظم علی کے قائم کردہ مکتب میں تعلیم پائی، کیونکہ غالب نے اس کا تذکرہ ہمیشہ تعظیم کے ساتھ کیا ہے۔ [۱۹]

۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۴ھ میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔[۲۰] ۱۴ سال کی عمر میں خوش قسمتی سے غالب کی ملاقات ایک اجنبی سے ہوئی، جو اُس کی زندگی میں دو سال تک دخیل رہا اور پھر پُراسرار طور پر لاپتہ ہوگیا، یہ شخص ملّا عبدالصمد تھا جو پیدائشی زرتشتی تھا اور بعد میں مشرّف بہ اسلام ہوا تھا، وہ ساسانِ پنجم کی اولاد میں سے تھا اور اُس کا پیدائشی نام ہُرمزد تھا، یہ شخص عربی اور فارسی کا محقق تھا اور شاید تاج محل کے "خواب مرمریں" سے مسحور ہو کر سیّاحانہ ۱۸۱۱ء میں آگرہ میں وارد ہوا تھا، یہ محض بخت و اتفاق کا کرشمہ تھا کہ غالب سے اس کی ملاقات ہوئی اور دو سال کے طویل عرصہ کے لئے ہمراہ رہنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس قلیل عرصہ کے اختتام پر "مِس خام کُندن بن گیا" یا بالفاظِ دیگر اِس مشّاق استاد نے اپنے نوجوان شاگرد کے تخیل کو زاویہ بہ زاویہ تراشا اور ایسا درخشاں ہیرا بنا دیا جس کی شعاعیں دُور دور پہنچیں، اس کے ذہن کو جلا دی اور فارسی زبان اور ادب کے اسرار و غوامض ذہن نشین کئے، اس مختصر ملاقات نے ہمارے شاعر کو فارسی زبان کا محقق بنا دیا۔

اس عظیم اُستاد کے فنِّ تدریس کی ممتاز خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے، ہم اس رائے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ محض دو سال کی تربیت خواہ کتنی ہی جامع ہو، کسی ذکی سے ذکی ذہن کو بھی تکمیل کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتی،

---

[۱۹] کلیات نثر صفحہ ۱۰۳، [۲۰] ذکر غالب صفحہ ۱۹،

جب تک کہ خود شاگرد میں بے پناہ مناسبت و صلاحیت نہ ہو، جب ذوق سلیم اور ذہنی صلاحیت کو صحیح رہنمائی ملی اور حصولِ زبان کے ذوقِ فطری نے ساتھ دیا، تو ادب پر ناقدانہ نظر پیدا ہوئی، سازِ نغموں سے پُر ہو گیا تھا اور ذرا سی چھیڑ سے حشر برپا کرنے کا منتظر تھا،

اتفاقیہ طور پر غالباً ہرمزد خلافت کے نسلی نظریہ کا قائل رہا ہوگا، کیوں کہ فارسی ادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ اس نے ہمارے شاعر کے ذہن میں تشیّع کے اصول و فروع بھی راسخ کر دیئے، اس ملاقات کے بعد ہم غالبؔ کو مسلک شیعیّت سے منسلک پاتے ہیں، اس تبدیلیٔ قلب و نظر کی کوئی اور وجہ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کے والدین اور اُس کے ننھیال اور ددّھیال حنفی المذہب تھے، تبدیلی عقائد کے علاوہ غالبؔ کو زرتشتی مسلک پر عبور حاصل ہوا جس کا ثبوت "قاطع برہان" سے ملتا ہے، وہ "دساتیر" [۲۱] کا بڑا ادب کرتا ہے، نواب علاؤ الدین احمد علائی کو لکھتا ہے:۔

"دساتیر" میرا ایمان و حرزِ جان ہے"، [۲۲]

غالب نے اپنے اُستاد کا تذکرہ بڑے احترام و تعظیم سے کیا ہے، خود ہُرمزد اپنے شاگردِ رشید کا خاص خیال رکھتا تھا، غالبؔ نے اپنی ابتدائی عمر اور تعلیم کے بارے میں لکھا ہے:۔

"میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مأتہ عامل [۲۳] تک پڑھا، اس کے بعد لہو و لعب، اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا، فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری

---

[۲۱] دساتیر آسمانی جو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے قدیم ایرانی پیغمبروں مہا آباد سے لے کر ساسانِ پنجم تک کی صحیفہ آسمانی شمار ہوتی ہے۔

[۲۲] جہیش پرشاد صفحہ ۳۲۱،

[۲۳] مصنفہ عبدالقاہر ابن عبدالرحمٰن جرجانی نحوی۔

اور طبیعی تھا، ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں، معہذا منطق میں مولوی فضل حق خیرآبادی اور مومن، موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر میں سیاحانہ وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت (خالص بے آمیزشِ عربی) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی، اس سے میرے حالی ہوئے، سونا کسوٹی پر چڑھ گیا، ذہن معوج نہ تھا، زبانِ دری سے پیوند ازلی اور اُستاد جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا، حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشین ہو گئی۔" [۲۴]

نواب کلب علی خاں رام پور کے نام لکھا ہے۔

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی مآخذ مجھ کو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اُس سے حقایق و دقایق زبان فارسی کے معلوم کئے، اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔" [۲۵]

حالی نے لکھا ہے کہ جب غالب دہلی گیا تو ہرمزد اس کے ہمراہ تھا۔ [۲۶]

غالب کے مزاج میں فارسی زبان سے ذوقِ فطری موجود تھا اور اسی وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے مہربان اور شفیق اُستاد عبدالصمد کی شاگردی سے انکار کر دیتا ہے، حالی لکھتے ہیں کہ ایک بار غالب نے کہا تھا۔

"مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے، چونکہ لوگ مجھے بے اُستادا کہتے تھے، اُن کا موہنہ بند کرنے کو ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے۔" [۲۷]

---

[۲۴] مہیش پرشاد صفہ ۸۴-۸۵، [۲۵] مکاتیب غالب از عرشی صفہ ۸۲

[۲۶] یادگار صفہ ۱۴، [۲۷] ایضاً صفہ ۱۴،

تفتہ کو لکھا ہے۔

"بھائی، میں فارسی کا محقق ہوں[28]" فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔" [29]

اس عطیۂ فطری کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی سراج الدین احمد کو لکھا ہے۔

"در سخن پروریافتگانِ مبداء فیاضم، وسوادِ معنی را فروغ گوہر خویش روشن کردہ ام، از ہیچ آفریدگار حق آموزگاریم و بارِ منتِ رہنمایم بر دوش نیست" [30]

مفتی سید محمد عباس کو ایک بار لکھا تھا:۔

"مبداءِ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے، مآخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے، فارسی کے ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں، مناسبت خدا داد، تربیت استاد، حسن و قبح، ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض جاننے لگا۔" [31]

ساطع برہان کے مصنف رحیم بیگ کو لکھا ہے

"زباندانیٔ فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے، فارسی کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے استاد سے کیا ہے۔" [32]

غالب نے فارسی زبان اور محاورہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک معیار مقرر کیا ہے، عبد الغفور سرور کے نام لکھا ہے:

"فارسی کی تکمیل کے لئے اصل الاصول مناسبتِ طبیعت ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان،

---

[28] اردوئے معلّٰی صفہ ۱۷۷ [29] مہیش پرشاد صفہ ۵۲

[30] کلیات صفہ ۱۵۵، [31] اردوئے معلّٰی صفہ ۱۷۷، [32] عود ہندی صفہ ۱۳۸۔

"......جب رودکی، عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"[۳۳]

اِسی ضمن میں وہ لکھتا ہے ؎

(۱) لطفِ طبع از مبدا رفیاض دارم، نی زغیر
دشت را خود رو بود گر سرخ گل و رسوسن است
از عطارد نبود م فیضِ سخن کان تنگ چشم
خود بحکم ہمفنی از رشک با من دشمن است

---

(۲) منکہ باساقی زوالائی فرو ناید سرم
آفتاب آسا بزر در خویش گرد و ساغرم

---

(۳) از معانی زمبداء فیاض
باد آنِ تو ہر چہ آن منست

---

(۴) ہمچو شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر، قلم مدّعی و نکتہ گو است
لوحش اللہ گہر افشانیٔ نال قلمم
یارب آبشخورِ این ابر کدامی دریاست

۳۳؎ ایضاً صفحہ

(۵) من آن کسم کہ بتوقیع مبداءِ فیاض
شۂ قلمروِ نظمم درین جہانِ خراب
ہمی کنم بقلم کار تیغ و این کاریست
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوالالباب

---

(۶) ہر چہ در مبداءِ فیاض بود آنِ منست
گل جدا ناشدہ از شاخ بدامانِ منست
جادۂ عرفی و رفتارِ شفائی دارم
دہلی و آگرہ شیراز و صفاہانِ منست

---

(۷) بر ذوق خداداد نظر دوختگانیم
در سینۂ ما زخمِ نمک سود نیابی
در وجد بہ ہنجارِ نفس دست نشانیم
در حلقۂ ما رقص دف و عود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی
در آتشِ ہنگامۂ ما دود نیابی

شرحِ مائۂ عامل تک تعلیم اس کی عربی دانی کا بیّن ثبوت ہے اگرچہ وہ اس زبان کے محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، تفتہ کو لکھا ہے۔

"میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں، بس اتنی بات ہے، کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں...... فارسی میں مبداءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر، اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں، ایک تو یہ کہ اُنکا مولد

ایران اور میرا مولد ہندوستان، دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دوسو، چارسو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔" ۳۴؎

غالب کا علم طب اکتسابی نہ تھا بلکہ تجربہ پر مبنی تھا، نواب کلب علی خاں کو ایک بار لکھا تھا:

"میں طبیب نہیں، تجربہ کار ہوں" ۳۵؎

نجوم غالب کا تفریحی مشغلہ معلوم ہوتا ہے۔ انوارالدولہ سعدالدین شفق کے نام جس نے ۱۸۵۸ء میں ایک دُمدار ستارے کے ظہور کا سبب دریافت کیا تھا، غالب نے بالکل غیر روایتی انداز میں مندرجہ ذیل جواب لکھا:

"آرایشِ مضامین کے واسطے کچھ تصوّف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونیٔ طبع کے یہاں کیا رکھا ہے، بہرحال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں، جس برُج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں پھر ذو ذنابہ کا ممر اور طریقہ دیکھتے ہیں، ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں، شاہجہان آباد میں بعد غروبِ آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ اُن دنوں میں آفتاب اوّل میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صورت عقرب میں ہے...... بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ دلیلیں ملک کی تباہی کی ہیں، قران النحسین، پھر خسوف، پھر یہ صورتِ پرکدورت، پناہ بخدا۔" ۳۶؎

۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کی صحت یابی پر غالب نے مندرجہ ذیل

۳۴؎ مہیش پرشاد صفہ ۸۳-۸۴ ، ۳۵؎ مکاتیب غالب صفہ ۶۲

۳۶؎ مہیش پرشاد صفہ ۱۳۹

زائچہ کھینچا:۔

"همانا از رازِ سپہر و ستارہ سخن ہمی رود، و خجستگی و فرخندگی چند گفتہ می شود، اکنون ناف ہفتہ کہ راستان در باستان این را بهرام روز میگفتند و اکنون سہ شنبہ نام دارد روزِ یست فیروز، ویژہ درین فرخ سال کہ دومین روز است از فروردین در روز بست و یکم از مارچ در روز بست و دوم از شوّال، باری نخست بر آن سرور نشان کہ امروز بہ شستن اندامِ آبروی گرمابہ افروز مبارک ...... همانا درین روزگار خسرو ستارگان کہ مہرِ منیرش دانی در برّہ و از سوی فراز نخستینِ سیّارگان کہ زحلش خوانی در ترازو، سعدِ اکبر بہ قوس و سعدِ اصغر بہ ثور" [۳۷]

کہا جاتا ہے کہ غالب نے کبھی کتاب نہیں خریدی۔ ملا عبدالرحمن جامی کی طرح وہ دوسروں سے کتابیں عاریۃً لے لیتا تھا اور مطالعہ کے بعد واپس کر دیتا تھا، تفتہ کو لکھا ہے:۔

"میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا" [۳۸]

داستانِ امیر حمزہ اس کی مستقل رفیق تھی،

۱۲۔ عنفوانِ شباب

غالب کی ابتدائی زندگی خصوصاً لڑکپن کا زمانہ بہت رنگین معلوم ہوتا ہے، خاندان اور ماحول کے پُر اَلم واقعات اور متواتر اموات کی بنا پر غالب ابتدائی عمر میں بداطوار ہو گیا تھا، اگرچہ تفصیلات دستیاب نہیں، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دُلارا بچہ ہونے کی وجہ سے ننھیال نے کڑی نگرانی نہیں کی ہو گی، لہٰذا بے مہار اور آزاد ہونے کی وجہ سے وہ برائیوں کے جہنم میں گر پڑا، چنانچہ قمار بازی بدمستی

---

[۳۷] مکاتیب صفحہ ۴۴، [۳۸] مہیش پرشاد صفحہ ۴۲،

قرض، مے نوشی اور عشق بازی اس کی عادت بن گئی، ماحول کے یہ زشت و بدنما تحفے اس کے صحیح، حقیقی، اصلی مستقبل کے لئے سدّ راہ بن گیئں، یہ عادتیں شاعر کے تحت الشعور میں سما گیئں، جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی مستقل عذاب ہو گئی، اس صحبت سے بچانے کے لئے نواب احمد بخش خاں لوہارو نے اُسے آگرہ سے نکال کر دہلی روانہ کیا، بقول حالی مرحوم کے غالب کا "عنفوانِ شباب بڑے اللّے تللّوں میں بسر ہوا"، [۳۹]

پروفیسر مالک رام اپنی مشہور تصنیف "ذکر غالب" میں لکھتے ہیں :-

"روپیہ پیسہ کی افراط اور آزادی، ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اگر غالب بھی اپنے زمانے کے رئیسوں روش کے مطابق راہ سے بھٹک گئے اور لہو و لعب میں پڑ گئے تو کچھ تعجب کا مقام نہیں، تعجب تو جب ہوتا اگر وہ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی دامن بچا کر نکل جاتے"، [۴۰]

ہمارے شاعر کا یہ طرّۂ امتیاز ہے کہ اس نے صاف گوئی اور سچائی سے کام لیا ہے، اور اپنی حماقتوں اور اخلاقی کمزوریوں کو نہیں چھپایا، صاف گوئی، طنز و مزاح اور منفرد انداز فکر کے ساتھ ساتھ غالب کے کردار کی قابلِ قدر خصوصیت ہے، وہ ایک سپاہی کی طرح راست گو اور راست کردار ہے، اس نے کبھی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا، اس نے رات کو رات کہا اور دِن کو دن، اور اس نے اپنی اخلاقی لغزشیں اُن ریاکاروں پر بے نقاب کیں جو "تو نیز چنان کہ می نمائی، ہستی؟" کے مصداق تھے، اُس نے نتائج اور سود و زیاں کو قطعاً نظر انداز کر کے اپنے خیالات کا بیباکانہ اظہار کیا،

مرزا حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں غالب نے معاشقوں کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتا ہے :-

---

[۳۹] یادگار غالب صفہ ۱۸ ، [۴۰] ذکر غالب صفہ ۲۱ ،

"بھئی مُغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں، میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی (چودھویں؟) کو میں نے مار رکھا ہے، چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے، با آنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا، اس فن سے بیگانہ محض ہوگیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا،" [الہ]

مندرجہ ذیل اشعار غالب کی صاف گوئی کے آئینہ دار ہیں:۔

آن بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار
بُود آشیانِ من شکنِ طرۂ بہار
آن ساقیم کہ از اثر رشحہ کفم
خمیازہ را بموج گُل اپناشتی خُمار
آن مطربم کہ سازِ نوای خیال من
غیر از کمند جاذبۂ دِل نداشت تار
آن کوکبم کہ در تب و تابِ نوردِ شوق
اوج من از رسیدنِ می یافتی قرار
آن ریشۂ نگاہِ امیدم کہ دم بہ دم
بُود از نمِ طراوتِ دل شوقم آبیار
ہر غنچہ از دمم بفضای شگفتگی
فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ زارِ من بتقاضای دلبری
از غنچہ بود محمل نازی برہگزار

[الہ] مہیش پرشاد صفہ ۳۱۵،

ہم سینہ از بلای جفا پیشہ دلبران
فرہنگِ کاردانیٔ بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادای مغان شیوہ شاہدان
فہرست روزنامۂ اندوہِ انتظار
پیمانہ را بہ نرخ چمن دادمی بہار
آئینہ را بموجِ شفق بستمی نگار
شوقم جریدہِ رقمِ آرزوئی بوس
ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار
فکرم بجیب شاہدِ اندیشہ گلفشان
کلکم بطرفِ گلشن نظارہ لالہ زار
وقت مرا روانیٔ کوثر در آستین
بزمِ مرا طراوتِ فردوس درکنار
ہموارہ ذوقِ مستی ولہو و سُرور و سُور
پیوستہ شعروشاہد و شمع و می و قمار
باکیسہ در خصومت و باکاسہ در لجاج
رندانِ پاکباز دشگرفانِ شادخوار
بد مستیٔ شبینہ و خواب سحرگہی
رنگینیٔ سفینہ و اشعار آبدار

یہ اشعار غالبؔ کے عاشقانہ اطوار، آتش فشاں جذبات اور لااُبالی شباب کی مقیاس الحرارت ہے،

۱۳- قرض کی عادت

غالبؔ کی بے اعتدالیوں نے اس کو قرض پر مجبور کردیا، نانا کی وفات اور اُس کی جائداد کی فروخت کے بعد غالبؔ کو اپنا کفیل آپ بننا پڑا۔ میکشی کا جنون،

شاہزادوں کا سا طرزِ زندگی، اور ایک بگڑے ہوئے بے بضاعت نواب کے سے طریقے ساری زندگی جاری رہے، حقیقت میں غالب کبھی مرفہ الحال نہ ہو سکا، گھٹنوں گھٹنوں قرض میں ڈوبا رہا، حتیٰ کہ مرتے وقت یہ دہلی کا امیر آٹھ سو روپیہ کا قرضدار تھا۔

حسبِ معمول، قرض کو بھی غالب نے خفیہ نہیں رکھا، نواب علاؤ الدین احمد علائی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔

"صاحب، وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، اِدھر خوب چند سکھ چین کی کوٹھی جا لوٹی......
ہر ایک کے پاس تمسّک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سُود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سَر، باایں ہمہ کبھی خان (نواب احمد بخش خان) نے دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیجدیا، اب، میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سَو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے، مُول میں قسط اس کو دینی پڑی، انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سُود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گذارہ مشکل ہو گیا، روزمرہ کا کام بند ہونے لگا۔" [۴۲]

کلکتہ سے واپسی کے بعد غالب نانِ شبینہ کو محتاج تھا اس نے قرض پر قرض اس امید پر لیا تھا کہ مقدمۂ پینشن میں کامیابی ہوگی اور قرض ادا ہو جائے گا، بدقسمتی سے وہ مقدمہ ہار گیا جس کے نتیجہ میں وہ قرض خواہوں کے نرغے میں آگیا، ۱۸۳۵ء میں چار ڈگریاں عدالت نے اُس کے خلاف جاری کیں، بنا برایں چار ماہ تک گھر میں

---

[۴۲] مہیش پرشاد صفہ ۳۴۴،

مقیّد رہنا پڑا۔

غدر کے دوران غالب کی پینشن مئی ۱۸۵۷ء سے مئی ۱۸۶۰ء تک تین سال بند رہی، اس زمانہ میں اُس نے محض قرض پر گذارہ کیا، اور جب ۱۸۶۰ء، ۶۱ میں اس کو دو ہزار دو سو پچاس روپے ملے، تو قرض ادا کرنے کے بعد صرف ستاسی روپیہ اس کے پاس رہ گئے تھے۔[۴۳]

قرض کی بلا کا نقطۂ عروج وہ وقت ہے جب قرضداروں کی قدغن سے گھبرا کر غالب رو پڑا، اس کی شہادت میں غالب کا خط بنام قربان علی بیگ سالک پیش کیا جاتا ہے:

"اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصوّر کیا ہے، جو دُکھ پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک جُوتی اور لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں شاعر فارسی دان ہوں، آج دُور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا کہ بادشاہوں کو بعد اُن کے 'جنت آرامگاہ' اور 'عرش نشیمن' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہِ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر، اور ہاویہ زاویہ، خطاب تجویز کر رکھا ہے، آیئے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان پر ہاتھ، ایک قرضدار کو بھوک ستا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں 'اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے؟ او خانصاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بیحیا بے عزت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزّاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام قرض لئے جاتا ہے'

۴۳؎ ایضاً صفہ ۳۲۲

یہ بھی سونچا ہوتا کہاں سے دُونگا"!۴۴ے

ملاحظہ فرمائی آپ نے احساس کی گہرائی، تلخی، کاٹ اور پشیمانی؟ یہ کرب نہ سرسری ہے اور نہ ہی معمولی، یہ سلوک ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو بقدر وسعت پاؤں نہیں پھیلاتے، یہاں ہمیں مُکافات عمل پر ایمان لانا پڑتا ہے، قرض انسان کے لئے بدترین لعنت ہے۔ یہ ایسا ناسُور ہے جسے کوئی جرّاح مندمل نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ ہر مرد مسلمان کو اِس آزار سے محفوظ رکھے، آمین،

مولینا غلام رسول مہر اپنی تصنیف "غالب" میں لکھتے ہیں کہ ایک بار ایک قرضدار نے مرزا کو عدالت میں کھینچ لیا تھا، عدالت کے صدر الصدور اُس وقت مولانا مفتی صدرالدین آزردہ تھے، مولینا نے مرزا سے پُوچھا کہ اپنی بریت میں کیا کہنا چاہتے ہو، تو مرزا نے جواب دیا کہ آج سے تیس سال قبل لسان الغیب نے فرمایا تھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے، اُنہوں نے مقدمہ کا فیصلہ مرزا کے خلاف کیا، مگر قرض کی رقم اپنی جیب سے ادا کی، ۴۵ے

۱۴۔ ازدواجی زندگی

غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی، اُس زمانے کی عجیب رسم ورواج کے بموجب یا غالب کی بے راہروی کے باعث، تیرہ سال کی عمر میں اُس کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، اُس کی شادی نواب احمد بخش خاں کے بڑے بھائی نواب الٰہی بخش خان المتخلص بہ معروف کی سب سے چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے، ۷ رجب ۱۲۲۵ھ بمطابق ۸ اگست ۱۸۱۰ء میں ہوئی، اِس کم سنی میں شادی کا واحد مقصد یہ تھا کہ غالب پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر اُس کو

۴۴ے اردوئے معلیٰ صفہ ۲۶۴-۲۶۵، ۴۵ے غالب صفہ ۲۸۴

زہرناک ماحول سے جُدا کیا جائے، لیکن بدقسمتی سے غالبؔ پر اِس کا اُلٹا اثر ہوا، وہ اس پابندی کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، تنفّر کی یہ فضا تمام عمر قائم رہی، فریقین مزاج کے اعتبار سے ایک دُوسرے کی ضد تھے، اگر بیگم غالبؔ نسوانی صفات کا پیکر تھیں تو مرزا غالب بے التفاتی اور غیر ذمہ داری کا مجسّمہ تھا یہ شادی مرزا پر جبر کے مترادف تھا، بیوی اپنے شوہر کی بے اعتدالیوں سے نفرت کرتی تھی، حتّٰی کہ اس پابندِ صوم وصلوٰۃ خاتون کو اپنے ظروف بھی الگ کرنا پڑے، حقیقت یہ ہے کہ اس شادی نے غالبؔ پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

غالبؔ اپنی شادی کو ہتھکڑی اور بیڑی، دائمی جبر، طوق اور قیدِ حیات سمجھتا تھا، وہ آزادی کے لئے بے چین اور بے قرار تھا، مگر افسوس کہ اس کو آزادی نہیں نصیب ہوئی، اکثر وہ گھر کی زہر آلود فضا سے فرار ہو کر دور کہیں روپوش ہو جانا چاہتا تھا، کبھی زنجیر توڑنے کا خیال کرتا اور کبھی جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جانے کی تمنّا کرتا، لیکن ہر بار نئے مراحل و مسائل سدِراہ ہوتے تھے، پُرسکون گھرانہ خدا کی خوشنودی کا مظہر ہوتا ہے، آیئے دیکھیں کہ غالبؔ کیا کہتا ہے۔

(۱) علائیؔ کو لکھا ہے :

"تیرہ برس حوالات میں رہا، ۷، رجب کو میرے واسطے حکمِ حبسِ دوام، صادر ہوا، ایک بیڑی، میرے پاؤں میں ڈال دی، اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا، اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا، فکرِ نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا، برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا (اشارہ بہ سفرِ کلکتہ) تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا، مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں، اور پہنا دیں (اشارہ بہ پسرانِ زین العابدین عارفؔ) پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار" [۴۶]

---

[۴۶] مہیش پرشاد صفہ ۳۲۷،

(۲) غالب شادی پر موت کو ترجیح دیتا تھا، ۱۸۶۱ء میں بھی جب میر مہدی مجروح نے دلی کے ہیضہ کی تفصیل پوچھی تو غالب نے جواب دیا۔

"وہ وبا کہاں تھی جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ سال کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے کوئی بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی، تف برین وبا" [۴۷]

(۳) ۱۸۵۸ء میں تفتہ نے اپنے اور مرزا کے مشترک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کی وفات کے بارے میں اطلاع کی، تو مرزا نے اس پر رشک کا اظہار اپنے مکتوب میں یوں کیا ہے:۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اور اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے، اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے" [۴۸]

(۴) فطری طور پر غالب شادی کی پابندیوں کے خلاف تھا، حکیم غلاف نجف خاں کے نام لکھا ہے۔

"میرا دُکھ سنو، ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے، ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے، تاہل میری موت ہے، میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا، اس کا کیا رونا ہے، یہ قید جاودانی ہے"۔ [۴۹]

(۵) مرزا حاتم علی مہر کی بیوی چُنا جان کی وفات پر مرزا غالب ناصحانہ انداز میں

---

[۴۷] ایضاً صفحہ ۲۷۴، [۴۸] مہیش پرشاد صفحہ ۶۰

[۴۹] ایضاً صفحہ ۲۲۰ - ۲۲۱،

تعزیت کا انوکھا انداز ایجاد کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بُو کی سیر کی ہے، ابتدائے شباب میں مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہدؔ و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، کھاؤ، پیو، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے، کسی کے مرنے کا غم وُہ کرے جو آپ نہ مرے ..... آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنا جان نہ سہی، مُنا جان سہی"۔ [۵۰]

(۶) مرزا شادی سے نالاں تھا اور فرار ہونا چاہتا تھا، علائی کو لکھا:-

"خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں۔ مجھ سے لے لو کہ اب میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا ...... میرا قصد سیاحت کا ہے"۔ [۵۱]

(۷) شادی کے بارے میں مندرجہ ذیل قطعات و رباعیات غالب کی ذہنی کیفیات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

قطعہ

گیر کہ در روز حشر چون تو بیفتی
بر سرِ دوزخ نہند تیرہ نہنبن
دان کہ نبا شد دراں مضیقِ مصیبت
در طلبِ نان و جامہ کشمکشِ زن

ایضاً

بہ آدم زن، بہ شیطان طوق لعنت
سپردند از رہِ تکریم و تذلیل

---

[۵۰] ایضاً صفحہ ۳۱۶ ، [۵۱] ایضاً صفحہ ۳۲۱

دلیکن در اسیری طوقِ آدم
گران تر آمد از طوقِ عزازیل

رباعی

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہان خانہ و زن نیست درو — نازم بہ خدا چرا توانا نبود

ایضاً

از آنجا کہ دلم بو ہم در بند نبود — با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر — خود ترک دیار و زن فرزند بود

ای آنکہ براہِ کعبہ رُوی داری — نازم کہ گزیدہ آرزوی داری
زینگونہ کہ تند میخرامی، دانم — در خانہ زن ستیزہ خوی داری

آخر میں شادی کے معاملہ میں غالب کا بڑے سے بڑا مداح بھی اس سے متفق نہیں ہو سکتا، کیونکہ عورت کے بغیر زندگی تاریک ہے، عورت بدی کے خلاف دیوار ہے، عورت ہدایت کا فرشتہ ہے، عورت محبت کا سرچشمہ ہے، حضرت مولینا جلال الدین رُومی نے عورت کو اس کا اصل مقام دیا ہے ؎

پرتوِ حق است و آن معشوق نیست
خالق است آن گوئیا مخلوق نیست

غالب کی اپنی بیوی کے بارے میں خصوصاً اور عورت کے بارے میں عموماً متعصبانہ اور سفاکانہ روش خود اس کی نام آوری پر ایک بدنما داغ ہے، بعض لوگ اس باب میں غالب کی بیجا موافقت کرتے ہیں، اگر غالب راہ راست پر چلتا، اور بیوی کو بیوی سمجھتا اور ازدواجی زندگی کو حبس دوام، گرفتاری، پھانسی کا پھندا اور قیدِ جاودانی نہ سمجھتا تو اس کی ساری پریشانیاں یکسر دور ہو جاتیں،

۱۵۔ اولاد

اس بے جوڑ ملاپ کے باوجود غالبؔ کے ہاں سات لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں، مگر کوئی بچہ پندرہ ماہ سے زیادہ نہ جی سکا، میاں داد خاں سیاحؔ کو لکھا:۔

"تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہونا اور اُس کا مرجانا معلوم ہوکر مجھ کو بڑا غم ہوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پُوچھو کہ چوہتّر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔" [۵۲]

اولاد پیاری ہوتی ہے، بچوں کے غم میں نواب امین الدین احمد خاں کو لکھا:۔

"آج تم دونو بھائی (دوسرا بھائی ضیاء الدین احمد خاں) اِس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، میں ولم یلِد ولم یُولد ہوں۔" [۵۳]

نا اُمید ہوکر نواب زین العابدین عارفؔ کو مرزا صاحب نے اپنا متبنّیٰ کیا اور اُس کی ناگہانی جوانا مرگی پر اُس کے لڑکوں کو زیرِ کفالت لیا،

---

[۵۲] اردوئے معلّیٰ صفہ ۱۲، [۵۳] ایضاً صفہ ۳۱۶

فصلِ سوم

دھلی

(از ۱۸۱۳ء تا ۱۸۶۹ء)

دم از ریاست دہلی نمی زنم غالب
منم ز خاک نشینانِ ایں دیاریکی

۱۔ تاریخ ہجرت

غالب کے دہلی مستقل طور پر ہجرت کرنے کی کوئی صحیح تاریخ نہیں ملتی حالی اُس کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد کا جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دہلی میں مقیم رہا،" ؎

مُلّا عبدالصمد سے غالب کی ملاقات ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ میں ہوئی تھی، اور اُس نے غالب کے ساتھ دو سال آگرہ اور دہلی میں گذارے لہٰذا قیاس ہے کہ اس وقفہ کا کم از کم آخری چوتھائی دہلی میں گذرا ہوگا، اس کے مطابق غالب نے دہلی کو ہجرت ۱۸۱۲ء کے

؎ یادگار صفحہ ۱۴،

لگ بھگ کی ہوگی،

مالک رام کا خیال ہے کہ غالب نے شادی کے دو سال بعد دہلی کا رخ کیا،[۲]

علائی کے نام ایک مراسلہ مورخہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء میں غالب نے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کہتا ہے،

"اے میری جان، یہ وہ دِلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے تھے، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دِلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دِلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کمپ ہے"[۳]

اس اقتباس سے دو نتائج اخذ ہوتے ہیں، اولاً یہ کہ غالب نے دہلی سات سال کی عمر سے آنا جانا شروع کیا، دوم یہ کہ ۱۸۶۲ء میں غالب کے دہلی میں مستقل قیام کو اکیاون برس ہو گئے تھے، اب یہ ظاہر ہے کہ غالب نے دہلی میں ۱۸۱۳ء میں سکونت اختیار کی ہوگی،

اپنے استاد میر اعظم علی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"درازئ زمانِ فراق کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال است و بہ دانستِ نامہ نگار کم از بست سال نیست سر تیز لکی بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفحۂ خاطر بدان سترده اند........ چون گورنر جنرل آهنگِ هندوستان کرد، پیشا پیش دویدم و بہ دہلی رسیدم روزگار برگشت و کارِ ساختہ شدہ صورتِ تباہی گرفت، اکنون ششمین سال است کہ خانمان بباد دادہ، و دل برمرگِ ناگاه نهادہ بکنجی نشستہ ام"[۴]

جیسا کہ آگے معلوم ہوگا غالب کلکتہ سے نومبر ۱۸۲۹ء میں واپس آیا، اور یہ خط

---

[۲] ذکر غالب صفحہ ۱۹، [۳] مہیش پرشاد صفحہ ۳۶ - ۳۳۵، کلیات نثر صفحہ ۱۰۳،

واپسی کے چھ سال بعد یعنی ۱۸۳۵ء میں لکھا، اس اقتباس میں زمانۂ فراق بیس سال بتایا ہے، اس کے مطابق سالِ ہجرت ۱۸۱۵ء متعین ہوتا ہے،

ان متضاد قیاسات کی بنا پر ہم اس نتیجہ کو پہنچتے ہیں کہ غالب ۱۸۱۳ء میں آگرے میں تھا، اور اسی سال کے کسی مہینے میں اُس نے دہلی ہجرت کی۔

۲۔ مکان

کہتے ہیں کہ دہلی میں غالب کا ذاتی مکان نہیں تھا، ہمیشہ کرائے کے مکان میں بسر کی، جس مکان میں براہِ راست قیام کیا وہ شعبان خاں کی حویلی کے نام سے مشہور تھا، یہ معلوم نہیں کہ یہ مکان انہوں نے کب اور کیوں چھوڑا، بہر حال یہاں سے اُٹھ کر شیخ نصیر الدین عرف میاں کالے کے مکان میں سکونت اختیار کی، میاں کالے کے والد کا نام شیخ قطب الدین تھا اور دادا کا نام فخر الدین فخر عالم، اور زمانہ کا مشہور اہل اللہ میں سے تھا، اور چشتیہ خاندان سے متعلق تھا، بادشاہِ وقت سراج الدین بہادر شاہ ظفر ان کو مرشد مانتے تھے، غالب کو بھی ان سے قرب حاصل تھا، بلکہ ان کی اور حکیم احسن اللہ خاں پٹیالوی کی وساطت سے دربار میں کرسی پائی تھی، میاں کالے ہمارے شاعر کی بڑی عزت کیا کرتے تھے اور اپنا مکان بلا کرایہ ان کے حوالے کر دیا تھا، غالب اس مکان میں کافی مدت تک رہے، ۱۸۴۷ء میں قید سے رہائی کے بعد یہ مکان اُنکے قبضہ میں تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ مکان ۱۸۵۲ء میں اُنہوں نے چھوڑا اور دہلی کے محلّہ بلیماران میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں تفتہ کو لکھا:۔

"میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں، بلیماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں، وہاں کا میرا رہنا تخفیفِ کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا،" ؎۶

؎۵ مہیش پرشاد صفہ ۸ ، ؎۶ یادگار صفہ ۳۰ ،

جب ۱۸۶۰ء میں یہ مکان فروخت ہوکر غلام اللہ خاں کے نام پر منتقل ہوا تو غالب نے اُسی محلہ میں چار روپیہ ماہوار پر کوئی دُوسرا مکان لے لیا، چنانچہ مؤرخہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۰ء کو تفتہ کو لکھا ہے:

"دس گیارہ برس سے اِس تنگنا میں رہتا تھا، سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپے کرایہ دیا گیا، اب تین برس کا کرایہ کچھ اُوپر سَتّو یکمشت دیا گیا۔ (کیونکہ غالب کی ماہانہ پینشن مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر مئی ۱۸۶۰ء تک رُک گئی تھی)...... دوشنبہ ۹ جولائی ۱۸۶۰ء دوپہر کے وقت (یہ مکان) ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا...... محلہ وہی بلیماروں کا"، ؎

سب سے آخر میں غالب ایک مسجد کے قریب جا کر سکونت پذیر ہُوا، یہ مکان حکیم محمود خان کے مہمان خانے کے قریب واقع تھا، اس کا کرایہ ساڑھے پانچ روپے ماہوار تھا، ؎ غالب کا انتقال اسی مکان میں ہوا، چند سال بیشتر یہ مکان ہندوستانی دواخانہ دہلی کا ایک حصہ تھا، حکومت ہندوستان نے ازراہِ ادب نوازی اس مکان کو اپنی تحویل میں لے کر اس میں غالب میموریل میوزیم قائم کیا۔

دہلی میں چوّن سال کے قیام کے دوران غالب نے کُل پانچ مختلف مکانوں میں رہائش اختیار کی تھی، بقولِ حالی:

"دہلی میں اُن کے قیام کا زمانہ پچاس برس کا معلوم ہوتا ہے (یہ غلط ہے کیونکہ غالب نے دہلی میں ۱۸۱۳ء میں ہجرت کی تھی) اس تمام مدت میں انہوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا، ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہا کئے، یا ایک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے، جب ایک مکان سے جی اُکتایا، اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خان کے پھاٹک یا اُس کے

؎ ایضاً صفہ ۷۶، ؎ غالب صفہ ۸۷،

قرب و جوار کے سوا اور ضلع میں جا کر نہیں رہے، سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں :-

مسجد کے زیرِ سایہ اِک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے'' ۹

۳- غالب کا پتہ

غالب نے اپنی قابلیت اور خاندان لوہارو سے تعلق کی بنا پر آگرے سے آتے ہی بہت جلد دہلی میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی اور اس کا شمار دلی کی سوسائٹی کے سربرآوردہ افراد میں ہونے لگا، حالانکہ چون سال کے قیام کے دوران غالب نے نصف درجن مکانات بدلے اور اپنے مکتوب الیہم کو پتہ کی تبدیلی سے وقتاً فوقتاً باخبر بھی کیا، لیکن وہ فخر و مباہات کے ساتھ اپنا پتہ پورا لکھنے میں عار سمجھتا تھا چنانچہ سید غلام حسنین بلگرامی کے نام ایک مراسلہ مورخہ ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے :-

"یہ کیا لکھا کرتے ہیں، شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے .... ہندوستان میں دلی کو سب جانتے ہیں اور دلی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں،، ۱۰

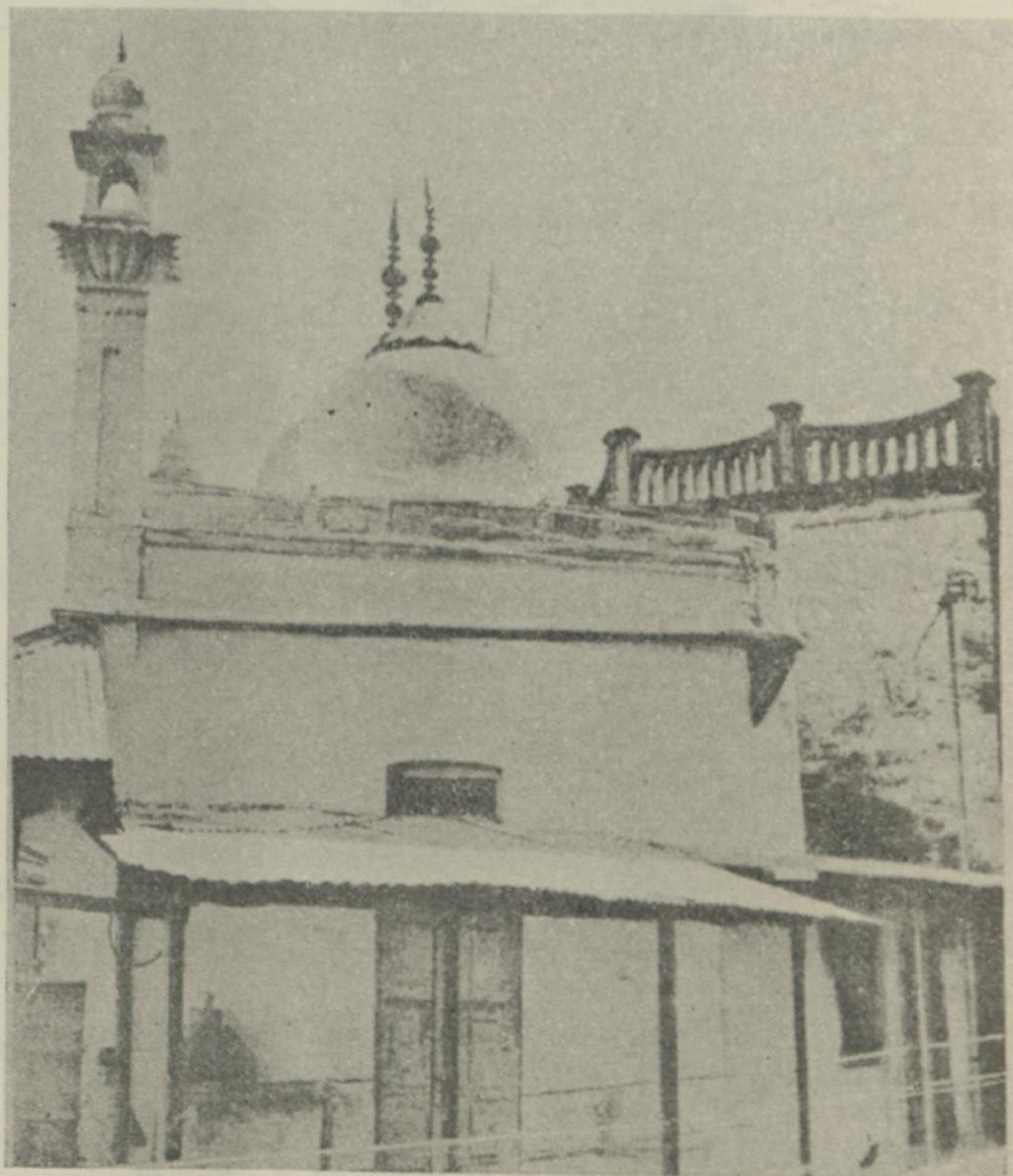
۱۸۵۹ء میں تفتہ کو تلقین کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضروری نہیں، میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی و انگریزی میں جو خط میرے نام آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے، بعض فارسی خط پر پتہ محلے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتہ ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے،، ۱۱

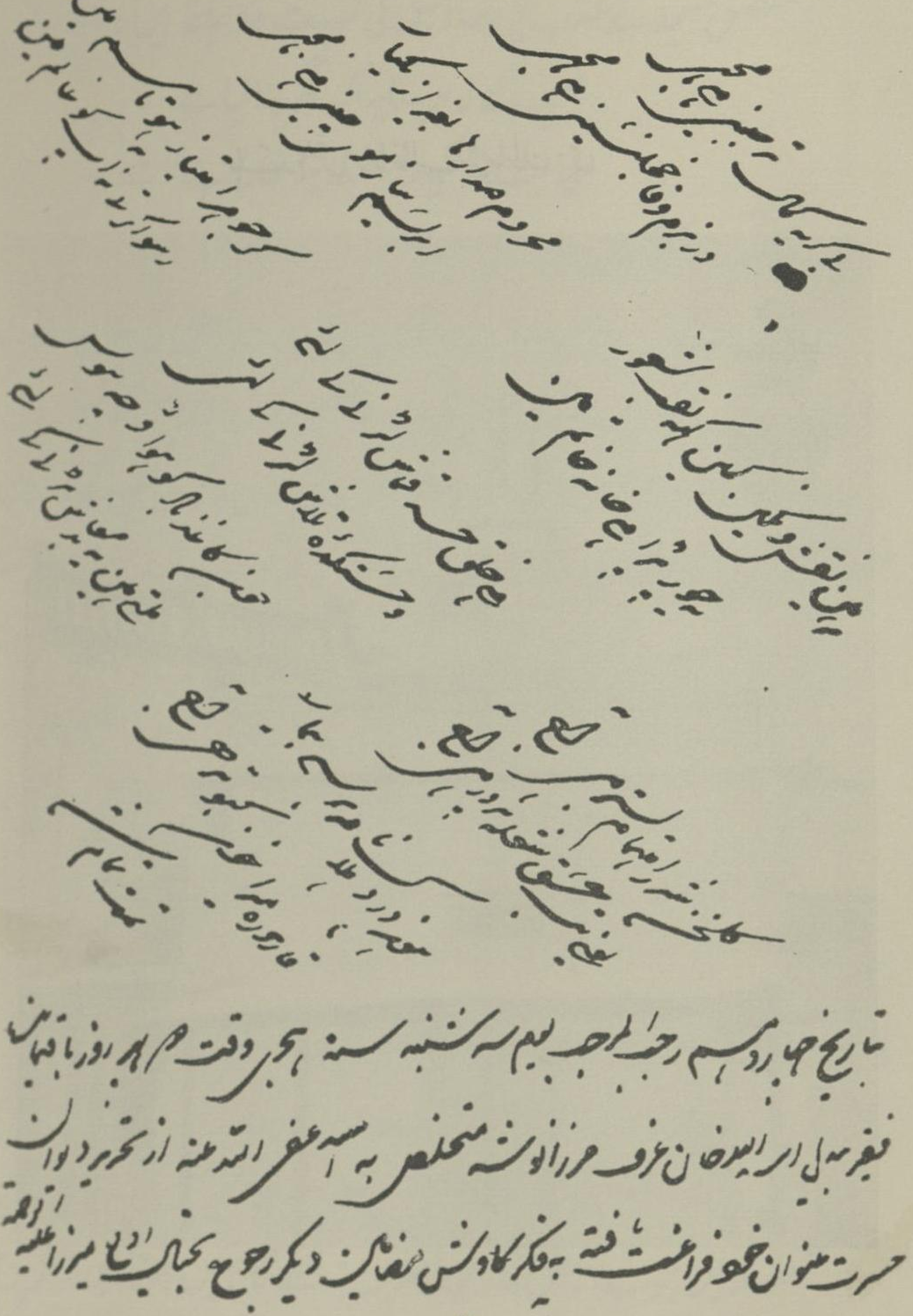
---

۹ یادگار غالب صفحہ ۱۸ ، ۱۰ مہیش پرشاد صفحہ ۱۸۲-۱۸۳،
۱۱ ایضاً صفحہ ۶۳-۶۴ ؛

جائے رہائش مرزا غالب، بلیماران دہلی



مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے



بیاضِ غالب کا آخری صفحہ

اسی طرح ۱۴ اپریل ۱۸۶۱ء کو علائی کے نام لکھا:۔

"پچاس برس سے دہلی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، آپ صرف دہلی کا نام لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔"[۲]

۴۔ نظریات کی تبدیلی

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ غالب دہلی اس وقت آیا جب ہندوستانی سیاست کی بساط سے مغل سلطنت تیزی سے رخصت ہو رہی تھی اور اس کے ستون و بام غیر قوم کی ضربوں سے لرز رہے تھے، اندرونی خلفشار بھی زوروں پر تھا، مرہٹوں نے اسے اور زیادہ کمزور کر دیا تھا، بادشاہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

خوش قسمتی سے ادبی لحاظ سے یہ بیداری کا دَور تھا۔ اردو منظر عام پر آچکی تھی، پُرانا دَور نئے دور کے لئے جگہ چھوڑ رہا تھا۔ فارسی اردو سے شکست کھا چکی تھی، دہلی علم کا گہوارہ تھا، اور علماء، شعراء، فلاسفہ، اطبا، ماہرین نجوم اور اولیائے کرام کا ملجا و ماویٰ تھا، بالفاظ دیگر دہلی ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ تھا، ہندوستانی طرزِ فکر کروٹ لے رہا تھا، غرض یہ کہ تاریخ کے کسی اور دور میں دہلی کو یہ مقام کبھی نہیں نصیب ہوا تھا، نئے حسن اور نئے مرغزاروں کی تلاش کا دور تھا، علمی ارتقا اور نئی مہمات کا عہد،

اس وقت دہلی میں ہر طبقۂ خیال کے علما اور فضلا موجود تھے، ان میں سے چند کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

نواب احمد بخش خاں بنگش لوہارو، ان کے بھائی اور غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، جناب جی۔ اے مدنی صاحب کے

۲۔ ایضاً صفحہ ۳۲۴،

جدِّ امجد) زُمرۂ رؤسا میں، حکیم محمود خاں، حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم رضا خاں، اطبّا میں، شیخ نصیر الدین (میاں کالے)، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل شہید، مولوی فضلِ حق خیر آبادی اور مولینا مفتی صدر الدین آزردہ علماء اور صوفیا میں، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن، امام بخش صہبائی، رجب علی بیگ سرور اور مرزا اسد اللہ بیگ خاں غالب شعرا اور مصنفین میں اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے، چنانچہ حالی لکھتے ہیں:

”حسنِ اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال، ایسے جمع ہو گئے تھے، جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں،

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شان مشکفشان از دم شان

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دِلّی جانا ہوا اُس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، لوگ دِلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اور جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کو ہمیشہ فخر رہیگا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دِلّی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے، وہ سانچہ بدل گیا، اور جس ہوا میں اُنہوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی،“ ۱۳؎

حالی کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی، کیونکہ دہلی اس عظمت سے دوبارہ آشنا نہ ہو سکا، اگرچہ ۱۹۱۱ء سے دار الحکومت کا درجہ رکھتا ہے، قیام

۱۳؎ یادگار صفا

پاکستان کے بعد اس کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہوگئی، نہ وہ باغ رہا اور نہ ہی وہ باغبان،

لہٰذا اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ غالب نے اپنے گذشتہ اطوار بدل ڈالے اور وہ اس دور کی ادبی اور سماجی رُوح سے ہم آہنگ ہو گیا. یہ امر بھی باعث حیرت واستعجاب نہیں کہ ماضی سے گراں خوابی سے نکل کر وہ گردو پیش کا شعور لئے ہوئے بیدار ہوا، اور یہ بھی باعث تعجب نہیں کہ اس کا کردار بڑی حد تک درست ہو گیا، اعلیٰ تعلقات کی بنا پر اس کو بہترین سوسائیٹی ملی، اسی سوسائیٹی نے اُسے سنجیدہ ومتین بنایا، وہ اپنے خسرِ نامدار کی صحبت صالح سے بھی متأثر ہوا، اور مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولٰینا مولوی مفتی صدالدین آزردہ نے تو اس کی دنیا ہی بدل ڈالی، کیونکہ ان دونوں حضرات نے مرزا غالب کو گمراہی کی عمیق گہرائیوں سے نکال کر سنجیدگی، معقولیت اور نجات کی راہ پر ڈال دیا، چنانچہ اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آغازِ ورود بدہلی کہ دُردِ غفلتی بقدح داشتم، لختی از عمر بپیمودنِ جادہ کامروائی وہوس گزشت، دبی راہ خرامیدہ شد تا از سرمستی بگردید،" [۱۴]

بقولِ ڈاکٹر سید محی الدین زور کے "طرزِ کلام کی تبدیلی کے علاوہ اس شائستہ صحبت نے مرزا کے اخلاق وعادات پر بھی اچھا اثر کیا، اور وہ لہو ولعب اور رندی وبدمستی ایک حد تک کم ہو گئی جو آگرہ سے آتے وقت اُس کی طبیعتِ ثانی بن گئی تھی" [۱۵]

پروفیسر مالک رام کیا عمدہ نقشہ کھینچتے ہیں:

"ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ غالب نے اپنی آزادانہ زندگی

---

[۱۴] کلیاتِ نثر صفہ ۱۰۳، [۱۵] روح غالب صفہ ۱۹

ترک کر دی، اگرچہ وہ اب بھی کبھی "روز ابر، اور شب ماہتاب" میں شراب نوشی تو کر لیتے تھے اور آخر تک کرتے رہے، مگر زندگی کا وہ خود کشانہ ہنجار یک قلم موقوف ہو گیا، ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہو گیا، اس سے پہلے اُن کی مُہر پر کندہ تھا "اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ" اب جو نئی مُہر بنی جو انہوں نے ۱۲۳۸ھ میں کندہ کروائی اس پر کندہ ہے "محمد اسد اللہ خاں" یہ دونوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی"۔ [۱۶]

اس نئے جادو نے مرزا صاحب کو نئی رُوح بخشی، اُس کو نیا انسان بنا دیا، بدکاری نے تقویٰ کو راہ دی، اور بدمستی نے متانت کو،

۵۔ مالی پریشانیوں کا آغاز

دہلی وارد ہونے کے بعد اپنی مالی حالت کی کیفیت غالب نے علائی کے نام ایک خط مرقومہ ۱۸۶۲ء میں بیان کی ہے۔ [۱۷]

غالب کی حقیقی مصیبت کا آغاز اسوقت ہوا جب ۱۸۲۶ء میں نواب احمد بخش خاں بنگش لوہارو برضا و رغبت اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے حق میں ریاست سے دستبردار ہو گئے، چونکہ غالب کی مالی پریشانیاں خاندانِ لوہارو سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے اس ممتاز گھرانے کا مختصر تذکرہ برمحل ہو گا۔

۶۔ خاندانِ لوہارو

نواب احمد بخش خاں بخارا کے خواجہ عبد الرحمٰن کے پوتے اور عارف جان کے بیٹے تھے، خواجہ عبد الرحمٰن کے تین بیٹے تھے، قاسم جان، عارف جان اور عالم جان، تاریخ شاہد ہے کہ یہ تینوں بھائی اور مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خان ہندوستان میں ساتھ ساتھ آئے تھے، قاسم جان سب سے بڑا تھا، اس کی شادی لاہور میں

---

[۱۶] ذکرِ غالب صفہ ۲۶ ، [۱۷] ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۴۲ ۔ صفہ ۶۸

افغانستان کے قبیلۂ[۱۸] ہزارہ کے ایک فردِ فرید نذیر بیگ خان کی لڑکی سے ہوئی، ابتدا میں معین الملک حاکمِ پنجاب کی ملازمت کی، بعد میں دہلی جاکر شاہ عالم[۱۹] ثانی کی ملازمت اختیار کی اور شرف الدولہ سے ملقب ہوا، جب عیارِ اعظم اور غدارِ وطن روہیلہ غلام قادر خاں نے بادشاہ کو نابینا کردیا، تو قاسم جان کا قیام خطرے میں پڑگیا، وہاں سے نکل کر لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا ملازم ہوگیا، وہیں وفات پائی، تین بیٹے یادگار چھوڑے،

عارف جان کے چار بیٹے اور کچھ بیٹیاں تھیں، اس کی ایک لڑکی غالب کے چچا سے بیاہی گئی تھی، صرف دو بیٹوں احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں نے شہرت حاصل کی، باقی دو بیٹوں کے نام نبی بخش خاں اور محمد علی خاں تھے،

الٰہی بخش خاں اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے، ان کا تخلص معروف تھا، صوفی منش آدمی تھے، انہوں نے سیاست اور مشاغل دنیا سے کنارہ کش ہوکر یادِ الٰہی میں زندگی بسر کی،

---

۱۸ یہ بڑا جنگجو قبیلہ ہے، پاکستان کی فوج کے سابق کمانڈر اِن چیف جنرل محمد موسیٰ اس کے قبیلہ کے رُکنِ رکین ہیں، کوئٹہ میں اِس قبیلہ کی ایک علیحدہ بستی ہے۔

۱۹ عالمگیر ثانی کا فرزند تھا، صاحبِ ذوق شاعر تھا اور آفتاب تخلص رکھا تھا، میر حسن اپنے تذکرۂ شعراء میں ان کی مشہور رباعی (دوبیتی) نقل کرتا ہے، رباعی

صبح تو جام سے گزرتی ہے　　شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

اِن کی مشہور مثنوی جو انہوں نے آنکھوں سے محروم ہونے پر لکھی ہے اور جس کا پہلا شعر ذیل میں درج ہے بیحد دردناک ہے اور ملٹن کی نظم : ON HIS BLINDNESS کی یاد تازہ کرتی ہے، پہلا شعر یہ ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئ خوارئ ما
داد بر باد سر و برگ جہاندارئ ما

ان کی دو لڑکیاں تھیں، امراؤ بیگم زوجۂ غالب اور بنیادی بیگم زوجہ نواب غلام حسین خاں مسرور (ابن شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں سہراب جنگ ابن قاسم جان) اُن کے اکلوتے بیٹے مرزا علی بخش رنجور تھے، ۱۸۲۵ء میں رحلت پائی۔

احمد بخش خاں اعلیٰ درجہ کا سپاہی تھا وہ الور میں ملازم تھا، ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک نے الور کے قلعہ پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احمد بخش خاں نے اپنے آقا سے غداری کی، جو کچھ بھی ہوا، مگر لارڈ لیک نے اس کی ممتاز خدمات کے صلے میں فیروز پور جھرکا کی جاگیر عطا کی، یہ علاقہ اب گڑگاؤں مشرقی پنجاب کا حصہ ہے، اس جاگیر کے بعد مہاراجہ بلونت سنگھ والیٔ الور نے پرگنہ لوہارو[۲] دیا، اسی پر خاندان کا نام چلا، مہاراجہ الور نے احمد بخش خان کو دلاور الملک، فخر الدولہ، رستم جنگ کا خطاب بھی عنایت فرمایا۔

کئی داشتاؤں اور کنیزوں کے علاوہ احمد بخش خاں کی دو بیویاں بھی تھیں، مُدی بیگم جو بہو خانم کی عرفیت سے مشہور تھی، کسی ہلکے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اور اردو کے مشہور شاعر داغ کے والد نواب شمس الدین احمد کی ماں تھی، ان کی دوسری بیوی بیگم جان، والدۂ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں بنگش خاندان کی چشم و چراغ تھی،

۱۸۲۷ء میں حکومت برطانیہ اور مہاراجہ الور کی مشترکہ رضامندی سے نواب احمد بخش خاں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو وارث قرار دیا جس نے اپنے والد کے مشورہ پر عارضی طور پر لوہارو کی جاگیر کو اپنے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد میں تقسیم کر دیا، اور فیروز پور جھرکا کی جاگیر کا انتظام خود سنبھالا، نواب احمد بخش نے اکتوبر ۱۸۲۷ء کو وفات پائی۔

نواب شمس الدین احمد خاں کو ۱۸۳۵ء میں پھانسی ہوئی اور اسکی جائداد ضبط کر لی گئی،

---

[۲] لوہارو کا رقبہ ۲۸۵ مربع میل تھا اور بقول مسٹر ایل۔ این گھوس کے ۱۸۷۹ء میں اس کی آبادی بائیس ہزار افراد تھی۔

مگر خاندان لوہارو قائم رہا،

۷۔ پینشن کا قضیہ

نواب احمد بخش خاں کی دستبرداری نے غالب کے لئے گوناگوں مالی مشکلات کا طومار کھڑا کر دیا، فطری طور پر خاندان کے دیگر افراد شمس الدین احمد کو غاصب سمجھتے تھے، چونکہ غالب کی شادی نواب کے والد کی بھتیجی سے ہوئی تھی، اور فیروز پور جھرکا جس کی آمدنی سے غالب کو ماہانہ پینشن ملتی تھی، نواب شمس الدین کے قبضہ میں آگیا تھا، اس لئے اس نے اُن تمام اہلِ خاندان کو پریشان کرنا شروع کر دیا جو اس کے خلاف تھے، بنابریں اُس نے ہمارے شاعر کے خلاف چالبازیوں کا ایک کھیل شروع کر دیا، اور رقوم کی ماہانہ ادائیگی میں جان بُوجھ کر دیر کرنا شروع کر دی، لہٰذا غالب مقروض ہو کر مصائب میں گھرتا گیا، چند دوستوں کے مشورہ پر معاملہ کا تصفیہ کرنے کے لئے فیروز پور جھرکا کا سفر بھی اختیار کیا، مگر شمس الدین نے بلطائف الحیل ٹال دیا، [۲۱]

نصر اللہ بیگ خاں کو اپنی خدمات کے صلے میں ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک نے سونک اور سونسا کے پرگنے دیئے تھے، اُسی سال عمِ غالب کی وفات پر لارڈ لیک نے ان پرگنوں کو نواب احمد بخش خان کی ریاست میں ضم کر دیا اور مرحوم کے وارثین کے لئے ان کی آمدنی ہی میں دس ہزار روپے سالانہ مقرر کر دیئے تھے۔ اس دستاویز پر لارڈ لیک نے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو دستخط ثبت کئے، نواب صاحب نے خفیہ طور پر لارڈ لیک سے ایک دوسری دستاویز حاصل کر لی، جس کی رو سے رقم نصف رہ گئی اور تقسیم اِس طور پر قرار پائی:۔

(۱) خواجہ حاجی رسالدار [۲۲] دو ہزار روپیہ

---

[۲۱] سر امیر الدین احمد خاں کے حوالہ سے مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "غالب" کے صفحہ ۹۵ اور صفحہ ۱۵۱ پر انکشاف کیا ہے کہ شمس الدین نے کلیتاً پینشن موقوف کر دی تھی۔

[۲۲] یہ شخص غالب کا دُوری رشتہ دار تھا۔ اس کا بیٹا اکبر خاں غالب کی بہن چھوٹی خانم کا شوہر تھا، اِس طرح اُس کو پینشن پانے کا کوئی حق نہ تھا۔

(۲) نصر اللہ بیگ کی والدہ اور ہمشیرگان ڈیڑھ ہزار روپیہ

(۳) مرزا اسد اللہ بیگ خاں ساڑھے سات سو روپیہ

(۴) مرزا یوسف بیگ خاں

اس دستاویز پر لارڈ لیک نے ۷ جون ۱۸۰۶ء کو دستخط کئے، یہ فارسی زبان میں تھی اور پہلی دستاویز انگریزی میں تھی۔

غالب کو سنِ شعور کو پہنچتے ہی اس ناانصافی کا علم ہوا، دراصل وہ نواب احمد بخش کے خلاف دعویٰ کرنا چاہتا تھا، مگر نواب صاحب کی شفقتوں کے مدِّنظر وہ اس اقدام سے باز رہا، قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے شاعر کو دوسری دستاویز کے بارے میں کوئی علم ہی نہ تھا، سسر کی موجودگی نے بھی غالب کو کسی غلط اقدام سے باز رکھا، غالب کے سسر کی وفات کے فوراً بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے اس کے خلاف کھل کر مخالفت شروع کردی، اب اس کے پاس قانونی چارہ جوئی کے سوا کوئی صورت نہ رہی، غالب کا دعویٰ یہ تھا کہ اصل رقم واگذار کی جائے، خواجہ حاجی کا نام وارثین کی فہرست سے خارج کیا جائے، اور غالب کو ۱۸۰۶ء سے لے کر ۱۸۲۶ء کے زمانے کی دو لاکھ کی رقم یکمشت اور فی الفور ادا کی جائے۔ چونکہ اس زمانے میں کلکتہ دارالحکومت تھا، اس لئے غالب چارہ جوئی کے لئے وہاں پہنچا لکھا ہے:۔

تا نباشد المی، ترک وطن نتوان کرد
مشکلی در نظرِ آوردم و آسان رفتم
چہرہ اندودہ بہ گردِ دمژہ آغشتہ بخون
خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنوان رفتم
اضطرار آئینہ پروازِ جلای وطن است
نہ بہ دل رفتم از آن بُقعہ بل از جان رفتم
ہم جگر تفتہ بہ کین خواہئ اغیار شدم
ہم دل از آزردہ بی مہرئ خویشان رفتم

فصلِ چہارم

سفرِ کلکتہ

سفر کے بارے میں غالب کے خیالات عجیب ہیں اور اس ضمن میں بالکل متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے، چنانچہ ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکا سے رائے چھجمل کو لکھا:۔

"جلای وطن وعزم سفر و آرام غربت مصیبتی است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد....... ہرچہ دیدہ می شود آشوب چشم است، و ہرچہ شنودہ می شود، زحمتِ گوش است"، [1]

۱۸۵۶ء میں منشی میاں داد سیّاح کو لکھا:۔

اور میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگذشت لکھی ہے، اسی طرح آیندہ بھی لکھتے رہوگے، میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں ؎

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد
زہی روانیٔ عمری کہ در سفر گذرد

خیر، اگر سیر و سیاحت میسر نہیں تو نہ سہی، 'ذکر العیش، نصف العیش'، پر قناعت کی، میاں داد خاں سیّاح کی سرگذشت سیر و سفر ہی سہی"۔[2]

اِن متضاد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کئی مجبوریوں کے تحت دور و دراز

---

[1] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۵۵، [2] اردوئے معلّٰی صفحہ ۷

ملکوں اور شہروں کا سفر اختیار کرنے پر آمادہ تھا، کلکتہ کے سفر نے تین قیمتی سال ضائع کئے، یہ محض چند مجبوریوں کی وجہ سے وہ دہلی سے باہر نکلا، عزیزوں کی ریشہ دوانیوں سے نالاں ہو کر اس نے یہ سفر اختیار کیا، لکھتا ہے ؎

گر دہم شرح ستم ہای عزیزان غالبؔ
رسمِ اُمید ہمانا زجہان برخیزد

اگر مالی حالت اجازت دیتی تو غالبؔ ضرور ملحقہ ممالک کا بھی دورہ کرتا، اُس کو بہت سے مدّاحوں اور دوستوں کے دعوت نامے موصول ہوئے، مگر وہ اُن کو کسی حیلے بہانے سے ٹال دیتا، صرف پانچ بار اُس کو دہلی سے مجبوراً باہر جانا پڑا، دوبار رامپور کا سفر اختیار کیا، ایک بار فیروز پور جھرکا گیا، ایک بار ۱۸۵۸ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مزاج پُرسی اور تہنیت کے لئے میرٹھ گیا اور پھر عمر کا سب سے طویل سفر کلکتہ پر روانہ ہوا،

دہلی سے رخصت ہونے کی صحیح تاریخ نا معلوم ہے، ۱۸۶۷ء میں منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا:۔

"۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا، نواب گورنر جنرل بہادر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم کا خلعت ملا، ازاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا مجھ کو یہ خلعت ملتا رہا۔"[۳]

واپسی پر خواجہ غلام غوث کو لکھا:۔

"حضرت، وہ شعر بنگالی زبان کا لو، ۱۸۲۹ء میں ضیافتِ طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں، صحیح یوں ہے:۔

تم کہے تھے رات میں آئیں گے، سو، آئے نہیں
قبلہ، بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں"[۴]

---

[۳] عودِ ہندی صفحہ ۱۲۲، [۴] ایضاً صفحہ ۱۲۲،

ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ذکا کو خط لکھتے ہوئے اصل سنہ بھول گیا کیونکہ غلام غوث کے نام خط میں کلکتے سے واپسی ۱۸۲۹ء بیان کی گئی ہے،

اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ غالب دہلی سے اگست ۱۸۲۶ء مطابق ۱۲۴۲ھ کی کسی تاریخ کو روانہ ہوا، کیونکہ وہ دہلی سے براہِ راست لکھنؤ پہنچا تھا اور وہاں وزیر سلطنت آغا میر کی شان میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش ہوئی تھی، اس کے بجائے غالب نے ایک نظم منثور صنعتِ تعطیل میں لکھی، جس کے آخر میں تاریخ درج ہے۔

"اسد اللہ، محرّرہ دوم محرم الحرام" ؎۵

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش کی وفات کے وقت غالب مرشد آباد کے گرد و نواح میں تھا ؎۶، لکھنؤ سے غالب ۲۶ ذیقعدہ کو روانہ ہوکر ۲۹ ذیقعدہ کو کانپور پہنچا تھا، لکھا ہے،

"تاریخ بست و ششم ذیقعدہ روزِ جمعہ از آں ستم آباد (لکھنؤ) برآمدم و بتاریخ بست و نہم در دارالسرور کانپور رسیدم" ؎۷

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ مطابق مئی ۱۸۲۷ء میں غالب کانپور روانہ ہوا، دوسرے الفاظ میں وہ دہلی سے محرم الحرام ۱۲۴۲ھ مطابق اگست ۱۸۲۶ء کے اوائل میں روانہ ہوا،

۱۔ لکھنؤ میں

غالب نے لکھنؤ میں تقریباً گیارہ ماہ قیام کیا، اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا، نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا، آغا میر وزیر سلطنت تھا، غالب کے احباب نے آغا میر کی شان میں قصیدہ کی فرمائش کی، قصیدہ کے بجائے صنعتِ تعطیل میں "منظوم نثر" کی عبارت پیش کردی، جو غالب کے ضمیر کا آئینہ دار ہے،

کلکتہ سے واپسی پر غالب نے ایک سو چار اشعار کا ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر

؎۵ کلیات نثر صفہ ۶۶، ؎۶ ایضاً صفہ ۹۹، ؎۷ ایضاً صفہ ۱۵۸،

کی شان میں لکھا، جس میں آغا میر کی ہتک آمیز رویہ کی شکایت کی گئی ہے، قصیدہ کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضوان رفتم
ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنبان رفتم

یہ قصیدہ وقار، عظمت، تازگی اور روانی کا شاہکار ہے، اس میں امید و بیم اور یاس و حرمان کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہے، جس میں مراعات خسروانہ سے تنفر پایا جاتا ہے، بقول حالی شاہ نے پانچہزار روپیہ کا خطیر انعام عطا کیا تھا، تین ہزار روپیہ تو خود آغا میر ہڑپ کر گیا اور مابقی مرشد محمد نامی شخص لے اُڑا جس کے توسط سے یہ قصیدہ پیش کیا گیا تھا۔ه

امید و بیم اور یاس و حرماں کا نقشہ کھینچا ہے:

لکھنؤ دام نشاطی سر راہم گسترد
بیخود از ولولۂ شوق پُر افشان رفتم
جلوہ در طالع خاشاک من افتاد زبون
شد غلط جادۂ گلخن بگلستان رفتم
کاش می سُوختم و دادِ فنا می دادم
شرم بادا کہ بدان تازہ خیابان رفتم
اندران بُقعۂ معمور ز دل تنگئ خویش
حسرت آگین جو گنہگار بزندان رفتم
از جفای فلک آہنگِ تظلم کردم
بدر بارگۂ خسروِ گیہان رفتم

مراعاتِ خسروانہ سے تنفر کا اظہار یوں کیا ہے:

ه یادگار صفحہ ۲۶، اور مہیش پرشاد صفحہ ۷۹۔

نازپروردۂ خلوت گہِ آزادگیم
کافرم گر بسراپردۂ سلطان رفتم
صِلہ جو نیستم و شعر فروشی نکنم
راہِ مدح تو بسر گرمیٔ ایمان رفتم
منم از خیل کریمانم و خجلت نبود
گر بدریوزہ بدرگاہ کریمان رفتم

ایک اردو غزل کے قطعۂ بند میں جس کا مطلع ہے۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمین بوس قدم ہے ہم کو

غالب نے لکھنؤ آنے کی وجہ یوں بیان کی ہے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہِ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

غالباً مندرجۂ بالا غزل لکھنؤ کے زمانے کی یادگار ہے، آغا میر کے علاوہ غالب کے دل میں لکھنؤ اور شاہِ اودھ کی بڑی عزت تھی، میاں داد سیاح کو لکھا ہے:

"لکھنؤ کا کیا کہنا ہے، وہ ہندوستان کا بغداد تھا اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سروسامان وہاں پہنچا، امیر بن گیا"۔ ۹

غالب نے لکھنؤ مئی ۱۸۲۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ میں چھوڑا اور تین دن کے بعد کانپور پہنچا، وہاں سے باندا، موڈا، رستا، چلا تارا اور الہ آباد ہوتا ہوا بنارس وارد ہوا،

---

۹ اردوئے معلّیٰ صفحہ ۱۷،

۲- بنارس میں

بنارس پہنچنے کی بھی صحیح تاریخ معلوم نہیں، یہاں بھی غالب نے کافی عرصہ قیام کیا، وہ شہر کے دلکش مناظر اور طرح طرح کی رنگینیوں سے بیحد متاثر ہوا، وہ بنارس کی ہوشربا فضا سے اتنا مسحور ہوا کہ اس نے ایک سو آٹھ اشعار کی رُوح پرور مثنوی "چراغ دیر" تصنیف کر ڈالی، کلیاتِ نظم فارسی میں یہ تیسری مثنوی ہے اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

نفس با صُور دم ساز است امروز
خموشی محشرِ راز است امروز

غالب پہلی نظر میں بنارس پر فریفتہ ہو گیا تھا، چالیس برس کے بعد بھی اسے بنارس میں مقیم ہونے کی تمنا تھی، مگر یہ آرزو آرزو ہی رہی،

اس مثنوی پر تنقید مناسب موقعہ پر کی جائے گی، غالب نے شہر کی دلکشی اور صنفِ نازک کے حُسن لااُبالی سے متاثر ہو کر صحیح اور حقیقت پسندانہ انداز میں شہر کا آنکھوں دیکھا حال شاعرانہ انداز میں لکھا ہے، اس نے بنارس کو "بہشتِ خرّم"، "فردوسِ معمور"، "شاہد آئینہ در دست"، "نگارستانِ گیتی"، "دیرستان نیرنگ" اور "بہارستانِ حُسنِ لااُبالی" سے تشبیہ دی ہے، جب وہ دریائے گنگا میں غسل کرنے والی دوشیزاؤں کا سراپا بیان کرتا ہے تو غالب وارفتہ ہو جاتا ہے اور نظامی گنجوی کے بیان کردہ "سراپائے شیرین" سے کہیں آگے نکل جاتا ہے، اس نظم پر بابِ دوم فصلِ ہفتم میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے،

غالب بنارس سے ۹ رجمادی الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوا۔

۳- کلکتہ میں

بنارس سے غالب ۱۹ رفروری ۱۸۲۸ء، مطابق ۴ر شعبان ۱۲۴۳ھ کو براہ پٹنہ بروز سہ شنبہ کلکتہ پہنچا، مولوی محمد علی خاں صدر الصدور باندا کے نام لکھا ہے:

"گاہ از شدّت بردیالی افسردہ و رنجور، وگاہ از ستمی گردشِ ایام

ستم دیدہ و نالان، روزِ سہ شنبہ چہارم شعبان پارہ از روز بر آمد بودُ
بہ کلکتہ رسیدم" [۱۰]

دس روپیہ ماہانہ کرایہ پر شملہ بازار میں ایک مکان لیا،[۱۱] یہ مکان ورود کے روز ہی
بغیر کسی دقت کے دستیاب ہوگیا تھا، رائے چھجمل کو اپنا پتہ لکھا ہے:

"اما برای فرستادن نامہ دو طریق است، یکی بتوسط راجہ سوہن
لال نزد مرزا افضل بیگ فرستادن، دیگی بی شرکت غیر در سر رشتۂ
ڈاک ارسال داشتن و عنوانش بدین رنگ نوشتن کہ، در کلکتہ قریب
چیت بازار، در شملہ بازار، نزدیکِ تالاب گرُدد، حویلیٔ مرزا علی سوداگر
بہ اسد اللہ خاں برسد" [۱۲]

معلوم ہوتا ہے کہ مکان کشادہ، آرام دہ اور ضروری آسایشوں سے لیس تھا،
اُس کے صحن میں کنُواں بھی تھا[۱۳]، دو دن آرام کرنے کے بعد غالب نواب اکبر علی خاں
طبا طبائی سے ملنے نکلی گیا، نواب موصوف کی خدمت میں غالب نے صدالصدور باندا
کا لکھا ہوا تعارفی خط پیش کیا، نواب صاحب نے پُرتپاک استقبال کیا،[۱۴]
دو[۱۴] دن کے بعد غالب نے فارسی میں ایک درخواست لکھی اور سائمن فریزر، نائب
معتمد سپریم کاؤنسل سے ملا، فریزر اخلاق سے پیش آیا، اُس نے درخواست لی اور
انگریزی میں ترجمہ کروایا، غالب کی اس برتاؤ سے اُمید بندھی، مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ
چیف سیکرٹری کاؤنسل تک پہنچا، مسٹر اسٹرلنگ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں محکمۂ فارسی
میں بحیثیت کام کر چکا تھا، بنا بر این اُس میں فارسی ادب کا اعلیٰ ذوق پیدا ہوگیا تھا،
غالب نے بھی اُس کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس کا مطلع ہے ؎

---

[۱۰] کلیات نثر صفہ ۱۶۶، [۱۱] مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" کے صفہ ۷۰ پر
شملہ بازار پر نوٹ ملاحظہ فرمایئے، [۱۲] کلیات نثر صفہ ۱۵۹،
[۱۳] ایضاً صفہ ۱۵۹، [۱۴] ایضاً ۱۶۶-۱۶۷،

فغان کہ نیست سر و برگِ دامن افشانی
بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام ز عریانی

اور مندرجہ ذیل اشعار میں اپنا مدعا پیش کیا ہے ؎

نہ ملک خواہم و نی مال، اینقدر خواہم
کہ گرد من ز رخ بخت من بیفشانی
زبست سال فزون میشود کہ میسوزد
نفس چو رشتہ شمعم بہ بزم حیرانی
بداد گاہ رسیدم چنانکہ دانستم
برس بہ دادِ غریبان چنانکہ میدانی[۱۵]

تیر نشانے پر بیٹھا اور اسٹرلنگ پوری مدد کرنے پر آمادہ ہوگیا، درخواست کاؤنسل کے ایجنڈے پر رکھی گئی، فیصلہ یہ ہوا کہ مستغیث دہلی کے ریزیڈنٹ کے ذریعہ درخواست پیش کرے، چنانچہ غالب نے ہیرا لال نامی ایک شخص کو مختار بنا کر پیروی کرنے کے لئے دہلی لکھا اور سر ٹامس کولبروک سے قابل اطمینان سفارش کرنے کی ہدایت بھی کی، شومئی قسمت کا برا ہو کہ مختار نامہ پہنچنے سے پیشتر کولبروک دورے پر چلا گیا اسی دوران گورنر جنرل بھی شکار کھیلنے روانہ ہوگیا، اور کاؤنسل کا کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا،[۱۶]

امید کی پہلی کرن کے بعد اس غیر متوقع رکاوٹ نے غالب کو سراسیمہ کر دیا، اس کے باوجود بھی اُسے اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین تھا، اگرچہ قضا و قدر کا منشا دِگر گوں تھا۔

غالب نے اپنے برادر نسبتی علی بخش رنجور کے نام ایک خط میں اشارہ کیا ہے، کہ وہ کولبروک پر کرنل ہنری ہیولاک کے ذریعہ اثر ڈالنے کی کوشش کریں، نیز

---

[۱۵] ایضاً صفحہ ۱۶۷ ، [۱۶] ایضاً صفحہ ۱۶۸ - ۱۶۹ ،

نواب اکبر علی طبا طبائی نے دہلی ریزیڈنسی کے میر منشی التفات حسین کو اس بابت لکھا، [۱۷]

۴۔ کلکتہ سے واپسی

معلوم ہوتا ہے کہ دعویٰ کو سفارشی تحریر کے ساتھ آگے بڑھایا گیا تھا اور حق کو حق کر کے دکھایا گیا تھا، مگر قسمت کے پھیر سے پیشتر اس کے احکامات آخری صورت اختیار کریں افسر مذکور کو ملازمت سے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ فرانسس ہاکنس کو مقرر کیا گیا، اس غیر متوقع اور غیر معمولی تاخیر اور شہر کی مکدّر فضا کی وجہ سے غالب نے دہلی آنے کا فیصلہ کیا اور ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء بمطابق ۲ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچا، [۱۸] سفر کی مدت تین سال سے زاید تھی، جس میں اکیس ماہ کلکتہ میں گذرے، [۱۹]

دہلی پہنچنے پر پہلی فرصت میں غالب نے فرانسس ہاکنس سے ملاقات کی، یہ شخص نواب فیروز پور جھرکا کا طرفدار تھا، چنانچہ وہ غالب سے سرد مہری سے پیش آیا اور فریق ثانی کی جنبہ داری کی، اس ناکام ملاقات نے غالب کو مایوس کر دیا، چنانچہ اپنے ہمدرد اور ہمنوا دوست مولوی سراج الدین احمد خاں کلکتوی کو دلی جذبات لکھے:

"کار برگشت و روزگار برگشت .... کولبرگ بتوسط کرنل ہنری املاک برمن مہربان شد و رپورٹی کہ خوشتر از آن نتوان اندیشید بصدر فرستد و جوابی کہ سودمند تر از آن نتوان سنجید از صدر حاصل نماید، ہنوز جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد و ہاکنس کہ بجای کولبرگ نشیند آنچہ برہم زدن ہنگامۂ سلطنتی

---

[۱۷] ایضاً صفہ ۱۰۰ ، [۱۸] "غالب" صفہ ۱۲۵ اور غالب نامہ صفہ ۳۴،
[۱۹] غالب صفہ ۱۰۳،

رابس باشد از بہر من بصدر نویسد"۔[20]

ہاکنس نے سفارش کی تھی کہ جو رقم غالب کو مل رہی ہے وہ کافی ہے غالب اب بھی اسٹرلنگ کی حمایت پر بھروسہ کر رہا تھا، تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ کے مصداق دہلی سے مخالفانہ رپورٹ کلکتہ پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ اسٹرلنگ کا انتقال ہوگیا، اِس تازیانے نے غالب کا کام تمام کردیا، انتہائی اور آخری کوشش کرنے سے پہلے ہی غالب کو احساس ہوگیا تھا کہ قسمت اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کھیل رہی ہے، بھرے ہوئے دل کے ساتھ مولوی سراج الدین احمد کو لکھا ہے:

"سبحان اللہ! معزول نگردد مگر کو برگ، بمرگ ناگاہ نمیرد مگر اسٹرلنگ"۔[21]

غالب نے نئے چیف سیکرٹری جارج سونٹن پر اثر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن حسب معمول بغیر کوئی عملی اقدام سے پہلے ہی جارج اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا اور انگلینڈ روانہ ہوگیا، ہمارے بیچارے شاعر نے اس مقدمہ کے سلسلے میں ہر قدم پر شکست کا سامنا کیا، سچ ہے کہ تقدیر اٹل ہے، نہ اس میں ترمیم ہوسکتی ہے اور نہ ہی تاخیر،

اس پورے قصہ کا عجیب پہلو یہ ہے کہ غالب کو دوسری دستاویز کا علم نہ تھا، نواب احمد بخش نے یہ دستاویز لارڈ لیک سے مورخہ ۷، جون ۱۸۰۶ء کو حاصل کی تھی، یہی دستاویز فیصلہ کن ثابت ہوئی، معلوم ہونے پر اس دستاویز کے صحیح اور جائز ہونے کا ثبوت مانگا، سر جان مالکم[22] جو کسی زمانے میں لارڈ لیک کے ساتھ عرصہ تک ماتحت رہ چکا تھا اور اس کی

---

[20] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۴۴، [21] ایضاً صفحہ ۱۴۳،

[22] مصنف "تاریخ ایران"،

مُہر اور دستخط کو پہچانتا تھا، دستاویز اس کے پاس بھیجدی گئی اور اس سے مہر اور دستخط کے اصلی یا جعلی ہونے پر رائے طلب کی گئی، سر جان مالکم نے دونوں کی صحت سے اتفاق کیا، بنا براین غالبؔ کا مقدمہ خارج کر دیا گیا اور فیصلہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو سنایا گیا، [۲۳]

غالبؔ شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

آہ از اقربای بی آزرم

داد از حاکمانِ نا انصاف

اب بھی غالبؔ نے دعوٰی کا خیال ترک نہیں کیا، اس نے فیصلہ کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی، وہ دوبارہ کلکتہ جانے پر آمادہ تھا، لیکن سامانِ سفر کا انتظام نہ ہوسکا، عین اسی وقت گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک دہلی آیا، مقدمہ کے کاغذات پیش کئے گئے، مگر اس نے بھی فیصلہ کی توثیق کردی [۲۴]، اس نئے فیصلہ سے غالبؔ کی طبیعت اس درجہ منغص ہوئی کہ وہ اس سال گورنر جنرل کے دربار میں بھی شریک نہیں ہوا،

۱۸۳۵ء میں غالبؔ نے ایک اور درخواست یوپی کے گورنر کے نام لکھی، گورنر نے درخواست یہ لکھ کر واپس کردی کہ چونکہ معاملہ سُپریم کاؤنسل میں پیش ہوچکا ہے، وہ اس پر غور کرنے کا مجاز نہیں، لارڈ بینٹنگ کی واپسی پر غالبؔ نے ایک اور درخواست لارڈ آکلینڈ کو پیش کی، اس میں کہا گیا تھا کہ یا تو مقدمہ سول کورٹ میں بھیج دیا جائے یا کورٹ آف ڈائرکٹرس لندن کے حوالے کیا جائے، ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کو اطلاع ملی کہ کاغذات انگلینڈ بھیجے جا رہے ہیں [۲۵]، پانچ سال بعد غالبؔ کو

---

[۲۳] ذکر غالب صفہ ۳۵، [۲۴] کلیات نثر صفہ ۱۴۸،

[۲۵] ایضاً صفہ ۱۹۹-۲۰۰،

اطلاع دی گئی کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے پچھلے فیصلوں کی توثیق کردی ہے، غالب نے ملکۂ وکٹوریا سے اپیل کی، کوئی کامیابی نہیں ہوئی، اس طرح اٹھارہ سال (۱۸۲۶ء تا ۱۸۴۴ء) تک مسلسل کوشش کے بعد غالب نے یہ خیال ترک کر دیا اور قسمت پر شاکر ہو گیا، لیکن اس ارادے کو ایک بار پھر ۱۸۵۳ء میں توڑا اور لارڈ ایلین برا کے توسط سے ملکہ وکٹوریا کے پاس درخواست بھیجی، ساتھ میں قصیدہ بھی بھیجا، جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

نظم نخست زمزمۂ خوں چکان دہد
کز خون طراز سرورقِ داستان دہد

مقطع میں عرض مدعا ہے:

آن بادوخوش بود کہ شہنشۂ بحر و بر
انجام خواہش اسد اللہ خان دہد

اِس درخواست میں تین باتوں کی استدعا کی،
اولاً شاہی خطاب سے نوازا جائے،
ثانیاً خلعت عطا کی جائے،
ثالثاً پنشن کے قضیہ کو غالب کے حق میں فیصل کیا جائے،

کہا جاتا ہے کہ قصیدہ اور درخواست ملکہ کے حضور میں پیش ہو چکی تھی، اور غالب کی تینوں درخواستیں منظور ہو گئی تھیں، کہ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی چھڑ گئی اور غالب کی امیدوں پر پانی پھر گیا، چنانچہ منشی غلام غوث کو لکھا ہے:

"۱۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اُس قصیدے کے صلہ اور جائزہ کے واسطے جو بتوسط لارڈ الن براسائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز منظور ہے، جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اسکی

اطلاع دینی ضروری ہے ، یہ حکم مؤرخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں مَیں نے پایا، فروری ، مارچ ، اپریل خوشی اور توقع میں گذرے ، مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ (جنگ آزادی) اٹھایا۔“ [۲۶]

---

[۲۶] عودی ہندی صفہ ۱۱۸

فصلِ پنجم

سفرِ کلکتہ کے فوائد

اگرچہ غالب کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، مگر یہ سفر اس کے لئے نہایت ہی مفید ثابت ہوا، پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اس سفر نے اُس کے مشاہدات کو وسعت دی، جس سے اُس کے نظریۂ زندگی میں عمق اور رنگارنگی پیدا ہوئی، سفر زندہ تعلیم ہوتے ہیں، غالب کو یورپ کے ساکنوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں، اُس نے ان کی روح کو سمجھا، اور اُن کے رسومات کا عمیق مطالعہ کیا، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل کے دربار میں نشست اور خلعت ملا، شہر کے رؤسا سے تعارف ہوا، زمانے کے انگریز اور ہندوستانی اکابرین سے دوستی ہوئی، جس کی صحبتوں نے اُس کے کردار پر اچھا اثر ڈالا، جس کے نتیجہ میں وہ کلکتہ سے بہتر انسان بن کر واپس آیا، تیسرا فائدہ اُس کی ادبی شہرت میں معتد بہ اضافہ تھا۔

بنارس سے اِس قدر متاثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے دہلی سے باہر قدم کبھی نہیں نکالا تھا، اِس شہر کے قیام نے اُس کے ذہن میں تازگی، شگفتگی اور مسرت پیدا کی، چنانچہ بقیہ ایام زندگی میں بنارس کے فیض کو فراموش نہ کر سکا، کلکتہ میں اُسے نواب اکبر علی خاں اور مولوی سراج الدین احمد جیسے صادق الوعد اور مخلص الولا سرپرستوں کی رفاقت میسر ہوئی، مؤخر الذکر کے اصرار پر اردو اور فارسی کلام کا انتخاب عمل میں آیا۔ مولوی کرم حسین جن کے ایما پر غالب نے "چکنی ڈلی" لکھی تھی، بیحد مُعین و مددگار ثابت ہوئے، یہ تمام ذی اثر اشخاص تھے، انہوں نے پنشن کے مقدمہ میں بھی تا حدِ

اِمکان معاونت کی اور غالب کو شہر کے ادبی ماحول سے رُوشناس بھی کرایا، اور اپنے ٹھوس کردار کے نقوش بھی اُس کے ذہن میں مرتسم کئے، اُس کی خود بینی اور خود نمائی میں انقلاب پیدا ہوا، لہٰذا جب وہ دہلی واپس آیا تو اوائل عمر کے بہت سے بُرے اثرات معدوم ہو گئے تھے، اور وہ اصلاح پذیر شخصیت بن گیا،

۱۔ کلکتہ سے محبت

تین مختلف اقوام کے تین مختلف شعرا نے تین مختلف ادوار میں ہندوستان کے تین مختلف شہروں کو شرف اِمتیاز بخشا، شیخ محمد علی حزیں ایران سے تازہ وارد ہوا، بنارس میں مقیم ہوا اور اس شہر کی قربان گاہ پر قربان ہو گیا، بنارس کے متعلق اس کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے ؎

از بنارس نروم معبدِ جان است این جا
ہر برہمن پسری لچھمن و رام است این جا

مولانا شبلی نعمانی نے بمبئی کو بقائے دوام بخشا، شبلی دل ہار بیٹھے، دل کی مجبوریاں بھی تو مجبوریاں ہوا کرتی ہیں، شبلی کا دل وارڈن روڈ، مالابار پہاڑی کے قریب کسی گلی میں کلی کا ہار بن گیا تھا، ظاہر ہے کہ زندگی کا لُطف دِل کے ساتھ ہوتا ہے، شبلی نے بمبئی پر فارسی میں بیس غزلیں لکھی ہیں، چند اشعار قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کئے جاتے ہیں ؎

(۱) نثارِ بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را
طرازِ مسندِ جمشید و فرّ تاجِ خسرو را

(۲) "بیا ساقی بدہ باقی کہ در جنت نخواہی یافت"
کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

(۳) زہی جان بخشیٔ آب و ہوای بمبئیٔ شبلی
طراز خُلخ و نوشاد و فرخار است پنداری

(۴) زذوقِ طبعِ شبلیؔ من دراوّل روز دانستم
که در آشوب گاہِ بمبئیؔ در باز دایمان را

(۵) داغم که بہارِ چمنِ بمبئیؔ امسال
بر عادتِ پیشینہ جنون خیز بنود است

(۶) شاعری از من مجو دُور از سوادِ بمبئیؔ
حالیا شبلیؔ شدم، رندِ غزلخوان نیستم

(۷) بہ ہر ادای تو از بس کہ مبتلا گردم
ہمان بہ بندِ تو باشم ، اگر رہا گردم
زبمبئیؔ چو بہ ہندوستان رسم شبلیؔ
زیادہ بگذرم و باز پارسا گردم

غالبؔ کلکتہ پر مختلف وجوہ سے فریفتہ تھا، یہ ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اور مشاغلِ حیات سے پُر، نیز بین الاقوامی بستی ہونے کی وجہ سے ہر طرح جاذبیتوں کا مرکز تھا، انگلستان اس وقت صنعتی دور سے گذر رہا تھا۔ معلومات اور ایجادات کا دَور دورہ تھا۔ برطانوی حکومت پائدار ہو جانے کی وجہ سے اُس کے مزید استحکام کے لئے کچھ ایجادات و اختراعات یہاں بھی درآمد ہو چکی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ مغربی دوشیزاؤں اور اُن کے جاذبِ نظر اور ترنم خیز پوشاکوں میں ہر شخص کے لئے دعوتِ نظارہ کا سامان فراہم تھا، اندریں حالات غالبؔ جیسی، مکمل شاعرانہ ذہنیت اور رنگین مزاج شخص اِس مسحور کن رنگینی اور عریانی سے کیسے متأثر نہ ہوتا، چنانچہ وہ اِس تیز رو خیرگی کے سیلاب میں بہہ گیا، اس شہر کے اثرات اُس کے ذہن پر تادمِ زیست رہے، مرتے دم تک اس کی یہی آرزو رہی کہ اگر ازدواجی زندگی خوشگوار ہوتی تو کلکتہ میں جا کر مقیم ہو جاتا، وہ اس کلکتہ کی ہر ادائے مستانہ پر والا و شیدا تھا، اس نے ہندوستان کے خاور کے لئے اپنی تمام خواہشات

وقف کردیں، دہلی واپس آکر اس شہر کا گیت یوں گایا ہے:

"کلکتہ را غنیمت باید پنداشت، شارستانی بدین تازگی در گیتی کجاست؟ خاک نشینیٔ آن دیار ازاورنگ آرائی مرز و بوم دیگر خوشتر، من د خدا اگر متاہل بنودمی و طریق ناموس عیال نداشتمی دامن بر ہرچہ ہست افشاندمی و خود را در آن بُقعہ رساندمی، تا زیستمی در آن مینوکدہ بُودمی واز رنج ہوای ناخوش آسودمی، زہی ہوا ہای سرد و خوشا آبہای گوارا، فرخا بادہ ہای ناب و خرما ثمرہای پیشرس" [۱]

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد [۲]

رنجور کو لکھا ہے:

"کلکتہ جہانی از ہر گونہ کالا مالا مال، جُز چارۂ مرگ ہرچہ گوئی پیشِ ہنرورانش، سہل وجز بخت، ہرچہ خواہی، بیازارش فراوان" [۳]

ایک قصیدہ میں کلکتہ کی تعریف کی ہے:

یافت آئینہ بختِ توز دولت پرواز
ہذٰہ کلکتہ بدین حُسنِ خدا داد بناز
سیرگاہیست در اطرافِ تو گوئی کشمیر

---

[۱] کلکتہ کی آب و ہوا کے متعلق ایک شاعر نے لکھا ہے:

آب شور و زمین سراسر شور	شور فرمان روائے کلکتہ
پارۂ از زمین دوزخ بود	کہ بر آن بنائے کلکتہ
خارش و داد و پیچش و اِسہال	این ہمہ تحفہائے کلکتہ

[۲] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۴۶، [۳] ایضاً صفحہ ۱۶۷،

روستا نیست ز اقصای تو گوئی شیراز
گردِ سر گردَمت ای بُقعہ کہ گرد رہ تست
خاطر آویزِ تر از طرّۂ مشکین ایاز
چشمِ بد دُور کہ ہر جادہ بصحرای تو گشت
تارِ گلدستۂ نقشِ قدمِ شاہدِ ناز

ساقی سے خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے:

حال کلکتہ باز جُستم و گفت
"باید اقلیم ہشتمش گفتن"
گفتم: "این جا چہ کاروبار باید کرد؟"
گفت: "قطع نظر ز شعر و سخن"
گفتم: "این ماہ پیکران چہ کس اند؟"
گفت: "خوبان کشورِ لندن"
گفتم: "اِنیان مگر دِلی دارند؟"
گفت: "دارند لیکن از آہن"
گفتم: "بہرِ داد آمدہ ام"
گفت: "بگریز و سر بسنگ بزن"

آخر میں مندرجہ ذیل اشعار میں جذبات کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّہ کہ ہے غضب
وہ نازنین بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہای ناب گوارا کہ ہائے ہائے

۲۔ کلکتہ کے رفقا

غالبؔ اس بارے میں خوش قسمت تھا کہ اُسے دہلی اور کلکتہ میں مہربان، مخلص اور قابل اعتبار دوست مل گئے، کلکتہ کے دوسرے دوستوں سے زیادہ قریب نواب اکبر علی خاں اور مولوی سراج الدین احمد خاں تھے، اوّل الذکر ہگلی میں ایک مسجد کے متولی اور ذی اثر آدمی تھے، جب غالبؔ ادبی معرکہ" میں گھرا تو انہوں نے ہر طرح اُس کی حمایت کی اور مثنوی "بادِ مخالف" لکھوا کر تنازعہ ختم کرایا، نواب صاحب اعلیٰ درجہ کے فارسی کے شاعر بھی تھے،

مولوی سراج الدین احمد خاں لکھنؤ کے رہنے والے تھے، کلکتہ میں اردو اخبار "آئینۂ سکندری" نکالتے تھے، جیّد عالم تھے انہوں نے غالبؔ کے شاعرانہ مرتبہ کو شہرت دی اور نواب صاحب کی طرح ادبی تنازعہ کے طوفانی دور میں غالبؔ کا ساتھ دیا، "گل رعنا" انہی کی فرمائش پر انتخاب ہوا، غالبؔ کے بہت سے فارسی خطوط ان کے نام ہیں، غالبؔ ان کا بہت لحاظ کرتا تھا، پنشن کے مقدمہ میں بھی ممد و معاون رہے،

فصل ششم

ادبی معرکہ

۱۔ مشاعرہ

مشاعرہ اردو شاعری کا دستور ہی نہیں بلکہ اُس کی جان بھی ہے، بقول کسی ادیب کے مشاعرہ شعرا کے کلام کو مقبولِ عام بنانے کا طریقۂ قدیم بھی ہے اور کلام کا اصول و آئین بھی ہے، مشاعروں ہی سے کلام گھر گھر پہنچتا ہے اور یہیں سے شعرا میں نقد و نظر کی وہ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں جنہیں پختگی، انفرادیت اور طرز سے موسوم کرتے ہیں، مشاعرہ اپنی وضع اور لوازم کے ساتھ صرف اردو شاعری سے منسوب و متعلق ہے، کسی اور زبان میں اس کا وجود نہیں۔

اردو شاعری کا سب سے پہلا مشاعرہ دہلی میں خواجہ میر درد کے مکان پر ہوا، جس میں میر، سودا، میر سوز، خواجہ میر اثر، اور دیگر وہ اکابر قدما شریک ہوئے تھے، جن کا ایک ایک حرف ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے، پہلا مشاعرہ خواجہ میر درد کے اہتمام سے منعقد ہوا، اُس وقت اردو زبان کے نام (ریختہ) کی رعایت سے اسے مراختہ کہتے تھے،

خواجہ میر درد کے بعد مشاعرے ہر دور میں ہوتے رہے، چنانچہ غالب کے زمانے میں قلعۂ معلیٰ میں اردوئے معلیٰ کے مشاعرے یادگارِ زمانہ تھے، میر نظام الدین ممنون اور مومن خاں مومن کے ہاں بھی نشستیں جمتی رہیں، خود غالب کے کلام کی پختگی انہی نشستوں کی رہین منت ہے، اس دور سے اب تک مشاعروں کی مقبولیت

اور رواج میں روز افزوں ترقی ہوئی، تقسیم ہند سے پہلے دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، علیگڈھ حیدرآباد، بمبئی، لاہور اور کراچی میں مشاعرے ہوتے رہے، لیکن تقسیم کے بعد یہ سب بکھری ہوئی صحبتیں دوبارہ کراچی میں جمیں، اگرچہ نیاز احمد مرحوم کی کمشنری کے زمانے میں حیدرآباد میں بھی ہر سال ہند و پاکستان کا بین الاقوامی مشاعرہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں جناب محمد شعیب سابق وزیر خزانہ حکومت پاکستان کے زیرِ صدارت پابندی سے منعقد ہوتا رہا۔

تقسیم سے پہلے کراچی میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام ہر ماہ مشاعرے ہوتے رہتے تھے، اُس وقت انجمن ترقی اردو پاکستان چوک کی ایک عمارت میں قائم تھی، راقم الحروف بھی دو سال تک (۴۴-۱۹۳۵) انجمن کی معتمد اعزازی رہ چکا ہے، کراچی کے علمی ماحول اور ادبی فضا کا مفصل تذکرہ راقم کی زیرِ طبع کتاب "کراچی" میں دیا گیا ہے، بہر دست اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مولانا منظور حسین افسر، عبدالمجید صدیقی، صغیر انبالوی، منشی حبیب اللہ خان حجازی، مولانا شید اسرائیلی، امیر الدین ہمدم، مولا بخش ہمدم، عبد الرب، محمد ابراہیم عرب، میر ایوب خاں، حاجی فضل الہٰی، مجید لاہوری، حکیم عبد المجید خاں عاشق، حکیم فیض الحسن سلیم، سید منظور احمد ہمدانی، گوہر اخگر وغیرہ اِن مشاعروں کے لئے باعثِ رونق تھے،

طرحی مشاعرے مشق و مہارت کے لئے، اور غیر طرحی ندرت اور اُپج کے لئے بہت مفید ہیں، دیکھا گیا ہے کہ مشاعروں کے انتخاب کتاب کی صورت میں شائع نہیں ہوتے، کاش منتظمین مشاعروں کے انتخاب علی الالتزام شائع کرکے علم و ادب کی خدمت کو اور زیادہ عام کردیں، کیونکہ ایسے انتخابات میں تاریخی دستاویز بننے کے امکانات ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ آج کے چند بے بضاعت اوراق فردا کے مؤرخ کے لئے کسی دلچسپی کا سامان بن جائیں،

غالب کے قیام کلکتہ کا سب سے زیادہ اہم اور نمایاں واقعہ ایک اَدبی مباحثہ تھا جس نے آگے بڑھ کر ایک طویل قضیہ کی خطرناک شکل اختیار کرلی، تاریخ شاہد ہے کہ شعرا کے مابین علمی اور ادبی جھڑپیں اور طنز و تشنیع کے معرکے ہوتے رہے ہیں، فردوسی

نے اپنے دشمنوں کو وہ مات دی کہ وہ سر نہ اٹھا سکے، الوری اور طواط ذہنی معرکوں میں مصروف رہتے تھے، قاآنی نے حریفوں پر فتح پائی، عرفی بھی فیضی اور ہمنواؤں کے پے در پے حملوں کے باوجود ڈٹا رہا، حزین اور سراج الدین خان آرزو کے درمیان جدال ہوا، سودا نے میر کے خلاف شور مخاصمت برپا کیا، سید انشار اللہ خاں انشا نے غلام ہمدانی مصحفی کے خلاف طوفان اٹھایا، خود علامہ اقبال کو اپنا دفاع کرنا پڑا، ذوق نے غالب کے خلاف سازش کی اور منہ کی کھائی، اِن تمام معرکوں میں وُہی زندہ رہ سکا اور اسی کا پرچم بلند رہا جو سب سے زیادہ قابل تھا،

کہا جاتا ہے کہ جب غالب نے ہیرالال کو مقدمہ پنشن میں اپنا مختارِ کل بنایا تھا، تو اُسی زمانے میں اپنی ادبی مہمات شروع کر دی تھیں، فارسی شعرا کی صف اوّل اس کے لئے مختص ہو چکی تھی، اور یہ حقیقت ہے کہ اِس کا استقبال کلکتہ میں رئیس زادے کی حیثیت سے کم، اور شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں ایک مدرسہ[1] قائم کر رکھا تھا،

اِسی مدرسہ میں شعر و سخن کے شیدائیوں نے ایک ادبی حلقہ قایم کر کے ہر شمسی مہینے کی پہلی اتوار کو مشاعرے کا انعقاد شروع کر دیا تھا[2]، ان مشاعروں میں فارسی اور اردو نظمیں اور غزلیں پڑھی جاتی تھیں،

اسی مدرسہ میں ایک بار غالب کے اعزاز میں ایسا مشاعرہ منعقد ہوا، کفایت خان سفیرِ شاہ ہرات بھی شریکِ محفل تھے، چودھری عبدالغفور کے نام غالب نے لکھا ہے:

"یہ مثنوی جس میں یہ مصرعہ ہے: 'حاشا للہ کہ بدنمی گویم' کلکتہ میں لکھی ہے، پانچہار آدمی فراہم تھے، اور جو اعتراض مجھ پر کئے تھے اُس میں ایک اعتراض یہ تھا، کہ 'ہمہ عالم' غلط ہے، یعنی د 'ہمہ' کا لفظ 'عالم'

---

[1] یہ مدرسہ ۱۷۸۰ء میں وارن ہسٹنگز نے قائم کیا تھا، بقول ولیم ہنٹر اس کو محمڈن کالج کہا جاتا تھا، [2] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۷۰،

کے ساتھ ربط نہیں رکھتا قتیلؔ کا حکم یوں ہے، عرض کیا گیا کہ حافظؔ کہتا ہے: "ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست"، سعدیؔ کہتا ہے، "عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست"، غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں لکھی گئی، اور ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی، اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی، اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال اُدھیڑ دیتے"۔[۳]

غالبؔ نے فارسی کی دو غزلیں پڑھیں، جن کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تا کیم؟ دودِ شکایت ز بیان برخیزد
بزن آتش کہ شنیدن ز میان برخیزد

---

(۲) کیستم؟ دست بمشاطگیٔ جان زدۂ
گوہر آمای نفس از دلِ دندان زدۂ

کفایت خاں جس نے دوسرے شعرا کے پھسپھسے اشعار کا تمسخر اڑایا تھا، ان غزلوں کی بڑی تعریف کی اور اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کیا، کچھ لوگ چراغ پا ہوگئے اور غالبؔ پر حملے کرنا شروع کر دیئے، یہاں اس بات کی وضاحت لازمی ہے، اس زمانے میں قتیلؔ کا اثر بہت زیادہ تھا اور زیرِ بحث محفل مشاعرے میں اس کے امثال و نظائر کی اکثریت تھی، انہوں نے مندرجۂ ذیل تراکیب کی صحت میں کلام کیا: اوّل یہ کہ الفاظ "ہمہ" اور "عالم" میں ذیل کے شعر میں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے، کیونکہ "عالم" واحد ہے اور "ہمہ" صیغۂ جمع کو ظاہر کرتا ہے، اور ایسی ترکیب اجتماع قتیلؔ کے اصول سے ناروا ہے، ؎

جزوی از عالمم واز ہمہ عالم بیشم ہمچو موئی کہ بتان را ز میان برخیزد

---

[۳] عود ہندی صفحہ ۱۵

دُوم انہوں نے مصرعۂ ثانی پر بھی اعتراض کیا کہ "کمر" بہ نسبت "میان" کے زیادہ موزون تھا، آخری اعتراض یہ تھا کہ مندرجہ ذیل شعر میں "ی" کے بجائے "ہمزہ (ء)" کا استعمال محل نظر ہے ؎

کیستم؟ دست بشاطگیٔ جان زدۂ
گوہر آمای نفس از دلِ دندان زدۂ

ان اعتراضات سے غالبؔ برانگیختہ ہوگیا اور قتیلؔ کو متشاعر کہا اور اعلان کیا کہ میں فریدآباد کے ایک جاہل ہندو کی سند تسلیم کرنے کو تیار نہیں، اعتراضات کی بوچھاڑ شدت اختیار کرنے لگی، اور لہجہ بھی معاندانہ ہوتا گیا، غالبؔ نے بھی پوری سنجیدگی سے چیلنج قبول کرلیا، اور ہتک آمیز زبان سے بغض و نفرت کو اور بھی بھڑکا دیا، مخالفین بھی مقابلہ میں سینہ سپر ہوگئے،

حقیقت میں یہ اعتراضات نہ صرف سطحی اور مضحکہ خیز تھے، بلکہ طفلانہ اور مخالفین کے ذہنی انحطاط کے آئینہ دار بھی تھے، یہی تراکیب سعدیؔ اور حافظؔ جیسے شعرا کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، کفایتؔ خاں نے غالبؔ کے حق میں کھُل کر اعتراضات کو غلط گردانا اور دیگر اُستادانِ فن کے علاوہ سعدیؔ اور حافظؔ کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے،

(۱) بجہان خرّم از آنم کہ جہان خرم از وست
عاشقم بر "ہمہ عالم" کہ "ہمہ عالم" از وست

(سعدیؔ)

(۲) گر من آلودہ دامنم، چہ باک
"ہمہ عالم" گواہِ عصمتِ اُوست

(حافظؔ)

اس بحث میں حصّہ لینے والے دو گروہوں میں منقسم ہوگئے اور شاہانہ ٹھاٹھ سے جنگ شروع ہوئی، مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رامپوری اور

اور مولوی نعمت علی بہاری خاص مخالفین تھے،

نواب اکبر علی، مولوی سراج الدین احمد خاں اور کفایت خاں ہمارے شاعر کے طرفدار تھے، بعد میں اس طوفان کو دبانے کے لئے نواب ہنگلی اور مسمی محمد حسین نے غالب کو مصلحتاً معذرت نامہ کا مشورہ دیا، چنانچہ "مثنوی بادِ مخالف" یا "آشتی نامہ" لکھی گئی، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور غیض و غضب کسی حد تک فرو ہوا، ایک مدت کے بعد ۱۸۶۰ء میں یہ قضیہ "قاطع برہان" کی بحث کی شکل میں پھر ابھرا،

غالب کی یہ مثنوی اس کی بہترین مثنویوں میں شامل ہے، اور فارسی کی دیوان کی پانچویں مثنوی ہے، یہ "پوشیدہ نفرت" اور "معذرت کا ذہین حربہ" اپنے مقصد میں کامیاب رہا، چند اشعار ملاحظہ ہوں، مخالفین کو آسمان پر چڑھاتے ہوئے لکھا ہے،

ای تماشائیانِ بزمِ سخن — وی مسیحا دمانِ نادرفن

ای سخن پرورانِ کلکتہ — وی زبان آورانِ کلکتہ

ہریکی صدرِ بزمِ بارگہی — شمعِ خلوت سرای کارگہی

اپنے حق میں جذبۂ ہمدردی کو ابھارتے ہوئے کہا ہے۔

اسد اللہ بختِ برگشتہ — در غم و پیچ عصر سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ مہمان شماست — پی سخن ریزہ چین خوان شماست

بتظلم رسیدہ است اینجا — بامید آرمیدہ است اینجا

کیستم؟ دل شکستۂ، غمزدۂ — بیدلی، خستۂ، ستمزدۂ

بسیہ روزِ غربتم بینید — تیرہ شبہای دشتم بینید

برغریبان کجا روا است ستم؟ — رحم گرنیست خود چرا است ستم؟

اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے الزام اُن پر یوں عائد کرتا ہے:

در بگوئید ماجرائی رفت — از تو در گفتگو خطائی رفت

زلفِ گفتار را کہ درہم کرد؟ — بزمِ اشعار را کہ برہم کرد؟

بیش را بیشتر کہ گفت بمن؟ | بدز من بیشتر کہ گفت بمن؟
"ہمہ عالم" غلط کہ گفت نخست؟ | پارۂ زین نمط کہ گفت نخست؟
"مُوئی را برکمر" کہ گفت غلط؟ | شعر را سربسر کہ گفت غلط؟

پھر غالب اُن سے استدعا اور منت کرتا ہے کہ "اپنی غلطی جان کر تمہیں معذرت کا اظہار کرنا چاہیئے تھا، اس کے بجائے تم نے مجھے گھیر لیا اور دل بھر کر گالیاں دیں، میں نے بھی اپنے دِفاع میں لب کشائی کی اور ایسے کلمات کہہ ڈالے جو نہ کہنے چاہیئے تھے، اب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے میں تمہاری محبت کا طلب گار ہُوں"

چون بدید یدکہ اعتراض خطاست | ہر چہ غالبؔ نوشتہ است بجاست
رشتۂ باز پُرس تاب کہ داد؟ | معترض را زمن جواب کہ داد؟
تا بشوریدہ دل زبی جگری | بفغان آمدم زخیرہ سری
گلہ مندانہ گفتگو کردم | پارۂ در سخن غُلو کردم
کاشش با عتراض ساختمی | نالہ در زیرِ لب گداختمی

خارِ دامانِ دوستان بودن [۱]
خوشتر از باغ و بُوستان بُودن

ندامت کا اظہار کرنے کے بعد اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے سوائے اس کے کہ اُس کی وجہ سے دہلی کو بدنام کیا جائے گا، کہتا ہے،

خاکپای سخنورانستم | دوستان را کہترانستم
نہ ز آویزشِ بیان ترسم | من دایمان کہ من ز آن ترسم
کہ پس از من بسالہای دراز | برزبان ماند این حکایت باز
کہ سفیہی رسیدہ بود اینجا | چند روز آرمیدہ بود اینجا
آہ از آن دم کہ بعد رفتنِ من | خونِ دہلی بود بگردنِ من

---

[۱] اقبال نے کہا ہے ؎ خوشتر از ہزار پارسائی گامی بطریقِ آشنائی

قتیلؔ اور واقفؔ کے متعلق کہتا ہے:

آنکہ طی کردہ این مواقف را — چہ شناسد قتیلؔ و واقفؔ را

اور پھر مصلحتاً مدح بالذم کرتا ہے:

یشوم خویش را بصلح دلیل — می سرایم نوای مدح قتیلؔ
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت — سعدیؔ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بہ است — از من و ہم چو من ہزار بہ است
نظمش آبِ حیات را ماند — در روانی فراتؔ را ماند
نثرِ او نقش بال طاؤس است — انتخاب صراح و قاموس است

آخر میں آشتی اور دوستی کی تمنا کرتا ہے اور مثنوی ختم کرتا ہے:

این رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال — بود سطری ز نامۂ اعمال
از منِ نارسائی ہیچمدان — معذرت نامۂ ایست زی یاران
بو کہ آید ز عذر خواہیٔ ما — رحم بر ما و بیگناہی ما
"آشتی نامہ" و داد پیام — ختم شد والسلام والاکرام

یہ واقعہ غالبؔ تا عمر نہ بھلا سکا، [۴]

---

[۴] کلیاتِ نثر صفہ ۱۷۰، عودِ ہندی صفہ ۱۷۱، ایضاً صفہ ۲۴

فصلِ ہفتم

حبسِ بیجا

غالب کی زندگی ایک طویل المیہ تھی، خوش قسمتی نے کبھی التفات نہ کیا، متعدد بار وہ ہدف طعن و تشنیع بنا، مالی مشکلات اور گھریلو پریشانیاں اس پر مستزاد تھیں، کم سنی میں والدین کی شفقت سے محرومی، جبریہ شادی اور سخت گیر قرضخواہوں کی یورش، اور نواب لوہارو کی ستم ظریفیوں نے غالب کو پراگندہ خاطر کر دیا تھا، تقدیر کے اس پر پے درپے وار ختم نہ ہوئے، یہاں تک کہ اُسے قید کا گوشۂ تنہائی تک نصیب ہوا، یہ چھ ماہ کی قید با مشقت غالب کی نجابت اور عزت پر داغ تھا جو، ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۴ھ میں لگا،

اس المیہ کے دو سبب تھے، فوری سبب یہ تھا کہ غالب زندگی کی یکسانیت اور اُکتاہٹ سے تنگ آکر شطرنج اور چوسر وغیرہ کھیلنے لگا تھا، اور کھیل کو دلچسپ بنانے کے لئے گاہ گاہ بازی بھی لگانے لگا تھا، حکام اس زمانے میں سماجی بُرائیاں دور کرنے کی دھن میں تھے، مجرموں کو بلا لحاظ قوم و نسب سخت سزائیں دی جاتی تھیں، حالی لکھتے ہیں:

"مرزا کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کی عادت تھی، اور چوسر جب کھیلتے تھے تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے،،[1]

[1] یادگارِ غالب صفحہ ۲۸

کہتے ہیں کہ غالب ایک بار جُوا کھیلتے ہوئے پکڑا گیا، اور سزا ہوئی، قید کا دوسرا حقیقی سبب یہ تھا کہ لوگ مرزا صاحب کو نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کا ذمہ دار سمجھتے تھے، لوگوں کا خیال تھا کہ مرحوم کا جرم اتنا سنگین نہ تھا، کہ ۱۸۳۵ء میں ان کو علانیہ پھانسی کی سزا دی جاتی،

امر واقعہ یوں ہے کہ نواب صاحب کی اپنے سوتیلے بھائیوں سے خاندانی ملکیت کے بارے میں شدید دشمنی تھی، اور غالب کو بھی نواب صاحب سے اطمینان نہیں تھا، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی نواب صاحب کے بھائیوں سے مل گیا ہو، اور ان کے دعویٰ کی ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی سے سفارش کی ہو، فریزر غالب کا دوست تھا اور ۱۸۳۲ء میں اس نے پنشن کے معاملہ میں غالب کی مدد بھی کی تھی، اُسے ایک شخص کریم خاں نے نواب صاحب کے ملازم انیا کی مدد سے قتل کیا، انیا سرکاری گواہ بن گیا، اور نواب صاحب کو منظرِ عام پر پھانسی ہوئی اور پرگنہ فیروز پور جھرکا وغیرہ برطانوی مقبوضات میں ضم کر دیا گیا، اس ضبطی کے فوراً بعد غالب کو دہلی کلکٹری سے پینشن ملنے لگی، غالب کو فریزر کے مرنے کا بیحد دُکھ ہوا، چنانچہ اُس نے مرثیہ بھی لکھا، جس کا مطلع ہے:

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزری
زینسان بہ چیرہ دستیٔ اعدا شود ہلاک

غالب کی سفارش پر فریزر نے فیصلہ نواب صاحب کے خلاف کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں نواب صاحب کو اپنے بھائیوں میں جائداد مساویانہ تقسیم کرنا پڑی، اِس کا انجام یہ ہوا کہ نواب صاحب نے فریزر کو قتل کروایا اور اس سودے میں اپنی جان گنوائی، نواب صاحب کو نو سَو سپاہیوں کے پہرے میں کشمیری دروازے کے باہر عوام کے سامنے پھانسی پر چڑھایا گیا،

اب دیکھنا یہ ہے کہ غالب کہاں تک اس موت کا ذمہ دار ہے، جس زمانے میں مقدمہ اور تحقیقات جاری تھیں، غالب قرضہ کی دو ڈگریوں کی وجہ سے اپنے

گھر کی چار دیواری میں رہتا تھا اُس وقت یہ رسم تھی کہ باعزت شخص کو ایسی ڈگریوں کی وجہ سے اُس کے مکان سے گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ غالب گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا، صرف رات کو وہ احباب سے ملنے جایا کرتا تھا، کیونکہ رات کے وقت گرفتاری کی ممانعت تھی، وہ اکثر دہلی کے مجسٹریٹ فریسکاٹ سے ملتا رہتا تھا، چونکہ اس مجسٹریٹ سے اُس کے دوستانہ تعلقات تھے، لوگ یہ سمجھے کہ وہ مُخبری کرنے جاتا تھا اور اُسی نے مجسٹریٹ کو بدظن کیا، غالب نے شیخ امام بخش ناسخ کے نام ایک فارسی خط میں تفصیل لکھی ہے، طوالت کے خوف سے درج نہیں کیا جاتا، ؎۲

غالب کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور وہ غصہ جو نواب صاحب کی پھانسی کے وقت سے لاوے کی طرح پکتا رہا آخر کار غالب کی گرفتاری اور حبس بیجا کی صورت میں ۱۸۴۷ء میں پھٹ پڑا، نیز کوتوالِ شہر نے بھی انتقام لیا، کیونکہ کسی زمانے میں یہ بھی غالب سے شکست فاش کھا چکا تھا،

ریمانڈ کے ایام میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر فرمانروائے ہند نے ریزیڈنٹ کے نام مقدمہ خارج کرنے کے لئے خط لکھا، لیکن چونکہ مقدمہ عدالت تک پہنچ چُکا تھا، اس لئے حکام نے مداخلت سے معذوری ظاہر کی، غالب کے کسی فارسی خط کا خلاصہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ پولیس انسپکٹر غالب کا جانی دشمن تھا، اس نے مقدمہ کے منصف کے کان بھر دیئے تھے، یہ مجسٹریٹ تازہ وارد ہونے کے باعث غالب کی ممتاز حیثیت سے ناواقف تھا، اس نے غالب کو چھ ماہ کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جُرمانے کی سزا دی، اور عدم ادائیگی جرمانے کی صورت میں مزید چھ ماہ کا حکم دیا، اور ساتھ ساتھ پچاس روپیہ کی ادائیگی پر مشقت سے مستثنیٰ کرنے کی اجازت بھی دی غالب نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی،

؎۲ کلیات نثر صفحہ ۱۶۱-۱۶۲،

لیکن سیشن جج نے باوجود دوستی کا دم بھرنے کے فیصلہ کی توثیق کردی، غالب کے ایک فارسی خط کا جو کلیاتِ نثر فارسی میں شامل نہیں ہے حالی نے مندرجہ ذیل خلاصہ لکھا ہے:

"کوتوال[۳] دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا، اور میری قید کا حکم صادر کردیا، سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے مہربانی اور دوستی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا، اس نے بھی اغماض اور تغافل کیا، صدر میں اپیل کیا گیا، مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا، پھر نہ معلوم کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی، اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا........ سُنا ہے رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی، اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی،"[۴]

شیخ محمد اکرام[۵] نے اپنی قابلِ قدر کتاب غالب نامہ میں بمبئی کے ایک اردو اخبار "احسن الاخبار" سے دو اقتباسات نقل کئے ہیں، ان سے غالب کی گرفتاری، قید اور رہائی پر روشنی پڑتی ہے، کیونکہ دوسرے اقتباس میں سزا کی تاریخ ۲ر جولائی ۱۸۴۷ء دی گئی ہے۔

---

[۳] غالب نامہ کے بموجب کوتوال کا نام کنور وزیر علی تھا صفہ ۵۲ اور مولانا مہر کے مطابق اس کا نام کنور نوروز علی تھا، بقول سید امجد علی اڈیٹر "پاکستان کوارٹرلی" کوتوال کا نام فیض الحسن تھا، غالب نمبر فروری ۱۹۷۰ء صفہ ۸۶، [۴] یادگار صفہ ۲۸،

[۵] غالب نامہ صفہ ۵۲ ۔ ۵۳،

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سزا کا فیصلہ ۲ر جولائی ۱۸۴۷ء کو سنایا گیا، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رہائی یکم اکتوبر ۱۸۴۷ء کو ہوئی ہوگی،

جیل کے اندر غالبؔ سے شاہی قیدی کا سلوک کیا گیا، اُس کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی عائد نہ تھی، اور گھر سے کپڑے اور کھانا برابر پہنچتا رہا، نیز احباب واعزہ سے ملاقات پر بھی پابندی نہ تھی، وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک علیٰحدہ کمرے میں رہتا تھا، [۶]

اس مصیبت کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ دوست و اقربا نے لاتعلقی کا برتاؤ کیا، اور کوئی قید میں ملنے کے لئے نہ گیا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تقریباً روز جاتے تھے اور فرشتۂ رحمت بن کر غالبؔ کی وقت گذاری اور تسکینِ خاطر اور تالیفِ قلب میں لگے رہتے تھے، ان کی ذات غالبؔ کے لئے مستقل سکون وراحت کا باعث تھی، یہ اخلاص کی واحد شریفانہ مثال تھی، [۷]

غالبؔ نے اِس محبت اور داد کا جواب ہمیشہ گرمجوشی سے دیا، خصوصاً جب نواب صاحب بغاوت کے الزام سے بری ہو کر میرٹھ پہنچے تو غالبؔ نے حاضرِ خدمت ہو کر مبارکباد پیش کی، نیز حبسیّہ (وہ ترکیب بند فارسی جو غالبؔ نے جیل میں لکھی) میں نواب صاحب کو "رحمتِ حق بہ لباسِ بشر" کہا ہے، ان کی دوستی کی بڑی قدر کرتا تھا اور دوسروں سے فخریہ اِس کا ذکر کیا کرتا تھا، دوستی کرنا آسان ہے، مگر اس کا نبھانا مشکل ہے، دوست وہ ہے جو کہ مصیبت کے وقت کام آئے، ورنہ فارغ البالی میں تو ہر کوئی دسترخوان کی مکھی کی طرح بھنبھناتا ہے

ع۔ سیہ بختی میں سایہ بھی جدا انسان سے رہتا ہے،

حالیؔ لکھتے ہیں:

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اس زمانے میں مرزا کے ساتھ

---

[۶] یادگار صفہ ۲۹، [۷] ایضاً صفہ ۳۰،

دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا، اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا، اور تین مہینے تک برابر اُن کی غمخواری اور ہر طرح کی خبر گیری میں مصروف رہے۔" ؎۵

غالب نے نواب صاحب کی شان میں ایک بلند آہنگ قصیدہ بھی لکھا ہے،

اس ذلّت و خواری سے رہائی کے بعد غالب نے دہلی چھوڑ کر دور از مقامات، اپنے خوابوں کے دیار میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا، جہاں نہ اُسے کوئی جانتا ہو، نہ وہ کسی کو جانتا ہو، شاید مندرجۂ ذیل مطلع والی غزل اسی المناک واقعہ کا ردِّ عمل ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

حالی نے غالب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ دیا ہے، جس میں شاعر نے اس حبسِ بیجا کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے:

"اگرچہ میں اس وجہ سے ہر کام کو خدا سے سمجھتا ہوں، اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گذرا اُس کے ننگ سے آزاد، اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں، مگر آرزو کرنا عبودیت کے خلاف نہیں ہے، میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں، اور اگر رہوں بھی تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی پناہ اور آستانۂ رحمۃ اللعٰلمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے، دیکھئے وہ کب وقت آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے، نجات پاؤں، اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود

؎۵ ایضاً صفہ ۳۰

قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں، یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا ہے، اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"[۹]

اسی لہجے میں تفتہ کو بھی لکھا ہے:

"مجھے اس موقعہ پر سوائے اس کے کہ تماشائی نیرنگ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی...... سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں، اور ایک بڑا دھبّہ لگ گیا ہے۔"[۱۰]

اب ایک لطیفہ ملاحظہ ہو، قید سے رہائی کے بعد غالب کو میاں کالے کے مکان پر جس میں وہ پہلے سے مکین تھا دوست احباب مبارکباد دینے کی غرض سے آنے لگے، ایک بار میاں کالے کی موجودگی میں ایک بے تکلف دوست نے اُس کو رہا ہونے کی مبارکباد دی، تو اِس "حیوانِ ظریف" نے برجستہ جواب میں کہا:

"کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے، پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں۔"

محفل ہنسی کے مارے زعفران زار ہو گئی،

---

[۹] ایضاً صفہ ۲۹،

[۱۰] مہیش پرشاد صفہ ۹-۱۰

فصلِ ہشتم

دربار میں باریابی

غالبؔ نے شہنشاہِ وقت کے دربار میں رسائی کی عرصۂ دراز تک ناکام کوشش کی، لیکن کسی غلط فہمی کے باعث باریابی نہ ہوسکی، حال آنکہ بادشاہ کی شان میں قصیدے بھی لکھے اور پیش کیے، لیکن دُوری جاری ہی رہی، یہ بھی مقدر کی ستم ظریفی تھی کہ غالبؔ کے مرتبہ کا شاعر لوچ پوچ درجہ کے شعرا سے پیچھے رہ گیا، دربار کی اِس سرد مہری کے کئی وجوہ ہیں،

پہلا اور اہم سبب یہ ہے کہ غالبؔ نے نادانستہ طور پر بہادر شاہ ثانی کے احساسات کو اُس کی ولیعہدی کے زمانے میں ٹھیس پہنچائی تھی، حقیقت میں اکبر شاہ ثانی اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ سلیم کو وارثِ تخت بنانے کی سخت کوشش کر رہا تھا، کیونکہ اُس کے نزدیک بڑا بیٹا فاتر العقل تھا، چنانچہ ہمارے شاعر نے سلیم کو ہونے والا بادشاہ تسلیم کیا اور اُس کی مدح میں قصیدے پیش کیے، مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل اشعار میں غالبؔ براہِ راست شاہزادہ سلیم کو مخاطب کرتا ہے ؎

درین زمانہ کہ کلکِ رصد نگارِ حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم
زہی مناسبتِ طبعِ شاہزادہ سلیم
بفیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اِقلیم

"طبع شاہزادہ سلیم" کی تلمیح نے ولیعہد (مرزا ابوظفر سراج الدین محمد) پر شاعر کی خواہشات بے نقاب کردی ہونگی، ایک اور سبب یہ ہے کہ غالب اور ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق کے مابین چپقلش سی رہتی تھی، ذوق ولیعہد مرزا ابوظفر کے اتالیق خاص ۱۸۰۸ء میں مقرر ہوئے تھے اور جب بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ء تخت نشین ہوئے تو ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازے گئے (ملکۂ وکٹوریا بھی ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئی تھی، اور ظفر کو مظفری سے محروم کر کے ہندوستان پر مسلط ہوئی تھی) ظاہر ہے کہ ملک الشعرا بنتے ہی ذوق نے اپنے حریف اعظم کی صلاحیتوں سے ڈرتے ہوئے بادشاہ کے کان بھرے ہوں گے، جس سے بادشاہ اور زیادہ بدظن ہوگئے ہونگے، تیسرا وقیع سبب یہ ہے کہ نواب شمس الدین احمد کی بیوہ بادشاہ کے بڑے لڑکے مرزا فخرو کے عقد میں آگئی تھی، اور چونکہ نواب صاحب کی پھانسی کی ذمہ داری غالب پر عائد کی جاتی تھی، اس لئے بادشاہ کے شکوک برابر بڑھتے رہے، جس کے نتیجہ میں ہمارا شاعر انتہائی کوششوں کے باوجود مغل دربار میں باریاب نہ ہوسکا، اور موقعۂ عظیم کے لئے مزید تیرہ سال انتظار کرنا پڑا۔

غالب کو باریابی کے لئے تقریباً تیرہ سال انتظار کرنا پڑا، اس دورانِ امید و بیم کے عالم میں قصائد پر قصائد بھیجتا رہا، اس نے کل پندرہ قصیدے لکھے جو کلیاتِ نظم فارسی میں موجود ہیں، غالب نے ہر تہوار پر خواہ عید ہو یا نوروز، قصیدہ گزارنے کا اصول بنالیا تھا، تخت نشینی کے موقع پر تہنیتی قصیدے میں غالب شکوہ کرتا ہے، ؎

بہ بارگاہ نرسم خانۂ سپہر خراب
ندیم شہ نہ شوم، روئے روزگار سیاہ
چہ سر کنم روشِ مدح گستری کہ چو مرا
بہ بزمِ خسروِ گیتی ستان نباشد راہ

دوسرے قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

ردیفِ شعر از آن کردم اختیار گرہ
کہ از من است بر ابروی شہریار گرہ

آخرِ کار اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے، اور حکیم احسن اللہ خاں یقین اور اپنے پیر شیخ نصیر الدین عرف میاں کالے جو بادشاہِ وقت کے بھی مُرشد تھے، کی وساطت سے غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء مطابق ۲۳ شعبان ۱۲۲۶ھ کو ملازمت شاہی میں داخل ہوگیا، بادشاہ نے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب مع خلعتِ فاخرہ عطا فرمایا، اور پچاس روپیہ ماہانہ پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد ہوا، غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ عزت بحیثیت شاعر نہیں بلکہ کلرکی کے کام کی وجہ سے ہوئی، کیا یہ تأسف کا مقام نہیں، کہ اتنا بڑا شاعر، اتنے بڑے شہنشاہ سے، اتنے بڑے کام کے عوض، اتنی قلیل رقم پر مقرر کیا جائے! مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہمارے شاعر نے اِس تنکے سے سہارے کو قبول کر لیا، پاؤں ٹکانے کے لئے ذرا سی جگہ کافی تھی۔

اس فرضِ منصبی کا انتظام یوں کیا گیا کہ حکیم احسن اللہ خاں کتابوں سے ضروری مواد جمع کر کے غالب کے حوالے کر دیتے تھے، جس کو وہ مدوّن و مرتب کرتا، ان کو زبان و بیان کے مناسب سانچے میں ڈھالتا جاتا تھا،

غالب نے تاریخ تیموریہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا، اور اپنی جدّت اور روشِ خاص سے دونوں کے بالکل اچھوتے نام رکھے، پوری تاریخ کا نام "پرتوستان" رکھا، اُس نے پہلے حصّہ کا نام "مہر نیم روز" رکھا، جس میں وہ تخلیق کائنات سے لے کر ہمایوں تک کے واقعات لکھنا چاہتا تھا، یہ حصّہ ۱۸۵۲ء میں مکمل ہوا، اور ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا، [1]

دوسرے حصے میں جس کا نام "ماہِ نیم ماہ" رکھا تھا، اکبر کے عہد کے آغاز سے

---

[1] کلیاتِ نثر صفہ ۲۵۰،

بہادر شاہ ثانی تک کے واقعات لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن اِس کے شروع کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی چھڑ گئی اور یہ کام کالعدم ہو گیا،

پہلا حصہ چھپ کر بادشاہ کی خدمت میں ۱۸۵۴ء کو پیش ہوا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالؔب نے ۱۸۵۴ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک دوسرا حصہ شروع کیوں نہیں کیا؟ جواب یہ ہے کہ غالؔب کا عجیب و غریب اسلوب بادشاہ کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، نیز خود غالؔب نے قصداً کام کو معرض التوا میں رکھ ڈالا، کیونکہ وہ قلیل مشاہرہ میں بیک وقت ملک الشعرا اور مؤرخ کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتا تھا، اور جب بادشاہ ہی تخت سے محروم کر دیا گیا، تو غالؔب نے اس کا خیال ہی ترک کر دیا، جب شیونرائن نے دوسرے حصّے کی اجازت طلب کی، تو غالؔب نے جواباً لکھا:

"اب وہ بات گئی گذری، بلکہ اب وہ کتاب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل" [۲]

منشی حبیب اللہ ذکا کو لکھا:

"قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر کا نام و نشان مٹ گیا، آن دفتر را گاؤ خورد، وگاؤ را قصاب برد، وقصاب در راہ مُرد" [۳]

۱۸۵۴ء میں قسمت نے یاوری کی، اور ولیعہد شہزادہ فتح الملک مرزا غلام فخر الدین فخرو نے چار سو روپیہ سالانہ پر غالؔب کو اپنا اتالیق مقرر کیا، [۴] اور اسی سال ذوق کی وفات کے بعد ملک الشعرا بھی بنا دیا گیا۔

---

[۲] مہیش پرشاد صفحہ ۳۸۳، [۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۳ اور عودِ ہندی صفحہ ۳۷
[۴] ایضاً صفحہ ۱۱۱ ایضاً صفحہ ۳۳-۳۴،

مرزا فخرو رمز تخلّص کرتے تھے اور اُردو کے نغز گو شاعر تھے، خمخانۂ جاوید کی تیسری جلد کے صفحہ ۴۴ میں لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے دہلی کے مشہور مشاعرہ منعقدہ ۱۸۴۵ء بمطابق ۱۲۶۱ھ کی صدارت کی تھی، انہوں نے چالیس سال کی عمر میں ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں بعارضۂ اسہال وفات پائی، ان کی وفات کے ساتھ ہی ہمارے شاعر کے قلیل المیعاد فارغ البالی کا دور بھی ختم ہو گیا، بعد ازآں ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ کو جنگ آزادی نے سلطنتِ مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور غالب بالکل بے سہارا ہو گیا، یہ خوشحالی کا زمانہ تبسم گل کے مانند گذر گیا، مسرت سے تیس سال تک محروم رہنے کے بعد امید کی ایک شعاع پیدا ہوئی تھی، جسے ایک تندوتیز طوفان نگل گیا، اور غالب کی اُمیدیں منہدم ہو گئیں،

جس زمانے میں غالب تاریخ تیموریہ لکھ رہا تھا، تو اس نے فارسی خطوط لکھنا بند کر دیئے تھے، اور اردو نثر میں جدّت طراز تجربے شروع کر دیئے تھے، منشی نولکشور کے نام ایک خط مرقومہ ۱۸ر جولائی ۱۸۶۰ء میں لکھا ہے:

"در پارسی زبان بسا سخن گفتہ ام، و سحر نامہا نگاشتہ،
اکنون کہ دل از ناتوانی سگالش بر نمی تابد، کار بر خود آسان کردہ ام،
و ہرچہ می باید نبشت، در اُردو می نویسم" [۵]

اردو خطوط نے غالب کو زندۂ جاوید کر دیا، کیونکہ اِن خطوط میں وہ شیوۂ بیان اختیار کیا ہے، جو سلاست، روانی، شگفتگی بے ساختہ پن اور برجستگی کا مظہر ہے، اور پیچیدگی، تصنع، کاوش اور دقت کا نام نہیں، ان تحریری مکالموں میں تمام فضول رسمیاتی لوازم خطاب اور سلام وغیرہ کو ترک کر دیا گیا ہے، غالب براہِ راست مضمون خط پر آجاتا ہے، اور اپنے خیالات سیدھے سادے اور پُرزور الفاظ میں ادا کرتا ہے، جس سے مجموعی طور پر تیکھا پن آجاتا ہے،

---

[۵] کلیاتِ نثر صفحہ ۲۷۳-۲۷۴،

تفصیل بیجا کے بجائے اجمال پسند کیا، پڑھنے والا مسرور و مسحور و مبہوت ہو جاتا ہے، مگر یہ غالب ہی کا حصہ ہے، کوئی دوسرا تقلید نہیں کر سکتا، یہ خطوط اردو ادب کا مایۂ ناز اور قابل فخر ورثہ ہیں اور کلاسک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، ان اعلیٰ منثور نظموں پر ہرا سلوب نثار ہے،

کاش غالب کے نام اُس کے بے شمار دستوں کے خطوط محفوظ ہوتے تا ان سے اس عہد پر کہیں زیادہ بھرپور روشنی پڑتی، اگر محنت سے تلاش کی جائے تو یہ بیش بہا دفینہ اب بھی ہاتھ آ سکتا ہے، کیا کوئی پُر حوصلہ محقق اس خلا کو پُر کرے گا؟

فصل نہم

عارف کی موت

ہم غالب کی زندگی کے اس دلدوز اور اثر انگیز المیہ سے صرف نظر نہیں کر سکتے، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، غالب کے یہاں سات بچے پیدا ہوئے، لیکن کوئی بچہ پندرہ ماہ سے زاید نہ جی سکا، ناامید ہو کر غالب نے اپنی بیگم کی بڑی ہمشیرہ بنیادی بیگم کے بڑے بیٹے زین العابدین کو متبنیٰ کیا، کہا جاتا ہے کہ غلام حسین مسرور اور ان کی اہلیہ بنیادی بیگم کے مابین تعلقات کشیدہ تھے،

زین العابدین عارف نے دو بار شادی کی، پہلی بیوی نواب شمس الدین احمد خاں کی حقیقی بہن نواب بیگم تھی، یہ ملاپ بے ثمر رہا، دوسری بیوی بستی بیگم بخارا کے مرزا محمد علی خاں کی بیٹی تھی، اس سے دو لڑکے ہوئے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کہتے ہیں کہ عارف کو دوسری بیوی سے بے پناہ محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کی وفات کے چند ماہ بعد عارف بھی لحد میں جا سویا، اس کا انتقال ۳۵ سال کی عمر میں بعارضۂ پیچش ہوا، ۱۸۱۷ء میں اس کی ولادت ہوئی اور ۱۸۵۲ء میں اس کی وفات ہوئی،

عارف بچپن ہی سے ضعیف البنیان، ذہین اور تخیل پرست تھا، فارسی میں صاحب ذوق تھا اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، بچپن ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی، یہی وجہ ہے کہ غالب اس کی طرف بھانجا ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایک ہونہار شاعر ہونے کی وجہ سے ملتفت ہوا تھا اور اس کو محبت کے ساتھ بیٹا بنایا تھا، اس کو شاعر فردا سمجھ کر غالب نے اس ناتراشیدہ ہیرے کو بڑی خوبصورتی سے تراشنا

شروع کردیا تھا، مگر صد حیف کہ اس کی امیدیں خاک میں مل گئیں، کیونکہ موت کے فرشتے نے اس شاہین کے پر فلک پیمائیوں سے پہلے ہی نوچ ڈالے،

غالب کے لئے یہ سانحہ خلاف توقع تھا، اس چوٹ سے اس کا سر چکرا گیا، اُس نے اردو زبان کا جامع ...... اور پُراثر مرثیہ لکھا، جس کا مطلع ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

سوز و گداز ملاحظہ ہو ؎

ہاں! اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

فارسی میں غالب کا عارف پر ایک قطعہ ہے، غالب اُسے اپنا جگر گوشہ اور ذہنی جسمانی، رُوحانی اور علمی لحاظ سے اپنا وارث سمجھتا تھا، ملاحظہ ہو ؎

آن پسندیدہ خُوئی عارف نام — کہ رُخش شمع دودمان منست
ہم بُرُوی تو مائلم، مائل — کاین گل باغ و بوستانِ منست
ہم ز کلکِ تو خوش دِلم خوش حال — کان نہال ثمر فشان منست
سودِ سرمایۂ کمال منی — سخت گنج شائگانؔ منست
جاودان باشی کہ در گیتی — سخنت عمرِ جاودانِ منست
ایکہ میراث خوارِ من باشی — اندر آرد کہ آن زبانِ منست
از معانی زمبداء فیاض — باد آنِ تو ہرچہ آنِ منست

عارف کی وفات کے بعد غالب نے اُس کے بیٹوں کو متبنّیٰ کیا، انہیں گھر لایا،

ؔ خسرو پرویز کے آٹھ مشہور خزانوں میں سے گنج شائگان سب سے بڑا خزانہ تھا، دوسرے خزانوں کے نام یہ ہیں: گنج عروس، گنج دینا، گنج افراسیاب، گنج سوختہ، گنج خضرا، گنج باد آور، اور گنج شاد آورد یا گنج بار،

اُن کو محبت و پیار سے رکھا، چھوٹے کو اپنا بیٹا بنایا، اُن کو تعلیم دی، ان میں فنونِ لطیفہ سے دلچسپی پیدا کی، بڑے کی شادی کی، چھوٹے کا گھر بسانے کا اہتمام ہو رہا تھا کہ غالبؔ خدا کو پیارا ہو گیا اور یہ آرزو اپنے ساتھ لے گیا،

غالبؔ دو بار رام پور گیا، اور دونوں بار عارفؔ کے لڑکے ساتھ رہے، ایک محبتی باپ کی طرح ان کا دلار کرتا تھا، غلام نجف خاں کو رام پور سے لکھا ہے:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں، کبھی میرا دِل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں، فروری کے دو دو روپیہ لے کر دس دن میں اٹھا ڈالے، پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو، ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا، آج چودہ ہے، مہینہ دُور ہے، دیکھئے کے بار قرض لیتے ہیں۔" [۲]

---

[۲] مہیش پرشاد صفہ ۲۲۶ اور اردوئے معلّیٰ صفہ ۱۸۷،

فصل دہم

دربار رام پور

۱۸۴۷ء میں حبس بیجا سے رہائی کے بعد غالب نے سنجیدگی کے ساتھ گردو نواح کی ریاستوں سے بحیثیتِ اتالیق یا مذہبی مشیر باعزت تعلقات قائم کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا[۱] صبر و استقلال نے راستہ ہموار کیا اور وہ والئی جے پور سے تجدید تعلقات کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر یہ سلسلہ نہایت مختصر ثابت ہوا، اس کی مساعی جمیلہ اُس وقت بار آور ہوئیں جب مولوی فضل حق خیرآبادی کی سفارش سے اُس کے والئی رام پور سے دیرپا تعلقات قائم ہوئے، والیان ریاست سے تعلقات میں یہ تعلق سب سے زیادہ معزز اور مفید ثابت ہوُا، کیونکہ نوابانِ رام پور نے نہ صرف اس کی شایان شان سرپرستی کی، بلکہ مساوی حیثیت بھی دی،[۲]

---

[۱] مہیش پرشاد صفہ ۱۰،

[۲] مولوی فضل حق مولوی فضل امام خیرآبادی کے صاجزادے تھے، اور غالب کے ہم عمر تھے، ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے، عربی اور فارسی اور فقہ کے عالم تھے اور حدیث حضرت شاہ عبدالقادر سے پڑھی تھی، عدالتِ دہلی میں سررشتہ دار بھی رہ چکے تھے، مستعفی ہوکر والئی جھجر کے پاس جاکر رہے، اُن کا نواب یوسف علی خاں والئی رام پور پر بڑا اثر تھا، اور انہیں کی سفارش پر غالب کو اتالیق مقرر کیا گیا تھا، ان پر ۱۸۵۷ء میں (باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

کہتے ہیں کہ دہلی میں جلاوطنی کے زمانے میں غلام محمد خاں کے پوتے نواب محمد یوسف علی خاں نے عربی و فارسی کی تحصیل مولوی صدر الدین آزردہؔ[سے]، مولوی فضل حق خیرآبادی اور غالب سے کی، جب نواب صاحب نے یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو اپنے والد سید محمد سعید خاں کی جگہ والئ ریاست کی باگ ڈور سنبھالی، تو غالبؔ نے فارسی میں ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، اس کا جواب نہ آیا، دو سال کے بعد غالب نے ایک اور قطعہ لکھا، اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا، ایک مرتبہ ۱۸۵۷ء میں مولوی فضل حق نے نواب صاحب کے سامنے غالبؔ کا ذکر چھیڑا، اور موقع کو غنیمت سمجھ کر غالبؔ کو قصیدہ اور درخواست پیش کرنے کی تلقین کی، چنانچہ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو غالبؔ نے

[سے] مولوی صاحب کشمیری الاصل تھے، ۱۷۸۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء کو بعارضۂ فالج انتقال کیا، عربی، فارسی اور اردو کے فاضل اور تینوں زبانوں کے شاعر تھے، شاہ عبدالعزیز اور اُن کے برادران شاہ عبدالقادر اور شاہ محمد اسحٰق، نیز مولوی فضل امام کے شاگرد تھے، کئی سال دہلی کے صدر الصدور رہے، "غدر" کے بعد اُن کی جائیداد ضبط ہوگئی، لیکن مقدمہ میں رہا کیے گئے (اردوئے معلّیٰ صفہ ۱۹۷) بقول مولینا غلام رسول مہر کے انہوں نے جامع مسجد دہلی کے قریب مدرسہ دارالبقا قایم کر رکھا تھا، (غالب صفہ ۲۸۴-۲۸۸) غالبؔ نے ایک نغز قصیدہ خاقانی اور عرفی کے تتبع میں مولانا کی شان میں لکھا ہے، کل چار قصیدے لکھے، تین تو کلیات میں شامل ہیں اور ایک سبد چین میں (باقی صفحہ ۱۳۲) بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا اور حبس دوام کی سزا ہوئی، جزائر انڈومان ونکوبار بھیجے گئے جہاں جلاوطنی کے عالم میں ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو انتقال ہوا، غالبؔ پر مولانا کی رہنمائی کا بڑا احسان ہے، ان کا اردو دیوان مولینا کا مرہون منت ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر مولانا کی صحیح رہنمائی ممد و معاون نہ ہوتی تو غالبؔ کا نام ونشان تک نہ ہوتا، کلیات نثر صفہ ۱۷۴، اردوئے معلّیٰ صفہ ۱۱، غالب صفہ ۲۸۱-۲۸۳ اور ڈکشنری آف اورینٹل بیوگرافی بیل صفہ ۱۳۳

مندرجہ ذیل قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے ؎

ہمانا اگر گوہرِ جان فرستم
بنواب یوسف علی خان فرستم

تیر نشانے پر بیٹھا، کیونکہ اس قصیدے کے جواب میں نواب صاحب نے غالب کو اپنا استاد مقرر کیا، اور ۵، فروری کو چند غزلیں بغرض اصلاح بھیجیں۔[۴]

غالب نے اپنے چوتھے خط میں نواب صاحب کے لئے تخلص کئے، شوکت، انور، عالی، ناظم اور نیساں، نواب صاحب نے پہلا تخلص پسند کیا۔[۵] جنوری ۱۸۵۷ء سے نواب صاحب غالب کو وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہے، مگر اس تعلق کے تین ماہ بعد ہی جنگِ آزادی چھڑ گئی اور فریقین کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، جب حالات معمول پر آ گئے تو نواب صاحب نے کثیر رقمیں غالب کو بھیجنا شروع کر دیں، بعد میں غالب کے اصرار پر سنو روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا، یہ وظیفہ جولائی ۱۸۵۸ء سے شروع ہوا۔[۶]

ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے، نواب صاحب کی شاگردی دراصل غالب کو مالی مدد دینے کا بہانہ تھی، کیونکہ اول یہ کہ نواب صاحب کو شاعرانہ باتوں اور شاعرانہ طرزِ بیان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، دوم یہ کہ اُن کا دربار خود مشاہیرِ روزگار، محققین، شعرا اور علما سے بھرا ہوا تھا، جن میں کسی سے یہ کام آسانی سے لیا جا سکتا تھا، شفقت اور شریفانہ برتاؤ اور خیر سگالی کا یہ جذبہ نواب صاحب کی بے شمار فیاضیوں کی ایک مثال ہے۔[۷]

---

[۴] مکاتیب صفہ ۴۶، ذکرِ غالب صفہ ۷۴، غالب نامہ صفہ ۶۳، غالب صفہ ۲۰۷

[۵] مکاتیب صفہ ۷-۸، مہیش پرشاد صفہ ۱۹۹، عودِ ہندی صفہ ۱۳۰،
اردوئے معلیٰ ۲۳۴، نواب صاحب "ناظم" تخلص رکھتے تھے،

[۶] مہیش پرشاد صفہ ۴۷، مکاتیب صفہ ۲۳۴،

[۷] ایضاً صفہ ۲۶۲،

سفرِ رامپور

نواب یوسف علی خاں نے تین بار غالب کو رامپور مدعو کیا، مگر غالب اِس سفر کو ایک نہ ایک حیلہ پر ملتوی کرتا رہا، جب چوتھی مرتبہ ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو بلایا گیا تو اُس نے مزید انکار کرنا خلافِ اخلاق سمجھا اور رامپور جانے کا ارادہ کر لیا،

حقیقت یہ ہے کہ غالب اپنی ضبط شدہ پینشن حاصل کرنے کی امید میں تھا، اور اِسی سبب سے سفرِ رامپور ملتوی ہو رہا تھا، بعد میں جب اس کی مساعی کامیاب نہ ہوئیں، تو اُس نے نواب صاحب سے استمداد چاہی، کیونکہ نواب صاحب اس وقت برطانوی حکومت کی نظر میں پسندیدہ تھے، چنانچہ غالب بروز جمعرات ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے عارف کے لڑکوں کو لے کر روانہ ہوا، اور بروز جمعہ ۳ر فروری ۱۸۶۰ء کو رام پور پہنچا، اُس کا شاندار استقبال ہوا اور شاہانہ سلوک کیا گیا، [۸] کچھ عرصہ وہ شاہی مہمان رہا، اور بعد میں قیام کے دوران سَو روپیہ ماہانہ مقرر ہوا، غالب کو یہ اختیار دیا گیا کہ دو سو روپیہ ماہانہ پر رامپور میں رہیں، یا سَو روپیہ ماہانہ وظیفہ پر دہلی میں مقیم رہیں، قیام کے لئے ایک بڑا مکان مہیا کیا گیا، باوجود نواب صاحب کے اصرار کے غالب دو ماہ کے اندر ہی رخصت ہو کر ۲۳ر مارچ ۱۸۶۰ء کو واپس آگیا، یہ ملاقات راس آئی، کیونکہ دہلی پہنچ کر پینشن واگذار ہو گئی، اور بقایہ رقم پوری مل گئی، [۹] کہتے ہیں کہ سر سید احمد خاں نے بھی کوشش کی تھی، [۱۰]

۱۸۶۴ء میں نواب صاحب کو سرطان ہو گیا، شفایابی پر غسل کے لئے فارسی میں ایک نسخہ لکھا اور ایک فارسی قطعہ مع اردو قصیدہ کے پیش کیا، بدقسمتی سے نواب صاحب کا مرض عود کر آیا، اور ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال کر گئے، اُن کے جانشین نواب

---

[۸] مکاتیب صفہ ۷۸ - ۸۰ اور صفہ ۸۲ - ۸۴، مہیش پرشاد صفہ ۲۰۴ اور صفہ ۲۲۴، اور صفہ ۲۶۱، اور صفہ ۲۶۲ اور صفہ ۷۲، اردوئے معلیٰ صفہ ۳۰۹

[۹] مہیش پرشاد صفہ ۲۶۱، [۱۰] غالب صفہ ۳۲۴

کلب علی خاں ہوئے، جن کی مسند نشینی کے موقع پر غالب نے یہ قصیدہ نذر کیا ؂

تجلّی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بہ طور
بشکلِ کلب علی خان دیگر نمود ظہور

ان کا پورا نام سید محمد کلب علی خاں تھا، ان کی والدہ کا نام فیر وزالنسا بیگم تھا، اِن کی پیدائش بروز یکشنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی میں ہوئی اور بروز چار شنبہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو انتقال کیا۔ نواب کلب علی خاں ایک متقی، پرہیز گار اور متدین آدمی تھا، اور عربی و فارسی کا عالم و فاضل تھا، مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولوی عبدالحق خیر آبادی کا شاگرد تھا، اہلِ علم کا دلدادہ تھا، چنانچہ اس کا دربار محمود غزنوی کے دربار کی یاد تازہ کرتا تھا، "نوّاب" تخلّص رکھتا تھا، اور غالب سے تلمذ تھا، اس نے اردو میں چار دیوان اور فارسی میں ایک دیوان چھوڑا، اس کی سرپرستی میں پہلی بار رام پور سے اردو کا پہلا اخبار "دبدبۂ سکندری" بتاریخ ۵ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو شائع ہوا، [۱]

کلب علی خاں نے اپنے والد کا منظور شدہ وظیفہ برقرار رکھا، اور غالب کو رام پور آنے کی دعوت دی، چنانچہ اس دعوت نامے کے پہنچتے ہی غالب فوراً دوسری بار رامپور کے لئے ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو روانہ ہوگیا، اس مرتبہ بھی عارف کے بیٹے ساتھ تھے، ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچا، اِس سفر کے تین مقصد تھے، اوّل یہ کہ نواب صاحب کے فیاض و دریا دل باپ اور اپنے مہربان و مشفق کی وفات پر تعزیت کرنا مقصود تھا، دوم، ذاتی طور پر والئ ریاست کو نذر پیش کرنا تھا، سوم نواب صاحب سے مزید مرحمت کی درخواست کرنے کا ارادہ تھا تاکہ ادئیگی قرض کے بعد باقر علی خان کی شادی کے فرائض سے سبکدوشی ہو سکے،

رسم مسند نشینی کے روز جو ۵ دسمبر ۱۸۶۵ء [۲] کو منعقد ہوئی تھی غالب بنفسِ نفیس موجود تھا، اِس مرتبہ بھی شاہانہ مراعات سے نوازا گیا، کلب علی خان نے

---

[۱] مکاتیب صفحہ ۴۸، ۴۹، [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۳،

وظیفہ کے علاوہ بارہ ۱۲۰۰ سو روپیہ کی خطیر رقم بھی غالب کے لئے ازراہِ بندہ پروری منظور کی۔[۱۳]

بچوں کو پہلے روانہ کر دیا تھا، خود دہلی کے لئے ۲۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو روانہ ہوا، واپسی پر غالب کو مرادآباد میں چند روز رُکنا پڑا، یہاں اس کا اسباب چوری ہو گیا، زکام کا حملہ بھی ہوا، آخر کار ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچا،[۱۴] یہ غالب کا دہلی سے آخری سفر تھا، دونوں باپ بیٹے غالب کی بہت عزت و احترام کرتے تھے، جیسا کہ غالب کے خطوط اور دربارِ رامپور میں اس کی پذیرائی سے ظاہر ہے،

کلکتہ کی طرح غالب رام پور سے بھی اس کی آب و ہوا اور دریائے کوسی کے پانی کی وجہ سے محبت کرتا تھا، میر مہدی مجروح کو لکھا ہے:

"یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے اور کہاں؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے، اور کوسی اس کا نام ہے، بے شُبہہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت ملی ہے، خیر، اگر یُوں بھی ہو تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا"،[۱۵]

حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے

"پانی[۱۶] کا شکر کس مُنہ سے ادا کروں، ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے، صاف، سُبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ، اِس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ، صبح کو بھوک خوب لگتی ہے"۔

---

[۱۳] مکاتیب صفہ ۱۰۶-۱۰۷، [۱۴] ایضاً صفہ ۶۲،

[۱۵] مہیش پرشاد صفہ ۲۶، [۱۶] ایضاً صفہ ۲۲۵،

آخر میں اِس سفر سے متعلق حالیؔ نے ایک لطیفہ لکھا ہے جس کو قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کیا جاتا ہے:

"جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا، اور مرزاؔ تعزیت کے لئے رامؔ پور گئے، چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کو لفٹننٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا، اُن کی روانگی کے وقت مرزاؔ بھی موجود تھے، چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزاؔ سے کہا: 'خدا کے سپرد' مرزاؔ نے کہا: 'حضرت، خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں'" [۶۷]

---

[۶۷] یادگارِ غالب صفحہ ۴۱

فصل یازدہم

کہولت اور علالت

نوجوانی کے زمانے میں غالب صحت و شباب کی زندہ تصویر اور مردانہ حسن کا مجسمہ تھا، اُس نے اپنی تنومند صحت، قوی اعضا اور بلند قامت کا بار بار ذکر کیا ہے، میخواری اور چند دیگر بے اعتدالیوں اور ہجومِ افکار نے اس کی پیرانہ سالی کو جوشیلی اور آتش فشاں جوانی کا تضاد بنا دیا تھا، شراب نے نظام جسمانی کو مسموم کر دیا، اور شراب ہی گوناگوں خوفناک بیماریوں کی ایک فوج ساتھ لائی جس کے پے درپے حملوں اور یورشوں سے اُس کی صحت برباد ہو کر رہ گئی، حقیقت میں وہ محض کھال اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا، آخری ایام میں وہ گزشتہ زیست کا سایہ بن کر رہ گیا تھا، جلدی بیماریوں نے اتنا پریشان کیا، کہ سالہا سال تک اُس کے ہاتھ اور پیر بڑے بڑے پھوڑوں سے بھرے ہوتے تھے، جن کا مستقل اثر باقی رہا، داغوں کے علاوہ بعض انگلیاں اکڑ کر اندر کو مُڑ گئی تھیں، جسمانی ضُعف نے زندگی دُوبھر کر دی تھی، بینائی تقریباً بیکار ہو گئی تھی، اور ستّر سال کی عمر میں کان بھی بالکل بہرے ہو گئے تھے، حافظہ بھی ناقص ہو گیا، لکھا ہے:

گوش گران، و رُوی پرُ آژنگ و پُشت کوز
وز غم بہ سینہ تعبیہ چون چنگ صد نفیر

شروعات میں زندگی میں پہلی مرتبہ اُس پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا،

ساری توانائی اور تنومندی جاتی رہی، مئی ۱۸۵۸ء میں قولنج کا درد اُٹھا، تفتہ کو لکھا ہے

"بیمار کیا ہُوا، توقع زیست کی نہ رہی، قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ بسمل کی طرح تڑپا کیا، آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا اس وقت تو بچ گیا، مگر قصہ قطع نہ ہُوا .... کل سے خوفِ مرگ گیا ہے، اور صورت زیست کی نظر آئی"۔ [1]

دوسرا حملہ ۱۸۶۱ء میں ہُوا۔[2] ان موذی بیماریوں نے اسے مستقل کمزوری اور کمی خون کا مریض بنا دیا، میاں داد خاں سیّاح کو لکھا ہے:

"ناتوانی زوروں پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سُستی، کاہلی، گرانجانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں"[3]

۱۸۶۰ء میں جلدی امراض شروع ہوئے، غلے کی گرانی کی اردوئے معلیٰ صفہ ۱۰۹ پر شکایت کی ہے۔

"غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے، میوے کے مول اناج بکتا ہے، ماش کی دال ۸ سیر، باجرہ ۱۲ سیر، گیہوں ۱۳ سیر، چنے ۱۶ سیر، گھی ڈیڑھ سیر"

کاش غالب زندہ ہوتا اور موجودہ ہوشربا گرانی ملاحظہ کرتا! شفق کو لکھا:

"غلّے کی گرانی آفت آسمانی، امراض دموی بلائے جانی، انواع و اقسام کے اورام و بثور شائع، چارہ مسدود اور سعی ضائع"۔[4]

۱۸۶۲ء میں داہنے ہاتھ کی پشت پر ایک بڑا پھوڑا نمودار ہوا جس کا زہر

---

[1] مہیش پرشاد صفہ ۳۵، [2] مکاتیب صفہ ۳۳،

[3] خطوط صفہ ۷، [4] ایضاً ۱۴۶،

خون میں سرایت کر گیا، اور سارے جسم پر پھوڑے ہی پھوڑے نکل آئے، صحت اور زیادہ خراب ہو گئی، چنانچہ میر سرفراز حسین کو لکھا ہے:

"رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا،" [۵]

شیو نرائن کو لکھا گیا:

"لو، اب میری حقیقت سنو، چھٹا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی ہوئی، پھنسی نے صورت پھوڑے کی پیدا کی، پھوڑا پک کر پھوٹ کر ایک زخم، زخم کیا ایک غار بن گیا، ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا، بگڑتا گیا، دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے، سلائیاں دوڑ رہی ہیں، اُسترے سے گوشت کٹ رہا ہے، بیس بیس دن سے صورت افاقت کی نظر آنے لگی ہے،" [۶]

تفتہ کو اطلاع دی گئی:

"بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے"، [۷]

خون مکمل طور پر زہر آلود ہو چکا تھا،

چنانچہ شفق کو لکھا ہے:

"سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گذرا، ۱۲-۱۵ مہینے صاحبِ فراش رہا، اٹھنا دشوار تھا، چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج نہ لقوہ، ان سب سے بڑھ کر ایک صورتِ پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض، مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے

---

[۵] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۸،

[۶] خطوط صفحہ ۴۰۶، [۷] ایضاً صفحہ ۸۷

اور پاؤ بھر مرہم درکار، نو۔ دس مہینے بے خور و خواب رہا اور شب و روز بیتاب،......... اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا ہونگا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹھیس اُٹھی، جاگ اُٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا، دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا، نئے سر سے روح قالب میں آئی......... اٹھتا ہوں اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اُٹھے"۔ [۸]

میاں داد سیّاح کو لکھا:

"ایک برس سے عوارضِ خون میں مبتلا ہوں، بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروِ چراغاں ہو گیا ہے......... اب نجات چاہتا ہوں بہت جیا، کہاں تک جیوں گا"۔ [۹]

تفتہ کو لکھا:

"......... سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا، جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں[م]، حواس سراسر مختل ہیں، حافظہ گویا کبھی نہ تھا، شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی......... میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں"۔ [۱۰]

مکرّر لکھا:

"بائیں پاؤں میں مہینہ بھر سے ورم ہے، کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں، انفعال دماغ ناقص ہو گئے، حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں......... مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بمرگ ہوں، دونو

---

[۸] ایضاً صفہ ۱۵۳، [۹] اردوئے معلّیٰ صفہ ۲۰

م۔ مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

[۱۰] خطوط صفہ ۹۶-۹۷

ہاتھوں میں پھوڑے، پاؤں میں ورم، نہ وہ اچھے ہوتے ہیں، نہ یہ رفع ہوتا ہے، بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے لیٹے لکھتا ہوں"۔ [۱۱]

قاضی عبدالجمیل کو لکھا:-

"ضعف کیوں نہ ہو؟ برس دن صاحبِ فراش رہا، ستر برس کی عمر، جتنا خون بدن میں بقابلے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا، سن نمو کہاں جواب پھر تولیدِ دمِ صالح ہو"۔ [۱۲]

مکرر لکھا:

"میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ، بیس دن سے پاؤں میں ورم ہو گیا ہے، کفِ پا و پشتِ پا سے گذر کر پنڈلی تک آماس ہے، جوتے میں پاؤں سماتا نہیں........ دردِ محلّلِ روح ہے، ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا، مگر ان تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں، روح اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں....... کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت جسم سے نفرت، روح سے نفرت.......

خرم آن روز کزین منزل ویران بردم" [۱۳]

غلام حسنین "قدر" کو یوں لکھا:

"برس دن سے صاحبِ فراش رہا ہوں، چھوٹے بڑے بارہ زخم اور ہر زخم خوں چکان، دونوں پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی پر ایسے ہیں کہ جن کا عمق ہڈی تک ہے، انہوں نے مجھ کو بٹھا دیا، اُٹھ نہیں سکتا، حاجتی دھری رہتی ہے، پلنگ پر سے کھسل پڑا، پھر پڑا رہا،

---

[۱۱] ایضاً صفحہ ۹۴، [۱۲] ایضاً صفحہ ۱۲۲ و اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۹،

[۱۳] خطوط صفحہ ۱۲۱ و اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۹ - ۱۷۰،

جسم میں جتنا لہو تھا پیپ ہو کر نکل گیا، تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کر جیتا ہوں، مرض کے آثار میں سے اب یہ نشان موجود ہے، کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں ...... نیم مردہ ہوں، قریب بمرگ ہوں۔" [۱۴]

متذکرہ بالا اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ بیچارہ غالب مختلف امراض کے باعث محض پوست و استخوان کا ایک ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا تھا، حقیقت میں یہ سب کچھ رامپور کے دوسرے سفر کا آوردہ تھا، مولوی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا:۔

"میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے، آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں، آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں، رامپور سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ و ضعفِ بصر...... اب زندگی مہینوں کی نہیں اور دنوں کی ہے۔" [۱۵]

طویل علالت سے اُکتا کر نواب علاء الدین علائی کو لکھا:۔

"میری حقیقت سنو، مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا، بائیں پاؤں میں ورم، کفِ پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں، خیر نہ اٹھا، روٹی کھانے محل سرا نہ گیا، کھانا نہیں منگا لیا، پیشاب کو کیوں نہ اُٹھوں؟ حاجتی رکھ لی...... یہ سب موقعے خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گذرتی ہے، آغازِ فتق مزید علیہ یا مستزاد...... اپنا۔

یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں:

ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔" [۱۶]

---

[۱۴] خطوط صفحہ ۱۹۴-۱۹۶، [۱۵] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶، [۱۶] خطوط ۳۵۳

رامپور کے دوسرے سفر کے بعد غالب نے ایک دن بھی سُکھ چین سے نہیں گذارا، ضعف برابر بڑھتا گیا اور احتراق کے باعث جسم پھوڑوں سے لد گیا پاؤں کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، باصرہ اور سامعہ مفقود اور رعشہ اور سلسل بول مستزاد، اشتہا غائب ہوگئی، آخری ایام میں پڑھنا لکھنا محال ہوگیا، الغرض اس کی حالت ہر طرح سے قابلِ رحم تھی، اِس حالت میں بھی دوستوں کو فراموش نہیں کیا، دوستوں سے خطوط کے جواب لکھوائے تھے، چنانچہ نواب میر غلام بابا کو لکھا:

"آپ جو فرماتے ہیں کہ تُو اپنی خیریت کبھی کبھی لکھا کر، آگے اتنی طاقت باقی تھی، کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی، ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا، بینائی ضعیف ہوگئی، متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں، عزیزوں، دوستوں میں کوئی صاحب وقت پر آگئے تو میں مطلب کہتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔" [۱۷]

طوالت کے خوف سے اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے، ورنہ اس نوع کے سینکڑوں خطوط موجود ہیں جو اس عظیم انسان کی زندگی کے آخری ایام کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

آخری ایام

ہمارا شاعر اپنے زمانے کا وہ بدنصیب انسان تھا جس کو کبھی چین نصیب نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ آخری عمر میں ماضی کا خواب بن کر رہ گیا،

۱۸۶۷ء کی "حبسِ بیجا" نے غالب کی حسّاس طبیعت پر گہرے نقوش چھوڑے، قولنج، سلسل بول، احتراق، قبض، ضیابیطس، ملیریا، فتق اور

---

[۱۷] اردوئے معلّی صفحہ ۴

دیگر امراض نے صحت کا ستیاناس کر دیا تھا، مستزاد یہ کہ رامپور کے آخری سفر نے رہی سہی طاقت بھی سلب کر دی تھی، دراین حالات موت کی آرزو کرنا فطری تقاضا تھا، ہر سال مرنے کی پیشین گوئی کی جاتی جو ہر بار غلط ثابت ہو جاتی، ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۷ھ خود مندرجۂ ذیل تاریخ کہی:

من کہ باشم کہ جاودان باشم
چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بپرسند درکدا مین سال
مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"
۱۲۷۷ھ

حالی نے یادگار میں لکھا ہے:

"منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا کے مخصوصین میں سے تھے، اُن سے مرزا صاحب نے اس مادّے کا ذکر کیا، انہوں نے کہا: حضرت! انشاء اللہ یہ مادّہ بھی غلط ثابت ہوگا، مرزا نے کہا: دیکھو صاحب! تم ایسی فال مُنہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤنگا،" ۳۱؎

یہ شعر بھی اسی حالت کی عکاسی کرتا ہے:-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ایک دوست کو لکھا:

"اس ہجومِ امراضِ جسمانی اور آلامِ رُوحانی کو اِن باتوں سے کیا ہوتا ہے، ہر دم دمِ نزع ہے، دِل وہ غم سے خُونریز ہو گیا ہے کہ کسی

۳۱؎ یادگار صفہ ۱۰۱

بات سے خوش نہیں ہو سکتا، مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات
کا طالب ہوں۔"

بقولِ حالی وفات سے کافی عرصہ پہلے سے چلنا پھرنا کم ہوگیا تھا، اشتہا مر چکی تھی اور قبض اس قدر غالب آگئی تھی کہ چھ چھ سات سات دن میں فراغت ہوتی تھی، مرنے سے چند روز پہلے سے غشی طاری ہوگئی تھی، وقفے وقفے سے ہوش آتا تھا، انتقال سے ایک روز بیشتر علائی کو خط لکھوایا:

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے
پوچھنا"

اکثر مندرجۂ ذیل مصرع اور شعر وردِ زبان رہتے:

ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

شعر دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات

۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کے دن دماغ پر فالج گرا، تمام کوششیں ناکام ہوئیں، چنانچہ غشی کے عالم میں اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲، ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ پیر کے روز بوقتِ ظہر اس شہنشاہِ سخن نے تہتر برس اور چار ماہ کی عمر میں وفات پائی، اور سلطان جی (درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہٗ) دہلی میں چونسٹھ کھمبا کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں اپنے خسر کے مزار کے بائیں مدفن قرار پایا۔[۱۹]

نمازِ جنازہ

نمازِ جنازہ دِلّی دروازے کے باہر اہلسنت والجماعت کے طریقے کے موافق

---

[۱۹] یادگار صفحہ ۱۰۲-۱۰۳، مکاتیب صفحہ ۱۰۸، غالب صفحہ ۳۴۳، مالک رام صفحہ ۱۶۶

پڑھی گئی، نیز دیگر رسومات اسی طرح ادا کی گئیں، جنازے کی مشایعت میں علاوہ دیگر عمائدین شہر کے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفیٰ خاں، اور حکیم احسن اللہ خاں شریک تھے، کاش اہلِ تشیع کو بھی اجازت ہوتی!

لوح مزار پر میر مہدی مجروح کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ

رشک عرفی و فخرِ طالب مرد　　اسد اللہ خانِ غالب مُرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

۱۲۸۵ھ

تعمیر مزار

غالب سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو سہراب مودی کے خرچ سے غالب کے مزار اور پورے قبرستان کی سنگِ مرمر سے تعمیر نو کی گئی، اس موقعہ پر حکومت ہند کے محکمہ ڈاک اور تار نے یادگار ٹکٹ بھی جاری کئے تھے۔

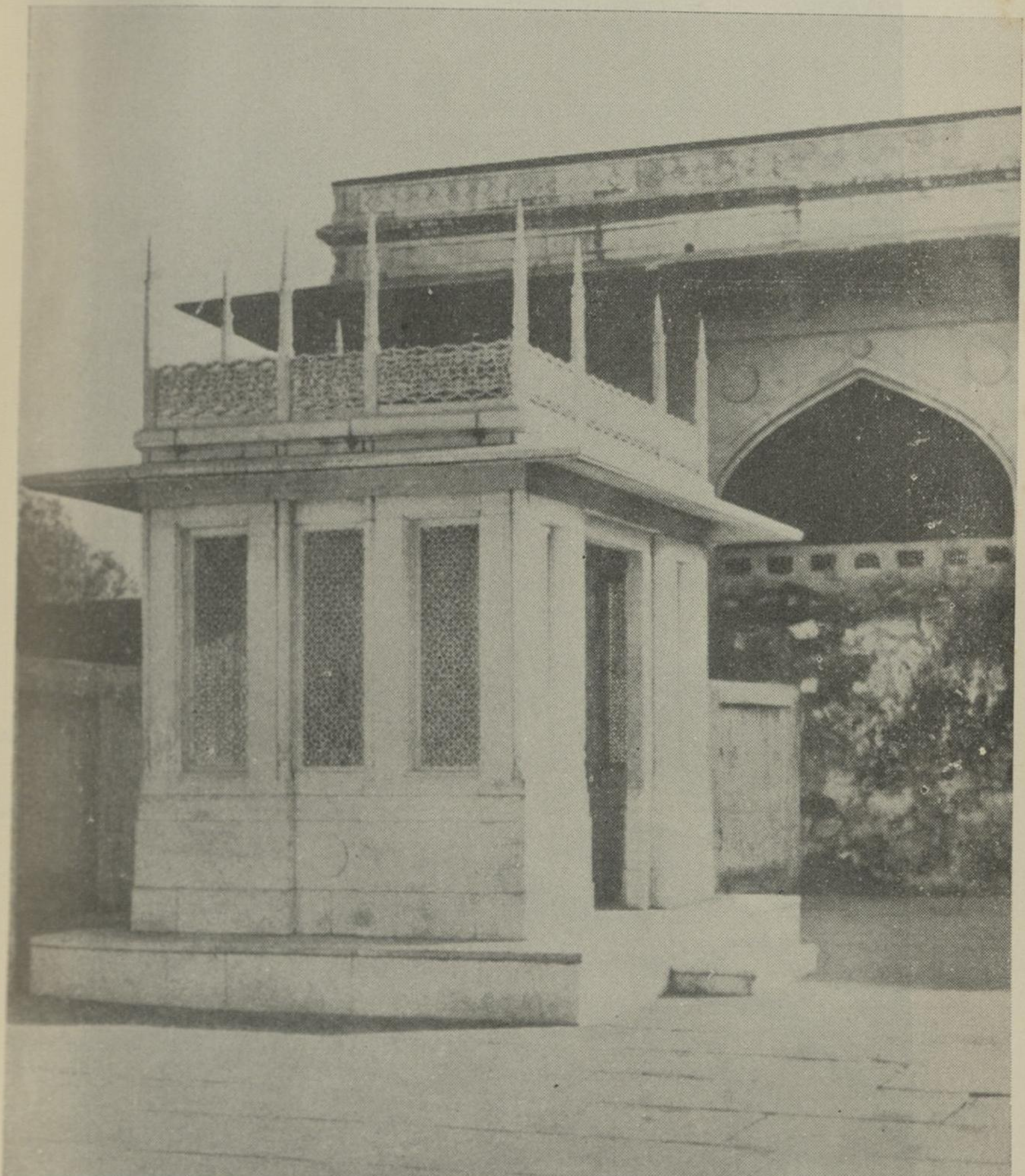
حُلیہ

حالی لکھتے ہیں:

"اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں شہر کے نہایت حسین اور خوشرو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے، اور بڑھاپے میں جب کہ راقم نے پہلی بار اُن کو دیکھا ہے، حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے، مگر اخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و



لوح مزار غالب



تعمیر شدہ مزار کا بیرونی حصہ

نزار ہوگئے تھے، لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ، اور ہاتھ
پانوٗں زبردست تھے، اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی
معلوم ہوتے تھے،، [۲۰]

ایک مرتبہ مرزا حاتم علی بیگ مہؔر نے جو خود بھی خوبصورت اور خوبرو تھے، اپنی تصویر غالبؔ کو بھیجی،

جواب میں لکھا گیا:

"تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو
رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا، اور
دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے، اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا
رنگ یاد آتا ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں، مجھ کو
رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا، تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب
گھٹی ہوئی ہے، وہ مزے یاد آگئے،، [۲۱]

آگے چل کر اسی خط میں لکھا:

تا دسترسم بود زدم چاک گریبان
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم [۲۲]

جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے
انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو
دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی......
... فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر مُنڈوایا،، [۲۳]

ذکرِ غالبؔ میں تفصیل یوں لکھی گئی ہے:

"اُن کی بڑی عمر کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب

---

[۲۰] یادگار صفہ ۱۸، [۲۱] خطوط صفہ ۳۱۲، یہ شعر حزیںؔ کا ہے، [۲۳] خطوط صفہ ۳۱۳

میں نہایت خوش رُو اور حسین رہے ہوں گے، چوڑا چکا ہاڑ، لانبا قد، اکہرا جسم، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کتابی چہرہ، کھڑا نقشہ، چوڑی پیشانی ناک کی کاٹھی اونچی، رُخسار کی ہڈی نسبتاً اُبھری ہوئی، گھنی لانبی پلکیں اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کان بڑے، سُرخ و سپید رنگ جس میں شراب نوشی نے چمپئی دمک پیدا کر دی تھی........ ڈاڑھی زیادہ لمبی مولویانہ طرز کی نہیں رکھتے تھے، بلکہ کٹواتے تھے، یہ دو ڈھائی انگل سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، دہلی کے عوام کی وضع تھی، منہ پر ڈاڑھی، سر پر بال، انہوں نے یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی، جس دن ڈاڑھی بڑھائی، اُسی دن سر منڈایا........ لمبا قد ہونے کی وجہ سے اخیر عمر میں کمر میں ذرا خم آگیا تھا اور جھک کر چلتے تھے۔" [۲۴]

لباس

"غالبؔ کی پوشاک ہر لحاظ سے رئیسانہ تھی، "گھر پر دلّی کے شرفا کی طرح بَر کا پاجامہ اور کھُلی آستین کا الفی گریبان کا کرتا یا انگرکھا، سر پر ململ کی گول ہلکی ٹوپی ہوتی جس پر کامدانی یا کشیدے کڑھائی کا کام ہوتا تھا، جاڑوں میں گرم کپڑے کلی دار پاجامہ اور مرزئی پہنتے تھے، باہر نکلتے تو تنگ مہری کا آڑا پاجامہ، کرتا اور اس پر صدری یا جامہ دار کی چپکن اور اس پر نیمہ آستین، اوپر کسی بھاری اور قیمتی کپڑے کی قبا یا چغہ اور اس پر ایک جامہ، پاؤں میں گھتیلی جوتی یا لوکدار کفشی، اور ہاتھ میں موٹھ دار مضبوط لمبی لکڑی، اُس کی شام پر کندہ تھا : یا اسد اللہ الغالب۔"[۲۵]

نواب ضیاء الدین احمد خاں رَخشاں کی رُباعی ہے :

استادِ من آن پیر حق آگہ غالبؔ — اقلیم سخن را شہنشہ غالبؔ
میداشت عصای کندہ چو مہر بدست — بُد نقش بران "یا اسد اللہ الغالب"

---

[۲۴] ذکر غالب ۱۹۶۴ء ایڈیشن صفحہ ۳۷-۳۸، [۲۵] ایضاً صفحہ ۲۳۸،

"بعض اوقات ایک شالی رومال بھی کندھوں پر ڈال لیتے، یعنی رومال کا سموسہ بنا کے اُسے اِس طرح پُشت پر ڈال لیتے کہ اس کا ایک کونہ پیٹھ پر لٹکتا رہتا اور دوسرے دونوں کنارے شانوں سے گذر کر سینے پر آرہتے یا پھر سادہ طریقے پر گرد ایک چکر دے کر اُسے آگے پیچھے چھوڑ دیتے، سر پر عموماً کلاہِ پاپاخ یا سیاہ پوستیں کی چوگوشہ لمبی ٹوپی ہوتی تھی، کبھی کبھی مُغلئی انداز کا پٹکا بھی باندھتے تھے، یعنی نیچے مخروطی کلاہ اور اس پر دستار"[۲۶]

منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھا:

"تمہیں یاد ہوگا کہ میرے پاس برّہ کی پوستین کی ٹوپی تھی کہ مخوردہ ہو گئی ہے اور میرے سر پر کچھ نہیں، مجھے ٹوپی کی حاجت نہیں، البتہ ابریشمی لنگی چاہتا ہوں، جیسی پشاور اور ملتان میں بنتی ہے، اور اُن اطراف کے امرا اُسے زیبِ سر کرتے ہیں، لیکن ایسی لنگی ہو کہ اُس کے رنگ شوخ اور انگشت نما نہ ہوں، حاشیہ سرخ نہ ہو، کام اگرچہ نازک اور نفیس ہو، لیکن سونے چاندی کے تار اس میں نہ صرف ہوئے ہوں، ابریشم سیاہ اور سبز اور خاکستری اور زرد، اس کے تار و پود میں استعمال ہوا ہو، غالباً اس طرح کی چیز اس علاقے میں جلد اور آسانی سے دستیاب ہو جائے گی، تلاش کریں اور مہیا کر کے ڈاک سے مجھے بھیج دیں"[۲۷]

---

[۲۶] ایضاً صفہ ۲۳۹، اردوئے معلیٰ صفہ ۳۳۶،

[۲۷] ذکرِ غالب، صفہ ۲۳۹-۲۴۰،

فصلِ دوازدہم

عقائد

رموزِ دین نشناسم دُرُست ومعذورم
نہادِ من عجمی وطریق من عربیست

غالب کو اِسلام پر پختہ یقین تھا، اور" توحید وجودی کو اِسلام کا اصلِ اصول اور رکن رکین جانتے تھے" .... انہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک وجودی توحید اور دوسرے نبیؐ اور اہل بیت کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے، ...... اگرچہ مرزا صاحب کا اصل مذہب صلح کل تھا، مگر زیادہ تر اُن کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا، اور جناب امیرؑ کو وہ رسولِ خداؐ کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے"۔[1]

حقیقت میں غالب ایک سُنّی خاندان کا چشم وچراغ تھا، اس کے ننھیال اور ددھیال کے ارکان سُنی تھے، مگر ساری عمر شیعیت کا اعلان ہوتا رہا، شاید یہ ملّا عبدالصمد ہرمزد کی کرامت تھی کہ غالب نے اپنا عقیدہ بدل ڈالا[44]

مثنوی ابرِ گہر بار میں ارشاد فرمایا:

لبم در شمارِ ولی اللّٰہیست دِلم رازدارِ علیؓ اللّٰہیست

---

[1] یادگار صفحہ ۷۵-۷۶

[44] بامن میاویز ای پدر فرزندِ آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نکرد
(غالب)

نیا ساید اندیشہ جز با علیؓ | زا سمارنیند یشم اِلّا علیؓ
به بزمِ طرب همنوایم علیست | به کنجِ غم اندہ رُبایم علیست
نبیؐ را پزیرم به پیمانِ اُو | خدارا پرستم به ایمان اُو
خدایش روا نیست هرچند گفت | علیؓ را توانم خداوند گفت
پس از شاہ کس غیر دستور نیست | خداوندِ من از خدا دُور نیست
علیؓ راست بعد از نبیؐ جای اُو | همان حکم کُل دارد اجزای اُو
همانا پس از خاتم المرسلینؐ | بُوَد تا به مهدیؑ علیؓ جانشین
نژادِ علیؓ با محمدؐ یکیست | محمد همان تا محمدؐ یکیست
به ردّ و قبولِ کسانم چه کار؟ | علیؓ با یدم با جهانم چه کار؟
در اندیشه پنهان و پیدا علیست | سخن کز علیؓ میکنم با علیست
به هند و عراق و به گلزار و دشت | به سُوی علیؓ باشدم بازگشت
چه کاهد ز نیر دی گردانِ سپهر | چه کم گردد از خوبیٔ ماه و مهر
که دلختۂ دهلوی سکنی | زخاکِ نجف باشدش مدفنی

حضرت علیؓ کی شان میں چار قصیدے فارسی میں لکھے گئے، پہلے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چُون برگِ گل ز بادِ سحرگاهیم زبان
رقصد بنامِ حیدرِ کرّار در دهن
فیض دمم انا اسد اللہ بر آورم
منصور لاابالیٔ بی دار و بی رسن
شاہِ نجف، وصی نبیؐ مُرتضیٰ علیؓ
آن از ائمہ اوّل و ثانی ز پنجتن
ذاتش دلیلِ قاطعِ ختمِ نبوّت است
وقتِ غروبِ مهر و مه ماہ بی سخن

پیغمبرؐ آفتاب و فروغش جمال دین
بعد از نبیؐ امام مہ و پیروان پرن

ترکیب بند میں اعلان کیا گیا:

دینِ حق دارم، معاذ اللہ نصیری نیستم
گر نداند عیب جو باری خدا دانا ستی
با علیؓ دیر ستِ عہدِ حق پرستی بستہ ام
وان بروزی بود کش روزِ ازل فرداستی

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و با علیؓ دیوانہ ام

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

غالب! ہے رُتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علیؓ کو خدا کہوں

خطوط میں ارشاد فرمایا گیا:

(۱) سید یوسف مرزا شیعہ تھا، لکھا گیا:

"جانتے ہو کہ علیؓ کا بندہ ہوں، اُس کی قسم جھوٹ نہیں کھاتا،" [۱]

(۲) مرزا خاتم علی مہر کو لکھا:

صاحب بندہ! اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر

---

[۱] خطوط صفہ ۱۵۸،

بارہ[۱۲] کا ہندسہ کرتا ہوں، خدا کرے میرا خاتمہ بھی اسی عقیدے پر ہو، ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔"[۳]

غالب نے جا بجا موحد ہونے کا اعلان کیا ہے:

(۱) ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

---

(۲) غالب آزادۂ موحد کیشم | بر پاکئ خویشتن گواہِ خویشم
گفتم بہ سخن برفتگان نرسد | از بازپسین نکتہ گزاران بیشم

---

(۳) نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھا:

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے، میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں، زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں، انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے، محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعٰلمین ہیں، مقطع نبوت کا مطلع امامت کا، اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے، اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن، ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام، ع بریں زیستم ہم بریں بگذرم

---

[۳] ایضاً صفحہ ۲۹۹،

ہاں! اتنی بات اور ہے کہ اِباحت اور زِندقہ کو مردُود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں، اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے، تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا، بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا، تاکہ مشرکینِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اس میں جلیں،، ۴؎

ذکرِ غالب میں مالک رام لکھتے ہیں:

"ہم ان کی شیعیت کی مختصر لفظوں میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں، کہ اُن کا امتیازی نشان تبرّا نہیں، بلکہ تولاّ ہے، یعنی وہ عموماً دوسرے صحابہ پر تبرّا نہیں کرتے، بلکہ حضرت علیؓ سے اپنے تولاّ اور محبّت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں" ۵؎

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ غالب نے اثنا عشری عقیدے کا جا بجا اعلان کیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے اہلسنّت والجماعت کے طریقہ پر میر نصیر الدین عرف کالے میاں سے بیعت کر رکھی تھی؟ چنانچہ میر مہدی مجروح کو لکھا:

"میاں لڑکے سُنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں، شاہ محمد اعظم صاحب کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے، اور میں مُرید ہوں اُس خاندان کا...... صوفی صافی ہوں، اور حضراتِ صوفیہ حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں ۶؎

ع گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی"

ہمارا شاعر صوُفی صافی تھا، شیعیت کے علاوہ صوفی ہونے کا اعلان بھی شد و مد سے کیا جاتا تھا، مثلاً

۴؎ ایضاً ۳۴۴-۳۴۵، ۵؎ ذکرِ غالب صفحہ ۳۱۵، ۶؎ خطوط صفحہ ۱۴۱،

(۱) یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

---

(۲) ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر، قلم مدّعی و نکتہ گو است

---

(۳) "مولانا علائی! نہ مجھے خوفِ مرگ ہے، نہ دعویٰ صبر ہے، میرا مذہب بخلاف عقیدۂ قدریہ جبر ہے۔"[۱]

(۴) سرفراز حسین کو لکھا:

"میں صوفی ہوں، ہمہ اوست، کا دم بھرتا ہوں"

رباعی

(۵) غالب روش مردمِ آزاد جداست | رفتارِ اسیرانِ رہ و زاد جداست
ما ترکِ مراد را ارم می دانیم | وان باغچۂ ضبطیٔ شدّاد جداست

ولہ

راہیست ز عبد تا حضور اللہ | خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشاں ہا دارد | سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

ولہ

ای دادہ بباد عمر در لہو و فسوس | زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار کز آتشِ جہنم حق را | تہذیب غرض بود و تعذیبِ نفوس

---

[۱] ایضاً صفہ ۳۴۶،

فصلِ سیزدہم

اخلاق و عادات

غالبؔ اخلاق حمیدہ اور اوصاف ستودہ کا مالک تھا، اس میں خودداری، فراخ حوصلگی، ایثار و محبت، مروّت، حق پسندی، احسانمندی، ہمدردی، دوست نوازی، راست گفتاری، جدّت، زندہ دلی، ظرافت، شوخی اور سخاوت بدرجۂ اتم موجود تھی، اس کے رہن سہن کا نوّابانہ ٹھاٹھ باٹھ تھا، مکان ایسا ہوتا جس میں محل سرا اور دیوانخانہ علیحدہ ہوتے، ہر وقت پانچ پانچ چھ چھ ملازم موجود رہتے، حتّٰی کہ سفر میں بھی تین تین ملازم ساتھ رہتے، کہتے ہیں کہ غدر کے زمانے میں جب اُسکی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی اس وقت بھی چھ ملازم موجود تھے، کلو داروغہ اور کلیان، مردانے میں، اور دو لونڈے نیاز علی اور ایاز اور ایک دداا اور ایک خادمہ وفادار زنانے میں، [1]

فراخ حوصلگی

حالیؔ لکھتے ہیں کہ "مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا، سائل اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا، مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لُولے اور

---

[1] ذکر غالب صفحہ ۲۵۹،

اپاہج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے...... وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لئے تنگ رہتے تھے، غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا، لفٹننٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے، مرزا کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا، اس لئے اُنہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں، چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا، اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا، ؎۲

ایک خط میں ایثار و قربانی اور سخاوت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے، نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سُوت کی رسی کے لٹکالوں اور پا پیادہ چل دُوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں، اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے، خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بُوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں،" ؎۳

ایثار و محبت

حالی نے دوستوں کے ساتھ غالب کے شریفانہ سلوک کی ایک عمدہ مثال

؎۲ یادگار صفحہ ۶۳، ؎۳ ایضاً صفحہ ۶۴،

کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد اُن کی حالت سقیم ہوگئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے، مرزا نے کبھی اُن کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا، چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا، اُن سے پوچھا کہ: چھینٹ آپ نے کہاں سے لی ہے؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ مجھے بھی فرغل کے لئے چھینٹ منگوا دیں، انہوں نے کہا: 'یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے، مرزا نے کہا: جی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لو، مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائینگے؟ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انہیں پہنا دیا، اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا،، [۱]

غالؔب میں خودداری، جدّت، ظرافت، احسانمندی اور دوستوں، رشتہ داروں اور شاگردوں سے محبّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں،

خودداری

عزّتِ نفس کا دُوسرا نام خودداری ہے، غالؔب کو اپنی عزّت نفس کا بہت زیادہ پاس تھا، بلکہ اگر دیکھا جائے تو اسی وجہ سے لوگوں نے "بد دماغ" ہونے کا الزام بھی تراشا تھا، اگرچہ ساری عمر مدح نگاری میں گذری مگر خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا، کسی نے سچ کہا ہے کہ "مدح نگاری کا تعلق

---

[۱] ایضاً صفہ ۶۳-۶۴،

شاعری سے ہے، جو اکتسابی چیز ہے، اور خودداری کردار کا جزو ہے، جو فطری چیز ہے، بنا بریں معاصرین غالبؔ کے اعتراضات سراسر غلط اور پوچ تھے کہ اُس کو خودداری کا کوئی پاس نہ تھا، وہ ہر ایک سے برابر کا سلوک روا رکھتا تھا، اور ہر ایک سے برابر کی ملاقات تھی، جو لوگ اس کے پاس نہیں آتے تھے وُہ بھی ان کے یہاں نہیں جاتا تھا، حفظِ وضع کا یہ عالم تھا کہ بغیر پالکی یا ہوادار کے کہیں نہ نکلتا، غازی الدین حیدر شاہ کے وزیرِ اعظم آغا میر کے دربار میں اس لئے نہیں گیا کہ آغا میر کو غالبؔ کی دو شرطیں (نقد نذر پیش کرنے سے معافی اور معانقہ) منظور نہ تھیں، دِلّی کالج کی فارسی مدرسی کے سلسلہ میں مسٹر ٹامسن سے ملے بغیر اِس لئے لوٹنا پڑا کہ مسٹر ٹامسن نے استقبال کرنے سے انکار کر دیا تھا، بقول غالبؔ :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جدّت

جدّت اور غالبؔ لازم ملزوم ہیں، بلکہ مترادف ہیں۔ اگر غالبؔ کو خلاق جدّت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، رہن سہن، پوشاک، خوراک، شعرگوئی، شعرخوانی حتیٰ کہ شراب پینے میں بھی جدّت کارفرما ہوتی تھی، اُس کے قصائد میں تشبیب کے اشعار زیادہ، مدح کے اشعار کم پائے جاتے ہیں، جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی روز سر منڈایا، اس کے ہر فعل میں انفرادیت پائی جاتی تھی، اور یہی انفرادیت اُس کو دیگر رؤسا اور شعراء سے ممیز کرتی ہے، کیا خوب کہا ہے :

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

تلامذہ

غالب کو اپنے عزیز و اقارب، احباب اور تلامذہ سے بے پناہ محبت تھی، خصوصاً شاگردوں سے امتیازی سلوک برتا جاتا تھا، شاگردوں میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، ناظم اور بیتاب اور توفیق کے علاوہ دیگر والیانِ ریاست اور شہزادے، اور ذکا اور قدر اور تفتہ کے سے ملازمت پیشہ صاحبان، اور شیفتہ، عرشی اور حقیر کے سے عالم فاضل بزرگ، اور مونس اور درد اور آرام کے سے معمولی پڑھے لکھے لوگ، لیکن وہ سب سے یکساں مہربانی اور لطف سے پیش آتے،، ؎۵

میر مہدی مجروح، میرزا حاتم علی بیگ مہر، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں، نواب علاء الدین احمد خاں علائی ؎۶ ، نواب زین العابدین خاں عارف اور منشی جواہر سنگھ جوہر نامی گرامی شاگرد تھے،

ظرافت

حالی لکھتے ہیں:

"مرزا کی تقریریں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا، اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے، وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، لطف سے خالی نہ ہوتا تھا، ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے، حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا" ؎۷

؎۵ ذکر غالب صفہ ۲۹۳،

؎۶ علائی کو اپنا جانشین مقرر کیا (خطوط صفہ ۳۷۲) ؎۷ یادگار صفہ ۶۷

ظرافت گویا غالب کی گھٹی میں پڑی تھی، اور یہی اس کی مایۂ نازشانِ امتیاز بھی تھی، اُس کو زندگی بھر چین نصیب نہیں ہوا تھا، وُہ طرح طرح کے آلام اور مصائب میں گرفتار رہا، غرض یہ کہ ذہنی، مالی اور جسمانی طور پر اس کو اطمینان حاصل نہ تھا، اس نے اپنے آپ کو خوش رکھنے کی خاطر حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور ظرافت کو اپنا شعار بنایا، خود بھی خوش ہوتا اور مخاطبین کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتا، ظرافت اس کی فطرۃِ ثانی بن گئی تھی،

لطیفے

غالب طبعاً ظریف تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ محفل پر چھا جاتا تھا، یادگار غالب سے لئے ہوئے چند لطیفے قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) دِلّی میں رَتھ کو بعضے مؤنث اور بعضے مذکر بولتے ہیں، کسی نے مرزا سے پوچھا کہ "حضرت رتھ مؤنث ہے یا مذکر"؟

آپ نے کہا: "بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو، اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو" ؎

(۲) غدر کے زمانے میں کچھ گورے مکان میں گھُس آئے تھے، مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براؤن کے رو برو جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے لے گئے، کرنل براؤن نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہم کو رخصت کر دیا،

"سُنا ہے کہ جب کرنل براؤن کے رو برو گئے تو اُس وقت کلاہ پاپاخ اُن کے سر پر تھی، انہوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ "ول تم مسلمان"؟

؎ یادگار صفہ ۲۷،

مرزا نے کہا: 'آدھا' کرنیل نے کہا: اس کا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا: شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا، کرنیل یہ سن کر ہنسنے لگا"۔ ۹ے

(۳)　جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لئے رام پور گئے، چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا لفٹننٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا، ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے، چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا سے کہا: 'خدا کے سپرد'،

مرزا نے کہا: 'حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا خدا کے سپرد کرتے ہیں،، ۱۰ے

(۴)　مولوی امین الدین کی کتاب قاطع القاطع کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا، اس میں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے، کسی نے کہا: حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا!

مرزا نے کہا: "اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی لات مارو گے"؟ ۱۱ے

(۵)　ایک مرتبہ کسی مخالف نے مرزا کو خط لکھا جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا، اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی، مسکرا کے کہنے لگے کہ اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی، بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں، تاکہ اُس کو غیرت آئے، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں، کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا، یہ قرمساق (بھڑوا) جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے، اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا"۔ ۱۲ے

۹ے ایضاً صفہ ۳۸-۳۹، ۱۰ے ایضاً صفہ ۴۱،

۱۱ے ایضا صفہ ۴۸-۴۹، ۱۲ے ایضاً صفہ ۵۳-۵۴،

(۶) ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا کہ آپ نے بہ سببِ ذوقِ کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی، اس کے جواب میں لکھتے ہیں: لاحول ولاقوۃ! کس ملعون نے بسببِ ذوقِ شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار، میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجان درویش لکھا تھا، جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔" [۱۳]

(۷) ایک دفعہ جب رمضان گزر گیا تو مرزا قلعے میں گئے، بادشاہ نے پوچھا: مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟

عرض کیا: "پیرو مرشد! ایک نہیں رکھا" [۱۴]

(۸) ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے اُن کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے، تو وہاں نواب صاحب اُن کو لینے کے لئے کھڑے تھے، مرزا نے اُن کو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا: ع "کہ آبِ چشمۂ حیوان درونِ تاریکیست، جب دیوان خانے میں پہنچے، تو اُس کے دالان میں بہ سببِ شرق رُویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی، مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا:

ع "این خانہ تمام آفتاب است" [۱۵]

(۹) ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے، شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، انہوں نے سودا کو میر تقی پر ترجیح دی، مرزا نے کہا: میں تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں، [۱۶]

(۱۰) مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ مکان کے

---

[۱۳] ایضاً صفہ ۶۲، ۶۳، [۱۴] ایضاً صفہ ۶۷،

[۱۵] ایضاً صفہ ۶۷، [۱۶] ایضاً صفہ ۶۴

دروازے کی چھت پر تھا، اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی، جس کا در اِس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا، اُس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا، اور مرزاؔ اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے، ایک دن جب کہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہؔ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزاؔ سے ملنے کو چلے آئے، اُس وقت مرزاؔ صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے، مولانا بھی وہیں پہنچے، اور مرزاؔ کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے دیکھ کہنے لگے کہ: "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقیّد رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہوگیا، مرزاؔ نے کہا: قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"[۱۷]

(۱۱) ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا، مرزاؔ نے مسکرا کر کہا: اگر برتنوں کی کثرت کا خیال کیجیے، تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے، اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزیدؔ کا،[۱۸]

(۱۲) ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزاؔ بھی تھے، باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے، آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے، یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا، مرزاؔ بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے، بادشاہ نے پوچھا: "مرزاؔ اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟" مرزاؔ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: پیر و مرشد! یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ؎

---

[۱۷] ایضاً صفہ ۲۷، ۲۸، [۱۸] ایضاً صفہ ۶۹،

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیان
کابن فلان ابنِ فلان ابن فلان

اُس کو دیکھتا ہوں کہ کسی نے میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں، بادشاہ مسکرائے، اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی، [۱۹]

(۱۳) حکیم رضی الدین جو مرزا کے نہایت دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے، ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے، مرزا بھی وہیں موجود تھے، ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گزرا، آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا، حکیم صاحب نے کہا: دیکھئے آم ایسی چیز ہے، جسے گدھا بھی نہیں کھاتا،

مرزا نے کہا: "بے شک گدھا نہیں کھاتا" [۲۰]

(۱۴) ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں، جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو، مرزا نے کہا: "بھئی! میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو" [۲۱]

(۱۵) مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے بے تکلفی تھی اکثر شام کو اُن کے پاس جاکر بیٹھتے تھے، اور مرزا سُرور کے عالم میں اُس وقت پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے، ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے، اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے لگے، مرزا نے کہا: بھئی تو سیّد زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ انہوں نے نہ مانا اور

---

[۱۹] ایضاً صفہ ۷۰، [۲۰] ایضاً صفہ ۷۰-۷۱، [۲۱] ایضاً صفہ ۷۱،

کہا: "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا، مرزا نے کہا: ہاں! اس کا مضائقہ نہیں، جب وہ پیر داب چکے، انہوں نے اُجرت طلب کی، مرزا نے کہا: بھیّا! کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا"، ۲۲ہ

(۱۶) ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں شامی کباب تھے، میں بھی وہاں موجود تھا، اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا، مرزا صاحب نے کہا: آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا"، ۲۳ہ

(۱۷) ایک دن سیّد سردار مرزا مرحوم کے یہاں شام کو چلے آئے، جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں، انہوں نے کہا: قبلہ وکعبہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا، مرزا نے کہا: "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں"، ۲۴ہ

(۱۸) شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں، ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمّت کی، اور کہا کہ شراب خور کی دعا قبول نہیں ہوتی، مرزا نے کہا: بھائی! جس کو شراب میسر ہے، اُس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے دعا مانگے"، ۲۵ہ

(۱۹) غدر کے بعد جب کہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی، پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے

۲۲ہ ایضاً صفہ ۷۲، ۲۳ہ ایضاً صفہ ۷۲،
۲۴ہ ایضاً صفہ ۷۳، ۲۵ہ ایضاً صفہ ۷۳،

ملنے کو آئے، کچھ پنشن کا ذکر چلا، مرزا صاحب نے کہا: 'تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا؟' [۲۶]

(۲۰) "رمضان کا مہینہ تھا، ایک سُنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے، عصر کا وقت تھا، مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا، مولوی صاحب نے تعجب سے کہا: 'کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟' مرزا نے کہا: 'سُنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں'" [۲۷]

(۲۱) "جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرہ سامنے رکھا تھا، طوطا سردی کے سبب پروں میں مُنہ چھپائے بیٹھا تھا، مرزا نے دیکھ کر کہا: 'میاں مٹھو! نہ تمہارے جورُو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟'" [۲۸]

---

[۲۶] ایضاً صفہ ، [۲۷] ایضاً صفہ ۷۷ ، [۲۸] ایضاً صفہ ۹۹ ،

باب دُوم

کلام پر ریویو

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

فصلِ اوّل

۱۔ شاعر اور اس کا فن

فرجامِ سخنگوئیِ غالبؔ بتو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن

انگلستان کا مشہور و معروف شاعر شیلی کہتا ہے

"شاعری ذہن کو بیدار کرتی ہے، اس میں وسعت پیدا کرتی ہے، اور ذہن کے خلاؤں میں ہزاروں نئے تصوّرات اور افکار کے سلسلے قائم کرتی ہے، شاعری حسنِ پنہاں کو بے نقاب کرتی ہے، یہ جن اشیا کی نمایندگی کرتی ہے، انہیں دوبارہ تخلیق کرتی ہے، شاعر کے تخیّل میں جو نقوش آتے ہیں، وہ فردوسی الوار میں ڈوبے ہوئے، قائم و دائم رہتے ہیں، جیسے وہ شعری محرکات کی عظیم یادگاریں ہوں، یہ اصنامِ فکر، تمام دوسرے اشغال و افکار پر حاوی ہو جاتے ہیں۔" [۱]

نظامی عروضی سمرقندی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف چہار مقالہ میں شعر و شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شاعری صناعتی است کہ شاعر بدان صناعت اِتساق مقدمات موہمہ کند، والتیامِ قیاسات منتجہ برآں وجہ کہ معنیٔ خُرد را بزرگ گرداند،

---

[۱] پروز ورکس، جلد اوّل، صفحہ ۱۱

ومعنیٔ بزرگ را خرد، ونیکو را در خلعتِ زشت باز نماید، وزشت را در صورت نیکو جلوہ کند، وبایہام قوتہای غضبانی وشہوانی برانگیزد تا بدان ایہام طباع را انقباضی وانبساطی بود، وامورِ عظام را در نظامِ عالم سبب شود"۔ ۲

"شاعری فنونِ لطیفہ کی ملکہ ہے، یہ فطرت کی منظورِ نظر ہے، جب فن اِسے حسین ترین سانچے میں ڈھالتا ہے، تو یہ حُسن وتناسب میں دیگر تمام فنون سے بازی لے جاتی ہے"۔ ۳

بقول شیکسپیئر:

"شاعری گوند کے مانند ہے جو (شاعر کے ذہن) سے رِستی رہتی ہے، چقماق کی آگ چھپی رہتی ہے، جب تک ضرب نہ لگائی جائے، لیکن ہمارا لطیف شعلہ خود بھڑک اٹھتا ہے، اور بہاؤ کی طرح ہر حد تک توڑ دیتا ہے، آگ لگا دیتا ہے"۔ ۴

حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی تعریف کرنا آسان ہے، مگر اِسے سمجھنا مشکل ہے، اس کی تعریف اکثر "منظوم نثر" اور "پُرجوش تنظیم" کے درمیان متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، دوسرے الفاظ میں، تعریف سے زیادہ مغالطہ انگیز اُن الفاظ کی کمیّت ہے جو تعریف میں شامل ہوتے ہیں، غالب نے شاعری کی تصنیف یوں کی ہے:

"صناعتِ شعر اعضا وجوارح کا کام نہیں، دماغ چاہیے، امنگ چاہیے"۔ ۵

---

۲ چہار مقالہ صفہ ۵۱،

۳ شائرلے

۴ ٹائمن آف ایتھنز

۵ عودِ ہندی صفہ ۴۸،

دوسری جگہ کہا ہے:

"شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں"۔[۶]

ایک اور جگہ کہا ہے:

"گفتار موزون کہ آن را شعر نامند، در ہر دل جای دیگر، و در ہر دیدہ رنگی دیگر، و سخن سرایان را ہر زخمہ جُنبشی دیگر، و ہر ساز و آہنگی دیگر دارد"۔[۷]

نیز آخر میں:

"سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے، تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے، دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اِس لباس اور اِس زیور میں رو کشِ ماہِ تمام پایا ہے"۔[۸]

اس نظریہ کی بِنا پر شاعری تمام فنونِ لطیفہ سے زیادہ لطیف اور مشکل فن ہے، غالب کہتا ہے:

زِ شاہان سخن گر گہر سفتن است
سخن گفتن از حق جگر سفتن است

لہذا شاعر کو فن کی نزاکتوں سے اچھی طرح آشنا اور باخبر ہونا چاہیئے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے لکھا ہے:

"اَمّا شاعر باید کہ سلیم الفطرت، عظیم الفکرت، صحیح الطبع، جیّد الرّویہ، دقیق النّظر باشد، و در انواع علوم متنوع شد، و در اطرافِ رسوم مستطرف، زیرا کہ چنانکہ شعر در ہر علمی بکار ہمی شود، ہر علمی در شعر بکار ہمی شود"۔[۹]

شاعری وہ لطیف و نفیس فن ہے جو ہمیں رُوحانی مسرتوں سے ہمکنار کرتا ہے

---

[۶] خطوط صفحہ ۸۴، [۷] کلیاتِ نثر صفحہ ۲۴۲، [۸] عودِ ہندی صفحہ ۱۸،
[۹] چہار مقالہ صفحہ ۵۵،

احساسِ جمال اور سرخوشی پیدا کرتا ہے، ہمارے سینوں میں حسن اور ناقابلِ حصول عظمتوں کے لئے تڑپ پیدا کرتا ہے، یہ تڑپ ہمیں عالم جاوداں کی تسخیر پر آمادہ کرتی ہے، مجموعی طور پر شاعری ہمیں موسیقی، حسن اور محبت کی زندگی گذارنا سکھاتی ہے،

شاعری کا مقصد انسانی زندگی کو زیادہ ہمہ گیر اور حقیقی بنانا ہے، اس کے ذریعہ انسان اُن حقائق کا شکاری بن جاتا ہے، جن کی تعبیر زندگی ہے، حقیقی شاعری وہی ہے جو ہمیں حقیقت سے آشنا کرتی ہے، شاعری کے سہارے، ہم محض چوبیس گھنٹہ روزمرہ کی زندگی کے بجائے عظیم مواقع اور عظیم لمحات کی زندگی بسر کرتے ہیں، ایسی شاعری دوہری تخلیق رکھتی ہے، اس کا باپ اِفادہ اور ماں ملکۂ جمال ہے،

شعراء اس فنِ لطیف کے امین ہوتے ہیں، وہ اپنی دنیا اور اپنے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ اپنا ماحول اور اپنی دُنیا خود تخلیق کرتے ہیں، ان کی دنیا گمبھیر تصورات، اعلیٰ تخیل، اور جوشِ سرمستی سے آباد ہوتے ہیں، شاعر جگنو کے مانند ہوتا ہے، بقول اقبالؔ:

کرمِ شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پر و بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست

وہ اپنی روشنی مختلف اور غیر مساوی وقفوں کے ساتھ پھیلاتا رہتا ہے، شعراء کے حساس اور نازک دل، ان کے پیکر میں حسّاس ذہن، تیز ادراک اور گہرا تخیل پیدا کرتے ہیں، یہ تخیل جو ان کے زرخیز ذہنوں کی جولانگاہ ہوتا ہے، انہیں ایسے مقامات پر لے جاتا ہے، جنہیں ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ شاعر خیال کے گہرے اور پرُخطر سمندروں میں شناوری کرتا ہے، اور ایسے موتی لاتا ہے جو اچھوتے اور انمول ہوتے ہیں،

شاعر کا دِل تار کی لرزش پر دھڑکتا ہے، وہ ایسی حساس مخلوق ہے، جسے مسرت اور آنسوؤں سے بنایا گیا ہے، جو موقع کے اعتبار سے غمگین اور مسرّت آشنا ہوتی ہے، شاعر اپنے دل اور اپنے فن کا وفادار ہے، سورج مکھی کی طرح وہ خیال کی رو کے ساتھ

گردش کرتا ہے، اپنی ہر لمحہ بدلتے ہوئے سلسلۂ خیال و تصوّر کی مدد سے، معجزے دکھاتا ہے، جنون، نغمۂ موزوں بن کر، اس کے لب سے رواں ہوتا ہے، جس طرح شہد، چھتّے سے ٹپکتا ہے، شہد کی مکھی کی طرح وہ ہر شے سے شیرینی اخذ کرتا ہے، اور اُس کو شکل صورت بخشتا ہے، وہ غموں کے ذریعے اکتسابِ علم کرتا ہے، اور نغموں کی صورت میں تعلیم دیتا ہے، جو احساس پارے اس کے نازک دل سے نکلتے ہیں، وہ اُس نازک اور حساس دل کے سچے آئینہ دار ہوتے ہیں، وہ کسی حد تک جنون پسند ہوتا ہے، لیکن اس کا جنون، فتورِ دماغ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، حالانکہ عاشق اور مجنون کی بہت سی صفات مشترک ہوتی ہیں، فرق یہ ہوتا ہے کہ اس کا جنون، حسین تصورات اور آسمانی نغموں کے پھول کھلاتا ہے، وہ انفرادیت رکھتا ہے، اسی لئے کسی قدر ضدّی ہوتا ہے، اس کے تخیل سے خار بھی گل تازہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے،

شاعر زندگی کا خاموش تماشائی اور فطرت کا سچا طالب علم ہے، وہ شعری محرکات کے لئے مجبوراً کوشاں نہیں ہوتا، وہ اُسے فطرت، زندگی اور اس اشیار سے اخذ کر لیتا ہے، جو اس کے ادراک کو متأثر کرتی ہے، وہ شعریت عالم قدس سے ہمراہ لاتا ہے، بقول ورڈزورتھ:

"اگر تو واقعی عالمِ قدس سے کسبِ نور کرتا ہے، تب اسی
ازلی نور کا پیمانہ بن کر چمک، اے شاعر!"

وہ زمان و مکان سے بے نیاز ہے، اس کا مقام ہی مختلف ہے، روشن ضمیروں کی بصارت کے ساتھ وہ ہر چیز کو تینوں زمانوں (ماضی۔حال، مستقبل) اور تین اطراف میں بھانپ لیتا ہے، اشیا کا نظارہ کر کے اُن کے باطن میں ڈوب جاتا ہے،

وہ اِنسانیت کا شریف اور سچا خادم ہے، وہ رُوح کو ازلی نور سے نہلا کر جہانِ آب و گل سے بلند کرتا ہے، اور ملاءِ اعلیٰ کی رفعتوں پر لے جا کر باریاب حضور یزداں کرتا ہے، وہ مٹی کے پُتلوں میں روح پھونکتا ہے، اعلیٰ صفات کو

جگاتا ہے، اور اِس طرح اقوام کو شجاعت اور صداقت کے کارناموں کے لئے آمادہ کرتا ہے، وہ ملت کی آنکھ ہے، تہذیب کا مشعل بردار ہے، روح عصر ہے، آئینہ تاریخ ہے، بقول ٹینی سن:

"یہ فن کا مغنّی ہے،
اس کی تلقین بیکار نہیں ہے،
وہ نغمہ جو ملّت کے قلوب کو گرماتا ہے،
بجائے خود ایک کارنامہ ہے"

مزید یہ کہ شاعر بیک وقت فلسفی، غیب دان اور تصوّر پرست ہوتا ہے، وہ ماضی بعید کی آواز ہے، حال کی آنکھ اور مستقبل کی زبان ہے، وہ ایک خاص مقصد اور تصور کے ساتھ آتا ہے، اس کا مشن، حسن اور صداقت کی نقاب کشائی کرتا ہے، ولولہ انگیز زبان و بیان کے سہارے، وہ دلوں میں اِس جذبۂ بے اختیار کی آگ لگا دیتا ہے، جو خود اس کے دل میں روشن ہے، بڑی عمدگی کے ساتھ وہ خود بلند ہوتا ہے اور ہمیں کرّۂ خاکی سے اٹھاکر، صداقت، حسن اور عشق کے بامِ بلند پر فائز ہونے کی تعلیم دیتا ہے،

یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ غالبؔ، شعر و شاعر کے اِس تصور پر پُورا اُترتا ہے یا نہیں، اگرچہ اس کی اردو شاعری کی پذیرائی بڑی گرمجوشی سے کی گئی ہے، لیکن اس کی فارسی شاعری سے افسوسناک عدم توجہی برتی گئی ہے، اس کے اسباب "مقدمہ" میں بیان کئے گئے ہیں، آیندہ اوراق میں اسکی فارسی شاعری سے انصاف برتنے کی کوشش کی گئی ہے،

۲- غالبؔ کی شاعری کا آغاز

غالبؔ نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار آٹھ سال کی عمر میں کر دیا تھا۔ یہ امر اگرچہ ناقابل یقین ہے، لیکن اس کی سند میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب غالبؔ مشکل سے آٹھ برس کا تھا، تو اس نے ایک اردو مثنوی بعنوان

پتنگ بازی موزوں[۱] کی تھی، یہ ابتدائی نظم شاعر کے موروثی تخیل کی آئینہ دار ہے، اور دس اشعار پر مشتمل ہے، اور اسے اس کی شخصیت اور صلاحیت کا پیمانہ کہا جا سکتا ہے، یہ نظم بڑی نفیس ہے اس کی زبان سادہ اور با محاورہ ہے اور پتنگ بازی کی اصطلاحات سے پُر ہے، پوری نظم مندرجۂ ذیل ہے:

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی — لے کے دِل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کھنیانے لگا — اِس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا: اے دل ہوائے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہینگے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈالکر
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے دِل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت ان سے اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطہ میں جا کر دیا کٹ کر جواب

"رشتہ ای در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

سید غلام حسنین بلگرامی کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے، کہ غالب نے شاعری پر تجربے بارہ[۱۲] سال کی عمر سے شروع کر دیئے تھے[۲] لیکن غالباً اس نے پندرہ[۱۵] سال کی عمر سے پہلے اس فن پر سنجیدگی سے توجہ نہیں کی تھی، حالانکہ فارسی دیوان کی تقریظ میں غالب نے ابتدائے شاعری کی عمر تیرہ[۱۳] سال لکھی ہے[۴]، ان مختلف بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شاعری کے آغاز کا صحیح زمانہ کچھ بھی رہا ہو لیکن

---

[۱] مجلۂ اردو، جلد گیارہ صفہ ۵۱۶، یادگار صفہ ۱۱۰ حاشیہ،
[۲] خطوط صفہ ۷۷، [۳] ایضاً صفہ ۱۹۸، [۴] کلیات نثر صفہ ۶۷،

غالب کے بچپن کا زمانہ ضرور تھا،

حالی نے لکھا ہے، کہ شاعری کے ابتدائی اسباق، غالب نے شیخ معظم اکبر آبادی سے سیکھے، اور انہیں کو ابتدائی کاوشیں دِکھائیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب غالب کی عمر بمشکل گیارہ برس کی تھی، تو اس نے فارسی میں ایک غزل لکھی، جس کی ردیف کہ چہ تھی[۵]، استاد نے غزل پر سرسری نظر ڈال کر ردیف پر اعتراض کیا، بددل ہو کر، غالب اُستاد کے پاس سے چلا آیا، لیکن جلد ہی ظہوری کا کلیات لے کر اُستاد کے پاس واپس گیا اور اُسی ردیف میں ظہوری کی ایک غزل دکھائی، اُستاد شاگرد کی صلاحیت پر بڑا متحیر ہوا، اور اس نے غالب کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی کی ہے[۶] اسی طرح میر تقی میر کی پیشین گوئی کے بارے میں سب جانتے ہیں[۷]

غالب ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا، جب فارسی ادبی زبان کی حیثیت معدوم ہو رہی تھی، اور اردو اس کی جگہ لے رہی تھی، جو اگرچہ ابھی عالم طفولیت میں تھی، لیکن خاص اور عام کا مرکز فکر و نظر بن گئی تھی، یہ دباؤ ناقابل شکست تھا، اسی کے نتیجے میں غالب نے پہلے اردو میں اپنی مہارت آزمائی، اور مرزا عبدالقادر بیدل کے مبہم اسلوب کی پیروی میں غزلیں لکھیں، یہی وجہ ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری، ثقیل الفاظ اور فکری ابہام سے گرانبار ہے، بعد میں جب وہ اس روش سے کنارہ کش ہو گیا، تو اس کی غزلوں میں رعنائی، وقار اور اثر انگیزی پیدا ہو گئی، شروع میں وہ صوتی تاثر پر معنوی کیف کو قربان کر دیتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ، اس کا فن تکمیل پذیر ہوا، دوسرے الفاظ میں، اُس کا فن مذاقِ ادب کے نیلگوں سمندروں کی بے مقصد سیاحت سے شروع ہوا، لیکن تخیل کے خزانوں سے بھرا ہوا جہاز لے کر اِقلیم شاعری کے ساحل پر پہنچا۔

اپنی ابتدائی کاوشوں کو بیکار سمجھ کر ہمارے شاعر نے اردو کو خیر باد کہا، اور فارسی کی جانب متوجہ ہوا،

---

[۵] یادگار صفہ ۱۱۰، [۶] ایضاً صفہ ۱۱۰، [۷] ایضاً صفہ ۱۱۰، [۸] ایضاً صفہ ۱۱۲،

شمس الامرا نائب والی حیدر آباد کو لکھا:

"شعر و سخن را بانہادِ کمترین پیوندِ روحانیست، و خامہ ام از بدوِ فطرت در گہر افشانی در آغاز ریختہ گفتی، و بہ اردو زبان غزل سرای بودی، تا بہ پارسی زبان ذوقِ سخن یافت، از آن وادی عنانِ اندیشہ برتافت، و دیوان مختصری از ریختہ فراہم آوردم و آن را گلدستۂ طاقِ نسیان کردم، کم و بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است،، [۹]

فارسی اور اردو غزلوں کے مجموعۂ گلِ رعنا کی تقریظ میں غالب نے لکھا۔

"چون در آغاز خار خار جگر کاوی شوقم ہمہ صرفِ نگارشِ اشعارِ اردو زبان بود، در مسلکِ این تحریر نیز، ہمان جادہ گذاردہ، و ہمان راہ سپردہ شد" [۱۰]

غالب نے اردو سے کبھی دلی لگاؤ کا اظہار نہیں کیا، اس نے شفق کو ایک مرتبہ لکھا:

"ہر چند از دیر باز گفتنِ ریختہ نمی گرایم، و بپارسی زبان سخن می سرایم، لیکن چون رضائے ظلِّ الٰہی در آن است کہ این گونہ گفتارِ بیانِ حضرتِ فلک رفعت ارمغان می بردہ باشم، ناچار گاہ گاہ ریختہ ہمی گویم" [۱۱]

نیز سلطان محمد میسوری کو لکھا:

"روشن تر اینکہ در دہ سالگی آثارِ موزونیٔ طبع پیدائی گرفت دہ تا لختی سرمایہ دید و دانست فراز آمد، زبان اندازِ گزارش و کلک آئینِ نگارش یافت،، [۱۲]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دس سال کی عمر میں غالب کے تخیل نے پَر تولنا شروع کر دیئے تھے، یہاں تک کہ گیارہ سال کی عمر میں تخیل کی حیرت انگیز بلندیوں کو چھونا شروع کر دیا، شفق کے نام ایک اور خط میں لکھا ہے:

"از دیر باز دستان سرائی اردو نمی دانم، ہمانا از رضا جوئی

---

[۹] کلیات نثر صفحہ ۱۹۳، [۱۰] ایضاً صفحہ ۵۹، [۱۱] ایضاً صفحہ ۲۳۳، [۱۲] ایضاً صفحہ ۲۴۹

شہریارِ سلیمان پیشکار گاہ گاہ رنگ ریختہ ریختن ویژہ بفرمانِ بانوئے بلقیس پرستار بدین ردیفِ ناروا دل آویختن،،[۱۳]

مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"قبلہ! ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چنانچہ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا، جب آخر تمیز آئی، تو اُس دیوان کو دُور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے،،[۱۴]

نساخ کے نام لکھا ہے:[۱۵]

"خاکسار نے ابتدائے سن شعور میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے، پھر اوسط عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے، نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں، ہندوستان میں رہتا ہوں، مگر تیغِ اِصفہانی کا گھائل ہوں، جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا، اب نہ فارسی کی فکر، نہ اردو کا ذکر، ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، تین رسالے نثر کے[۱۶] یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے........ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی،،

۱۸۵۷ء میں قدر کے نام لکھا:

---

[۱۳] ایضاً صفہ ۲۲۵، [۱۴] عودِ ہندی صفہ ۱۵۲، [۱۵] اردوئے معلیٰ ۱۶۵،

[۱۶] کلیات نثر، عود ہندی، اردوئے معلیٰ،

"بارہ سال کی عمر سے کاغذِ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں، پچاس برس اس شیوہ کی ورزش میں گذرے،"[۱۷]

شیخ محمد معظم کے علاوہ ہمارے شاعر نے مُلّا عبد الصمد سے فارسی زبان کی نزاکتوں کے ساتھ، فن شاعری کی لطافتوں سے بھی مکمل واقفیت ضرور حاصل کی ہوگی، اور اُس نے صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے، اس کے مزاج میں شاعرانہ ذوق اور فن کی رُوح سمو دی ہوگی،

۳- فنی ارتقا

آگرہ میں غالبؔ کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی، اس لئے اِس بات کا امکان ہے، کہ وہ مشہور ماہرینِ فن سے استفادہ نہ کر سکا ہوگا، اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیدلؔ کے پلّے پڑ گیا، جس کا ذوقِ اسلوب دُور از کار اور بعید از قیاس تشبیہات و استعارات سے پُر ہے، بیدلؔ ہی کے مطالعہ سے غالبؔ کا اثر پذیر ذہن مبہم لغات اور ہندوستانی تراکیب کے فریب میں مُبتلا رہا، اس اثر نے نہ صرف اس کے فن کو بھدا اور ثقیل، بلکہ مبہم، مہمل اور بے محل بنا دیا، اس رنگ کے بہترین اشعار بھی ثقیل اور نامانوس الفاظ، مصنوعی تراکیب اور دُور از کار خیالات کا مجموعہ ہیں، اِن میں صوتی تاثر پر معنوی اثر کو قربان کیا گیا ہے، ان اشعار نے رُسواکُن اور ہمت شکن تنقید کو دعوت دی، میر تقی میرؔ کے فیصلے کا حوالہ دیا جا چکا ہے، یہ تو قسمت نے یاوری کی کہ غالبؔ دہلی ہجرت کر گیا، دار السلطنت ہونے کے علاوہ، یہ شہر مختلف صلاحیتوں کے افراد، مثلاً فلاسفہ علمائے دین، مذہبی و سماجی مصلحین اور مشاہیر شعرا کا مرکز تھا، یہاں غالبؔ کو اعلیٰ ترین صحبتیں نصیب ہوئیں،

مولانا صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے انتہائی نیک نیتی اور خلوص دِل کے ساتھ اُسے راہِ راست دکھائی، اور مخاصمانہ تنقید کو فرد کیا، اس اِصلاح کے بعد ہی ہم غالبؔ کو ایک بڑے فن کے عظیم فنکار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں،

غالبؔ میں شاعرِ فردا کی خصوصیات دیکھ کر، اِن شرفاء نے اپنا فرض سمجھا کہ

---

۱۷ خطوط صفہ ۱۷۷،

اس کو تاریکی سے نکالا جائے اور صراط المستقیم پر گامزن کیا جائے، شروع میں ان حضرات کی تنقیدِ پیہم سے غالب پریشان ہوا، لیکن آخرکار ان کی نیت کا اندازہ کر کے اُس نے اُنکے مشوروں پر ہمدردانہ غور کیا، اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر، پیچیدہ اور پُرصعوبت روش کو ترک کر دیا، چنانچہ وہ راہِ راست پر آگیا جس کے نتیجے میں نہ صرف اُس کی شہرت میں اِضافہ ہونے لگا، بلکہ اس کا شمار صفِ اوّل میں ہونے لگا، اس انقلاب سے غالب کی بے پناہ سلیم الطبعی کا پتہ بھی چلتا ہے، کیونکہ اگر اس کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا، تو یا تو بددل ہو کر اس فن کو یک لخت ترک کر دیتا، یا ان حضرات سے کنارہ کش ہو جاتا، جو بظاہر بے انصاف اور بے مہر نکتہ چین معلوم ہوتے تھے، بے شک، سچی اور مخلصانہ تنقید بہت وزنی اور بڑی انمول ہوتی ہے۔

ادبی ماحول

دہلی اس زمانے میں ادبی اور علمی مشاغل سے گونج رہی تھی، مشاعرے عروج پر تھے، شعر و سخن کی محفلیں مختلف مقامات پر منعقد ہوتی تھیں، ادبی مناقشات اس پر مُستزاد تھے، حُسنِ اتفاق سے، اس شہر میں مشاہیر کی حویلیاں وہی مقاصد پورے کر رہی تھیں، جو انگلستان میں اٹھارویں صدی کے "لٹریری کلب" کر رہے تھے، ان اجتماعات میں شعراء، علماء اور محققین، زندگی کی یکسانیت میں تنوع پیدا کرنے کیلئے شریک ہوتے تھے، شعراء کو بہترین اور تازہ ترین کلام سُنانے کی غرض سے مدعو کیا جاتا تھا، اور چونکہ سامعین اعلیٰ مذاقِ شعر رکھتے تھے، اس لئے ہر شاعر اپنے کلام کے مقبول ہونے کے لئے حتی الامکان کوشش کرتا تھا، ان اجتماعات میں مقابلہ کی روح پیدا ہوتی تھی، اور شعراء پر اُس کا بڑا اثر ہوتا تھا، جس کے نتیجے میں اعلیٰ ترین شاعری وجود میں آنے لگی،

اِس ماحول میں یہ بات عجب نہیں، کہ غالب جو اِن اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوتا تھا، اپنے کلام کو بہ اعتبارِ لفظ و معنی خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتا ہوگا، اور تنقید کے خوف سے زرِ کم عیار کو زرِ خالص میں ڈھالنے کے لئے عرق ریزی بھی

کرتا ہوگا، چنانچہ اُس نے اسی بنا پر پامال تراکیب اور بدمذاق ثقالت سے رُوگردانی کرکے ایک منفرد اسلوب نکالا جس میں سلیس و رواں اور بامحاورہ الفاظ و تراکیب، نفیس تغزّل، نازک خیالات، پرشوکت اور حقیقت پسندانہ تخیل کی کارفرمائی ہوئی تھی،

۴- تین ادوار

پہلا دور :- جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، غالب نے دنیائے ادب میں اپنی مہمات عمر کے اوائل میں شروع کردی تھیں، اگر ابتدائی کاوشوں کا زمانہ ۱۸۱۲ء کو معین کریں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب پچیس[۲۵] سال کی عمر تک صرف گیسوئے اردو سنوارنے میں مصروف رہا، کیونکہ اس نے اپنا دیوان ۱۸۲۲ء میں مرتب کرلیا تھا[۱۸]، اس منزل پر اپنی اردو کاوشوں کو بے مصرف سمجھ کر، اُس نے اِس خیالی الفاظ کے مجموعے کو ضائع کردیا، اور اپنی صلاحیتوں کا رُخ فارسی کی جانب پھیر دیا، فارسی کی گرفت اُس کے تخیل اور روح پر تھی، چنانچہ ۱۸۲۲ء کے بعد، غالب نے پُورے جوش و انہماک کے ساتھ اس نئی منزل کی طرف پیش قدمی شروع کی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کی اردو شاعری سے وابستگی کا دور ۱۸۱۲ء سے ۱۸۲۲ء تک تھا،

دوسرا دور :- یہ دیکھ کر بے شمار متشاعروں نے ادبی ماحول پر قبضہ جما رکھا ہے، نیز یہ کہ خود اُس کی ذات پر اُس پُرکشش ماحول سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت موجود ہے، غالب نے انفرادیت اور ندرت پسندی کی بنا پر اردو سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور اپنی تمام تر توجہات لیلٰیٔ فارسی پر مذکور کردیں، اور اُسکی مشاطگی میں ہمہ تن مصروف ہوگیا، اگرچہ فارسی ہنوز سرکاری زبان تھی، لیکن وُہ بڑی تیزی سے اپنا وقار کھو رہی تھی، غالب نے اِس موقعہ پر ایک ایسی روش اختیار کی جو راہِ عام سے مختلف تھی، اور پُرانی طرز سے جُداگانہ تھی، ۱۸۳۵ء

---

[۱۸] عود ہندی صفہ ۱۵۲،

تک غالب نے اشعارِ آبدار کا بیش بہا ذخیرہ جمع کر لیا، اِس سے اُس کا دیوان میخانۂ آرزو معرضِ وجود میں آیا۔

اپنے ایجاد کردہ طرز کو غالب نے بڑی مستعدی اور عرقریزی سے بنایا، پنشن کے قضیئے نے اس میں اہم کردار ادا کیا، کلکتہ کے سفر سے بہت پہلے ہی اُس کی شہرت کا ڈنکا دُور دُور تک بج چُکا تھا، اور اس کی غزلیں خلعتِ مقبولیت سے سرفراز ہو چکی تھیں، اور اہل ذوق اُس کی دید کے مُشتاق تھے، سفر کے دوران، اور سفر کے بعد، غالب نے کلیتہً فارسی نظم و نثر لکھی، تقریباً تمام مثنویاں اِسی دور کی تخلیق ہیں، ان کے علاوہ، جب مولانا سراج الدین احمد کے ایما سے غالب نے اپنا مجموعۂ کلام بعنوان گل رعنا مرتب کیا، تو اس کے پاس اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، غالب نے زیادہ تر فارسی خطوط ۱۸۲۶ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیان لکھے ہیں، نیز والیانِ رامپور، ملکہ وکٹوریہ اور چند دیگر افسران کی شان میں مدحیہ قصائد کے علاوہ، تمام قصائد ۱۸۲۶ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیانی زمانے کی پیداوار ہیں، اس امر کی تصدیق قصائد کے مطالعہ سے ہوتی ہے، غالب کے زمانۂ حبسِ بیجا کی نظم بعنوانِ اسیریہ بھی ۱۸۴۷ء کی یادگار ہے، اس زمانے تک اس کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا، اس بنا پر ۱۸۲۲ء سے لے کر ۱۸۵۰ء تک کے عرصہ کو فارسی گوئی کا دور سمجھنا چاہیئے، حالانکہ وقتاً فوقتاً اس زمانے میں اُس نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی،

تیسرا دور:۔ آخر کار، ۱۸۵۰ء میں جب اُسے خاندانِ تیموریہ کے حالات قلم بند کرنے پر مامور کیا گیا، اور وہ براہ راست ایسے شہنشاہ کے دربار میں باریاب ہوا، جو خود اردو کا شیدائی تھا، تو غالب کو اس زبان پر دوبارہ توجہ دینی پڑی، مزید برآں اس زمانے میں غالب کو فارسی خطوط لکھنے کی مہلت کم ملتی تھی، اس لئے اس نے فارسی میں خط و کتابت ترک کر دی، کیونکہ اس کام میں نادر اسلوب پیدا کرنے کے لئے مسلسل توجہ اور ذہنی کاوش کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ اُسے اپنے

آقا کی فرمایشوں کا لحاظ کرنا پڑتا تھا جس نے اگرچہ اردو کی نشو و نما کا حکم تو نہیں دیا تھا، لیکن غالب سے اس امر کی توقع ضرور رکھتا تھا، اِس محرک نے اردو ادب کو ایک نیا ترقی یافتہ اسلوب دیا، غالب نے فارسی میں خط و کتابت ترک کر کے اردو میں مراسلہ نگاری شروع کر دی، ۱۸۵۰ء سے لے کر وفات تک غالب نے اردو اور فارسی سے مساویانہ سلوک کیا،

دربار سے تعلق کم مدت رہا، اگر غالب چاہتا، تو دوبارہ فارسی سے رجوع کرتا، لیکن سن و سال کے گذرنے کے ساتھ، ضُعف اور خرابیٔ صحت کی بنا پر، وہ جان بوجھ کر اردو زبان کو ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کرتا رہا، تاہم اِس دوران بھی اپنی محبوب زبان کو کُلیتہً ترک نہیں کیا، اِسی زمانے میں غالب نے چند بہترین خطوط فارسی میں لکھے، والیانِ رامپور، ملکہ معظمہ اور وائسرائے ہند کی شان میں قصائد بھی لکھے، چند غزلیات، قطعات اور اُس کی سب سے طویل اور بہترین مثنوی ابرِ گہر بار اِسی دور کی یادگاریں ہیں، چنانچہ ۱۸۵۰ اور ۱۸۶۹ء کا درمیانی زمانہ بجا طور پر فارسی اور اردو کا مشترک دور کہا جا سکتا ہے،

۵ ۔ روحانی اساتذہ

زمانے کے گذرنے کے ساتھ غالب ایرانی شعرا کے کلام سے اور زیادہ مستفیض ہوتا رہا، اور اپنے فن میں اضافہ کرتا رہا، چنانچہ اِس ادبی جُستجو کے دوران اس کا تخیل بیدار ہوا، اُس نے زیادہ مستعدی اور تندہی سے اُستادانِ فن کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ جاری رکھا، اور اُن کے اسالیب کو بخوبی جذب کیا، فردوسی سے قاآنی تک شعر سرمایہ کو ذہن نشین کیا، اور حریفوں کو دعوتِ مبارزت دینے کے لئے تیار ہو گیا، وہ کہتا ہے:۔

"ہر چند منش را کہ یزدانی سرِ دش است، در سرِ آغاز پسندیدہ گوئی دگزیدہ جُوئی بود، اما پیشتر از فراخ روی پیٔ جادہ ناشناسان برداشتی، تا ہمدران تگاپو پیش خرامان را بہ خجستگی ارزشِ ہمدمی کہ در من یا فتند،

مہر بجنبید، و دِل از آزرم بہ درد آمد، اندوہِ آوارگیہای من خوردند، و آموزگارانہ درمن نگریستند، شیخ علی حزین بخندۂ زیر لبی بیراہ رویہای مرا درنظرم جلوہ گرساخت، وزہر نگاہِ طالب آملی، وبرقِ چشمِ عرفی شیرازی مادّہ آن ہرزہ جنبشہای ناروادر پای راہ پیمای من بسوخت، ظہوری بسرگرمیٔ گیرائیٔ نفس، حرزی بباز و، وتوشہ ای بکمرم بست، ونظیری لاابالی خرام، بہنجارِ خاصہ، خودم بچالش آورد، اکنون بہ یمنِ فرہ پرورش، آموختگیٔ این گروہِ فرشتہ شکوہ، کلکِ رقّاص من بہ خرامش تدرو وبہ رامش موسیقار، بہ جلوہ طاؤس، وبہ پروازعنقا،" [19]

نظیری، ظہوری، طالب آملی، عرفی، حزین اور اسیر کو بوثوق غالب کے اساتذہ میں شمار کیا جا سکتا ہے [20] حالانکہ غالب ایران کے تمام شعرا کی عظمت کو بھی تسلیم کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ان اُستادانِ فن کی شان میں بڑی نغمہ سرائی کی ہے، بقول خود:۔

نگویم، تازہ دارم، شیوۂ جادو بیانان را
دلی درخویش بینم کارگر، جادوی آنان را

ان مشاہیر کا احسان مند ہو کر غالب نے اُن کی خاموش ارواح کو خراج تحسین ادا کیا ہے، ان کا تذکرہ ہمیشہ ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے، نظیری اور ظہوری سے اُس کو بے پناہ محبت تھی، [21] ملاحظہ ہو:

دادہ خونین نفسی درسِ خیالم غالب — رنگ بر رُوی من از سیلیٔ اُستاد آمد

---

[19] کلیاتِ نثر صفہ ۶۸، اور دیوان فارسی صفہ ۵۱۶ - ۵۱۷، [20] یادگار صفہ ۲۶۹،

[21] میر کے متعلق فتویٰ دیا:

(۱) ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۲) غالب اپنا عقیدہ ہے بقول ناسخ — "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

غالب مذاقِ ما نتوان یافتن از ما
رو، شیوۂ نظیری و طرزِ حزیں شناس

ز فیضِ نطقِ خویشم با نظیری ہمزبان غالب
چراغی را کہ دُودی ہست در سر زُود در گیرد

غالب از صہبای اخلاقِ ظہوری سرخوشم
پارہ ای بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما

مارا مدد ز فیضِ ظہوری است در سخن
چون جامِ بادہ راتبہ خوار خودیم ما

بنظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جان کردہ ام شیرازۂ اوراقِ کتابش را

غالب از اوراقِ ما نقشِ ظہوری دمید
سُرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

غالب از جوشِ دمِ ما تربتش گلپوش باد
پردۂ سازِ ظہوری را گل افشان کردہ ایم

غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تنِ سازِ بیانش کردہ ام

چودھری عبد الغفور کو لکھا:

"میں جانتا ہوں، مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی، اس کا نام نور الدین اور تخلص ظہوری تھا...... قالب معنی کی جان ہے ظہوری، ناطقہ کی سرافرازی کا نشان ہے ظہوری"[۲۲]

عرفی کے متعلق لکھا ہے:

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب
جامِ دگران بادۂ شیراز ندارد

چون ننازد سخن از رحمتِ دہر بخویش
کہ بُرد عرفی و غالب بعوض باز دہد

گشتہ ام غالب طرف با مشربِ عرفی کہ گفت
رُوی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

آخر میں، اگرچہ غالب نے اردو شاعری میں میر تقی میر، اور شیخ امام بخش ناسخ کی پیروی کی، اور فارسی میں ایرانی شعراء کا تتبع کیا، لیکن درحقیقت وہ شاعری میں کسی کا شاگرد نہیں تھا، غالباً اس نے اردو کی ابتدائی کاوشیں

۲۲؎ عودی ہندی صفہ ۵۸،

اصلاح کے لئے کسی کو پیش کی ہوں گی، لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ فارسی کی شاعری میں اُس نے کسی سے مشورہ نہیں لیا، فارسی شاعری سے ذوق فطری تھا، اُس نے یہ فن خود حاصل کیا، خود اصلاح کی اور خود پایۂ تکمیل کو پہنچایا، فارسی شاعری اُس کے لئے عطیّۂ رحمانی تھی، مندرجۂ بالا بیانات کی تصدیق اس کے مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

من کسم کہ بتوقیع مبداء فیّاض　　شہ قلمروِ نظمم درین جہانِ خراب

غالب قلمت پردہ کشای دمِ عیسیت　　چوُن بر روشنِ طرز خدا داد بجُنبند

لطفِ طبع از مبدارِ فیاض دارم، نی زغیر　　دشت را خود رو بود گر سرخ گل و سوسن است

ہر چہ در مبدارِ فیاض بود آنِ منست

آفتاب آسا بزورِ خویش گردد ساغرم

۶۔ فارسی گویانِ ہند سے سرد مہری

اگرچہ غالب ہندوستانی ماں کا بیٹا تھا، ہندوستانی زبان بولتا تھا، اور ہندوستانی ہوا میں سانس لیتا تھا، مگر وہ محاورۂ ایران کا ماہر تھا، اور تیغ اصفہانی کے ماہرین سے شانہ ملا کر چلتا تھا، ایرانی شعرا کا وہ نیاز مند نظر آتا ہے، لیکن فارسی گویانِ ہند کو وہ خاطر میں نہیں لاتا، بجز امیر خسرو اور مُلّا فیضی کے وہ کسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، چنانچہ کہتا ہے:

"اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" [۲۳]

---

[۲۳] خطوط صفحہ ۱۰۰

بڑے تعجب کی بات ہے کہ غالبؔ نے رودکیؔ، مسعود سعد سلمانؔ، منوچہریؔ، فرخیؔ، سعدیؔ، حافظؔ اور جامیؔ کا کھل کر تذکرہ نہیں کیا، اور نہ ہی عطارؔ اور مولانائے رومیؔ کا کبھی ذکر کیا، نیز میرزا بیدلؔ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، غالبؔ کا رویّہ قتیلؔ، واقفؔ، اور اخترؔ بنگالی سے بہت تند و تیز تھا، اور ان کی ذات پر سب و شتم ڈھائے، اور بلا وجہ اُن پر اعتراضات اور طعن و طنز اور تشنیع کے کوڑے برسائے،

مانا کہ غالبؔ محاورۂ ایرانی کا ماہر تھا، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ وہ اپنے ہم وطن شعراء کے لئے روا داری روا نہ رکھتا تھا، اُس نے اُن کے کلام کو سخت گیری سے جانچا، اور ان کی غلطیوں پر ضرورت سے زیادہ سخت لہجے میں نکتہ چینی کی، اُس نے تقریباً ہر معاصر سے جھگڑا مول لیا، اور نہایت معمولی باتوں پر، ایسے لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا، جنہوں نے نہ اُس کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے کلام پر تنقید کی تھی، اور نہ ہی توہین کے مرتکب ہوئے تھے،

غالبؔ نے قتیلؔ کے خلاف معاندانہ محاذ بنایا، جو بیچارہ غالبؔ کے ظہور سے بہت پہلے فوت ہو چکا تھا، لہٰذا وہ غالبؔ کا کیا بگاڑ سکتا تھا، اِس کے باوجود غالبؔ نے اس کے خلاف گرز آزمائی کی، اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کو بد نام کیا، یہ بیحد بے مہر اور غیر منصفانہ جادو طرازی، ایسے شخص کے خلاف کی گئی، جس کا دامن بے داغ تھا، اور جس کی عزت و عظمت اُس کے متتبعین کے درمیان قائم تھی، سچ تو یہ ہے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ رویّہ ہمارے شاعر کے کردار پہ بدنما داغ ہے، ملاحظہ ہو:

"وہ گھسا گھس اُلّو، عبد الواسع ہانسوی

...... اور یہ اُلّو کا پٹھا، قتیلؔ، علیہ ما علیہ"، [۲۴]

پھر اِس بات پر حیرت نہ ہونی چاہئے، کہ غالبؔ پر بھی برابر کی چوٹیں پڑیں، اگر

---

[۲۴] خطوط صفہ ۸۵،

ایک طرف ہم غالؔب اور اُس کے فن اور اجتہاد کی بڑی عزّت کرتے ہیں، تو دوسری طرف ہم اُس کے دُرُشت لہجے کی طرفداری بھی نہیں کر سکتے، اُس نے گڑے مُردے اُکھاڑے، اور اُن کو رُسوائی کے گڑھے میں جھونک دیا، اُسے یہ معلوم نہ تھا، کہ وہ اپنی ذات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا ہے، یہ بغاوت، یہ ضد اور یہ بے مہری خود اس کی فارسی شاعری کی نامقبولیت کا باعث بنی، غالؔب اپنے وقت کا سب سے بڑا اِسنکی تھا۔

فصلِ دُوم

تصنیفات

کوکبم را در عدم اوج قبولی داده اند
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب تنوع پسند ادیب اور پرگو شاعر تھا، اس نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں اردو اور فارسی زبانوں میں گراں قدر اضافہ کیا، "ساٹھ سال کی لمبی مدت کا یہ ثمرہ بہ لحاظ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجہ یا مہتم بالشان نہیں،..... مگر حالات کی نامساعدت اور ابنائے دہر کی ناقدری نے ان کے تمام ولولوں کو سرد کر دیا"

اگرچہ ہمارا موضوع اس کی فارسی شاعری ہے، لیکن اُس کی تخلیقات کا مکمل جائزہ لئے بغیر ہماری کتاب مکمل نہیں ہو سکتی،

۱- فارسی

نظم

۱- کلیاتِ نظم فارسی
۲- سَبَدِ چین
۳- سبد باغ دودر
۴- دعاء الصبّاح
۵- رسالۂ فنِ بانک

نثر

۱۔ کلیاتِ نثرِ فارسی
۲۔ قاطع برہان
۳۔ دِرفشِ کاویانی
۴۔ مآثرِ غالب
۵۔ متفرقات غالب

ب ۔ اُردو

نظم

۱۔ دیوانِ اردو
۲۔ قادر نامہ
۳۔ بیاض غالب

نثر

۱۔ عودِ ہندی
۲۔ اردوئے معلّٰی
۳۔ نادراتِ غالب
۴۔ مکاتیب غالب
۵۔ نکات غالب و رقعاتِ غالب
۶۔ نادر خطوط غالب
۷۔ انتخاب غالب
۸۔ غالب کی نادر تحریریں

ج ۔ متفرقات

قاطع برہان کا معرکہ

۱- کلیاتِ نظم فارسی

اِس کلیات میں مندرجہ ذیل اِصناف شامل ہیں :

صنف	تعداد	اشعار
۱- قطعات	۶۷	۸۲۶
۲- مثنویات	۱۲	۲۰۵۷
۳- قصائد	۶۴	۳۷۷۷
۴- غزلیات	۳۲۴	۳۵۱۹
۵- رباعیات	۱۰۶	۲۱۲
۶- ترکیب بند	۲	۱۴۶
۷- ترجیع بند	۱	۵۰
۸- مخمس	۱	۴۵
میزان کل		۱۰۶۳۲

کلیاتِ نظم فارسی کے بارے میں غالب نے ۱۸۶۳ء میں سید بدرالدین کاشف کو لکھا:

"فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا، پھر نہیں چھپا، مگر ہاں سالِ گزشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر، کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا، اور چھاپنا شروع کردیا، وہ پچاس جزو ہیں، یعنی کوئی مصرع میرا اُس سے خارج نہیں، اب سُنا ہے کہ چھپ کر تیار ہوگیا ہے" ؎۲

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان فارسی کی طباعت ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان کسی زمانے میں ہوئی ہوگی، اس کے علاوہ میرزا علی بخش رنجور نے کلیاتِ نثر فارسی کی

؎۲ خطوط صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۲ ،

تقریظ میں لکھا ہے، کہ اُس وقت کا دیوان بعنوان میخانۂ آرزو ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں مکمل ہوا تھا، اور غالبؔ نے اپنی تقریظ میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء بیان کیا ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کی طباعت کا سال ۱۸۳۷ء ہے اس کا دُوسرا ایڈیشن ضیاء الدین احمد خاں نے ۱۸۴۵ء میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپوایا تھا، آخر میں منشی نولکشور نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا، اِس آخری مجموعہ میں ۱۸۴۵ء سے لے کر ۱۸۶۳ء تک کا کلام بھی شامل ہے، اسیر یہ غلطی سے رہ گئی تھی، اسے بعد میں سبدِ چین میں شامل کیا گیا، تیسرا ایڈیشن جو دوسرے ایڈیشن کی نقل تھا، ۱۸۹۰ء میں چھپا، اور آخری بار مطبع نولکشور سے ۱۹۲۵ء میں اشاعت پذیر ہوا،

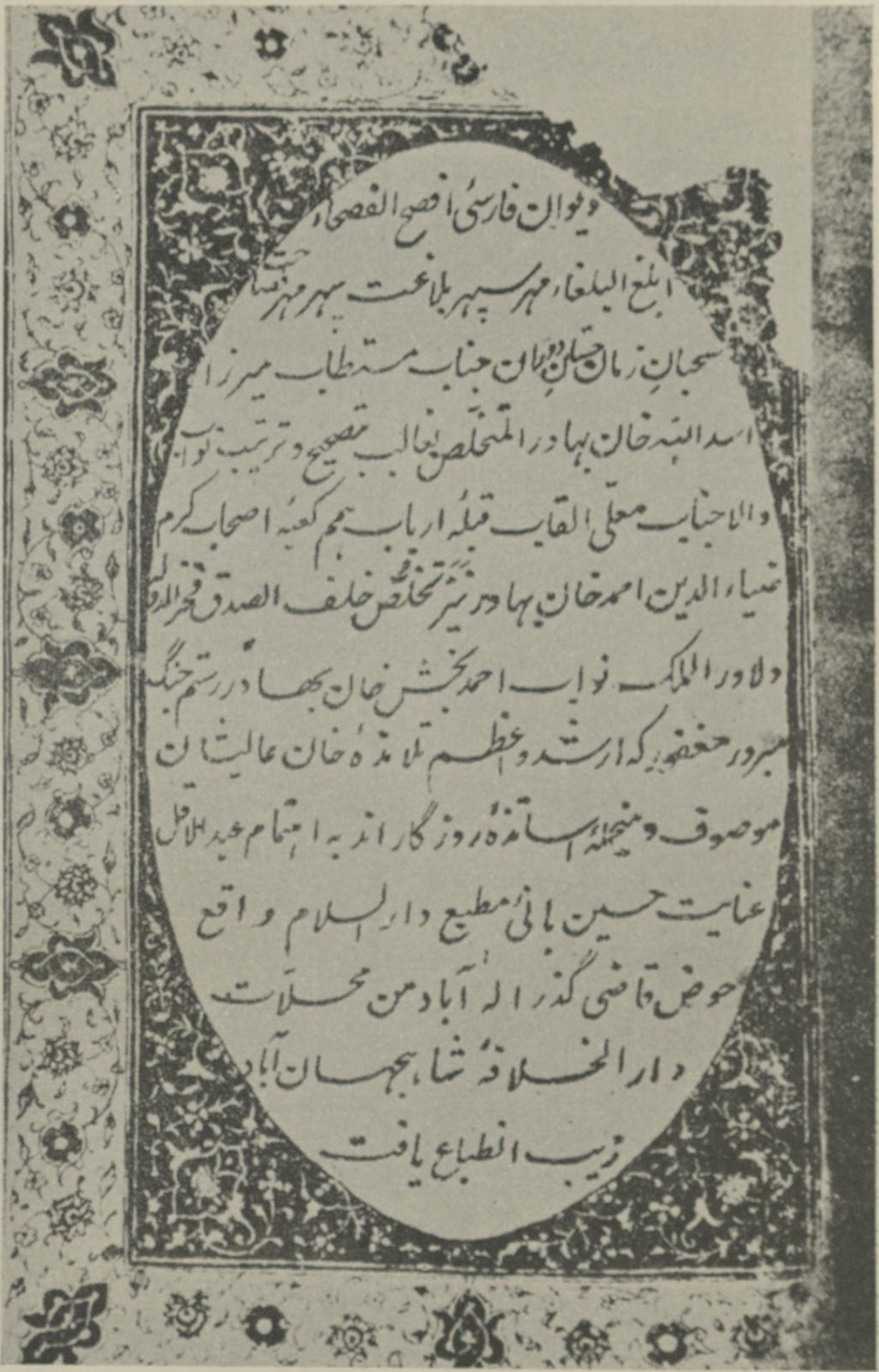
۲۔ سَبدِ چین

مالک رام لکھتے ہیں :۔

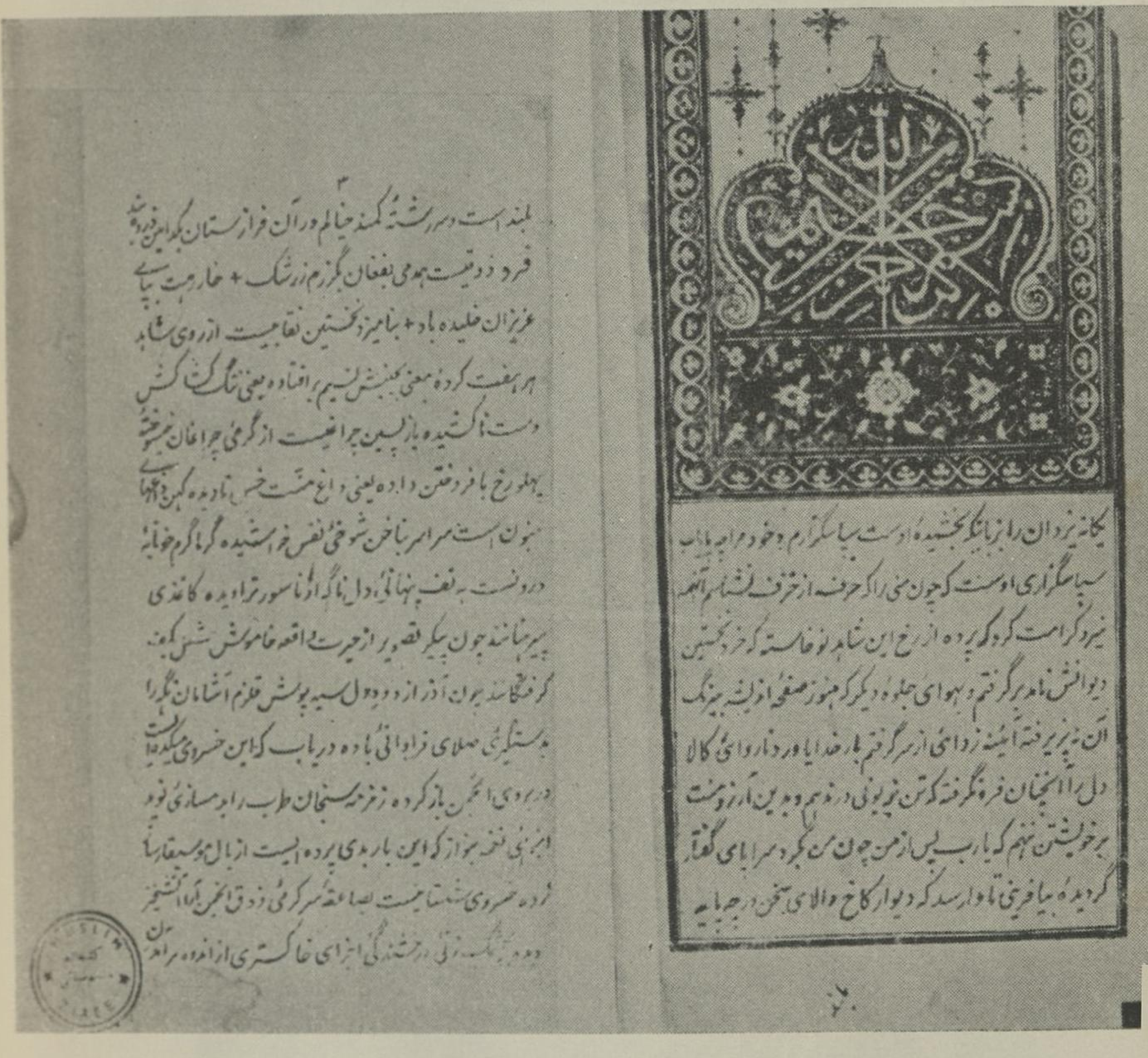
"۱۸۶۴ء مطابق ۱۲۸۰ھ میں میرزا نے حکیم غلام رضا خاں صاحب کے اصرار پر انہیں مثنوی ابر گہر بار الگ سے چھاپنے کی اجازت دیدی تھی، حالانکہ یہ کلیات میں شامل تھی، یہ نسخہ میر فخر الدین کے اہتمام میں اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوا تھا، اس میں صرف ۴۱ صفحے ہیں، ۴۰ صفحوں میں متن اور غالبؔ کی اپنی تقریظ، اور تاریخیں، اور آخر میں ایک صفحہ کا غلط نامہ، مثنوی کے آخر میں دو قصیدے اور قطعے جو کلیات کی اشاعت کے بعد لکھے گئے تھے، اور چند رباعیاں بھی، جو کلیات میں چھپنے سے رہ گئی تھیں، شامل کر دی گئی تھیں، بعد کو یہ قصائد، وقطعات وغیرہ کچھ دوسرے کام کے ساتھ سبد چین کے عنوان سے اگست ۱۸۶۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ، میں مطبع محمدی، دہلی سے شائع ہوئے، اس میں ۷۴۵ شعر تھے" [۳]

---

[۳] ذکر غالب صفحہ ۱۹۵


دیوان فارسیٔ افصح الفصحاء
ابلغ البلغاء مہر سپہر بلاغت سپہر مہر فصاحت
سحبانِ زمان حسانِ دوران جناب مستطاب میرزا
اسد اللہ خان بہادر المتخلص بغالب تصحیح و ترتیب نواب
والاجناب معلی القاب قبلۂ ارباب ہمم کعبۂ اصحاب کرم
ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر تخلص خلف الصدق فخر الدولہ
دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ
سرور مغفور کہ ارشد و اعظم تلامذۂ خان عالیشان
موصوف و منجملۂ اساتذۂ روزگار اند باہتمام عبد الاقل
عنایت حسین بانی مطبع دار السلام واقع
حوض قاضی گذر الہ آباد من محلات
دار الخلافہ شاہجہان آباد
زیب انطباع یافت

سرِ ورق دیوانِ فارسی ۱۸۴۵ء



دیوانِ فارسی کے پہلے دو صفحے

غالبؔ نے منظومات کی ترتیب خود کی تھی، کلیات تو متعدد بار چھپا، لیکن یہ مجموعہ محروم توجہ رہا، یہاں تک کہ اسے نایاب سمجھ لیا گیا، اس نادر کتاب کو دوبارہ منظر عام پر لانے کا سہرا پروفیسر ڈاکٹر مالک رام مصنفِ ذکرِ غالبؔ کے سر ہے، جنہوں نے ضروری حواشی کے ساتھ اپریل ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے جید برقی پریس، دہلی میں چھپا کر غالبیات میں گرانقدر اضافہ کیا۔ اس کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں:۔

صنف	تعداد	اشعار
۱۔ قصائد	۶	۳۳۱
۲۔ اسیریہ	۱	۸۴
۳۔ ترجیع بند	۱	۲۶
۴۔ مختصر مثنویات	۲	۱۶
۵۔ قطعات	۳۱	۲۳۲
۶۔ غزلیات	۱۰	۱۰۳
۷۔ رباعیات	۲۰	۴۰
۸۔ متفرق اشعار		۱۸
میزان کل		۸۵۰ ؎

۳۔ سبد باغ دو در

حقیقت میں یہ سبد چین کے بعد مرتب ہوا، مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی، یہ کتاب دو حصّوں پر منقسم ہے، پہلا حصّہ شائع شدہ سبد چین

؎ کلیات نثر فارسی میں شامل شدہ اشعار ملا کر غالبؔ کے اشعار کی کُل تعداد تقریباً بارہ ہزار ہے۔

(پہلا ایڈیشن) پر مشتمل ہے، اس حصے میں مزید چند نظمیں شامل کی گئی ہیں، دوسرے حصے میں چند ایسی نثریں درج کی گئی ہیں، جو کلیاتِ نثر میں شامل نہیں ہیں، اس میں سبدِ چین سے ۱۴۶-اشعار زیادہ ہیں یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں لاہور میں شائع ہوئی، اس کے مؤلف اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی لکھتے ہیں:

"میرے پاس اس مجموعے کا اصلی نسخہ ہے، جس کی کتابت طباعت کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی، اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ۷- ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ (مطابق ۷، جولائی ۱۸۷۰ء) ختم ہوئی، مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی" سبد باغ دو در" غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے، جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے،...... کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا........ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے، کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گذرا ہے" ؎۵

۴- دعاء الصباح

یہ مثنوی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب عربی دعاء الصباح کا منظوم ترجمہ ہے جس کو غالب نے اپنے خواہر زادہ میرزا عباس بیگ اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمائش پر کیا تھا، یہ غالب کی زندگی میں نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپ چکی تھی، مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری نے ایک مختصر تمہید کے ساتھ ۱۹۴۱ء میں بعنوان" میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی" شائع کر دیا،

؎۵ رسالہ" آجکل" فروری ۱۹۴۷ء، صف ۷،

اس دعا کے کل ۲۶ صفحات ہیں، جلی قلم سے عربی متن ہے، نیچے فارسی نثر میں ترجمہ درج ہے، اس کے بعد غالب کا فارسی منظوم ترجمہ ہے، فارسی نثر کسی اور کی ہے شاید غالب نے اس کی نوک پلک درست کی ہو!

۵- رسالہ فن بانک

یہ رسالہ اب تک بظاہر "معلوم الاسم و مجہول الجسم" ہے، اس کی نشاندہی غالب نے "سبد باغ دو در" کے نثری حصہ میں یوں کی ہے:

"این طالع یار خان کہ دوستِ دیرینۂ منست، بارِ گرانی بر دوشِ من نہاد، بپارسی ترجمہ کردنِ ہندی عبارتی را کہ بر گزارشِ آئین پیچہای بانک مشتمل بود، از من خواست، و سرانجام این خدمت را ذریعۂ خوشنودی خاطرِ حقیر حضرتِ نواب معلی القاب عالی جناب[۱] وانمود، چون زلّہ خوارِ خوانِ جود آلِ والا جاہ بودم، و سپاس می باید گزارد، توسنِ خامہ را در آن گزرگاہِ تنگ بجولان آوردم، و سفینۂ کہ دیباچہ و خاتمہ نیز دارد، ترتیب دادہ بہ کارفرما سپردم، تا روائی آرزدی و رودِ توقیع را بہانہ تواند بود"[۲]

تادمِ تحریر اس نسخہ کا پتہ نہیں چلا،

۶- کلیاتِ نثر فارسی

کلیاتِ نثر میں تین کتابیں شامل ہیں،

(۱) پنج آہنگ، (۲) مہر نیمروز، (۳) دستنبو،

---

[۱] والئ ریاست ٹونک،

[۲] ذکرِ غالب صفہ ۲۰۱،

پنجِ آہنگ

یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے، آہنگ اوّل میں رسمی خط و کتابت کے سلسلہ میں القاب و آداب وغیرہ لکھنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں، آہنگ دوم میں مصادر، مصطلحات اور خالص فارسی الفاظ کی فہرست درج ہے، آہنگ سوم میں غالب کی فارسی اشعار کا مختصر انتخاب ہے، آہنگ چہارم میں خطب کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ شامل ہیں، اور آہنگ پنجم میں خطوط درج کئے گئے ہیں۔

مہرِ نیمروز

غالب کو ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا گیا تھا،[۸] بادشاہِ وقت بہادر شاہ ثانی کا حکم تھا کہ خاندان تیموریہ کی تاریخ امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد تک لکھی جائے،[۹] چنانچہ بابر تک کی تاریخ جنوری ۱۸۵۱ میں تیار ہوگئی، اور مارچ ۱۸۵۱ء تک ہمایوں کی واپسی تک کے حالات قلمبند کر دیئے گئے،[۱۰]

اس مرحلے پر شاہی حکم صادر ہوا، کہ تاریخ ابتدائے آفرینش سے شروع کی جائے، قرار یہ پایا کہ حکیم احسن اللہ خاں مواد جمع کر کے مؤرخ کے حوالے کرتے جائیں اور وہ اس مواد کو فارسی کے سانچے میں منتقل کرتا جائے، لہٰذا مجوّزہ کتاب کا نام **پرتوستان** رکھا گیا، اور اس کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا، پہلے حصّے کا نام مہر نیمروز اور دوسرے حصّے کا ماہِ نیم ماہ رکھا گیا، پہلے حصّے میں از آدم تا ہمایوں حالات اجمالاً اور دوسرے حصّے میں اکبر سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک تفصیلاً قلمبند کرنے کا التزام تھا، پہلا حصّہ اگست ۱۸۵۴ میں ختم ہوگیا،[۱۱] دوسرے حصے کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی، کچھ تو حکیم احسن اللہ صاحب سست پڑ گئے، مگر مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے خاندانِ تیمور کا نام و نشان ہی مٹا دیا، رہے نام

---

[۸] کلیات نثر صفہ ۲۷۱، [۹] ایضاً صفہ ۲۷۱، [۱۰] ایضاً صفہ ۲۷۲،

[۱۱] نادرات غالب صفہ ۳۵،

اللہ کا ![12]

دستنبو

یہ فارسی بحت یا خالص فارسی میں غدر کے واقعات کا روزنامچہ ہے، اس میں یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات درج کئے گئے ہیں[13] میر مہدی کو لکھا:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کر دیا" اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء میں نے ۱۵ مہینے کا حال لکھا، اور آئندہ لکھنا موقوف کیا"،

دستنبو کے علیحدہ کئی ایڈیشن شائع ہوئے، اس کا پہلی مرتبہ اُردو میں ترجمہ انجمن ترقیٔ اُردو کراچی نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا ہے،

کلیات نثر کی اشاعت

پنج آہنگ، مہر نیمروز اور دستنبو علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں کئی کئی بار چھپ چکے تھے، جیسا کہ غالب نے پنج آہنگ کے خاتمے میں لکھا ہے، ۱۸۸۰ھ میں منشی نولکشور دہلی آئے، اور کلیات چھاپنے کی خواہش ظاہر کی، کیونکہ پنج آہنگ اور مہر نیمروز نایاب ہو چکی تھیں، غالب نے درخواست منظور کرلی اور ضیاء الدین احمد خاں سے تینوں کتابیں لے کر منشی صاحب کے حوالے کردیں، چنانچہ کلیات پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان ۱۲۸۴ھ میں اشاعت پذیر ہوا،

۷- قاطع برہان

غدر کے زمانے میں غالب نے آنا جانا بند کر دیا تھا، روزنامچہ لکھنے کے علاوہ دساتیر

---

[12] نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی شیو نرائن نے مہر نیمروز کو دوبارہ چھاپنے کی خواہش ظاہر کی تو غالب نے اس کو لکھا: "اب یہ کتاب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپانے کے"، خطوط صفہ ۳۸۷،

[13] اردوئے معلیٰ صفہ ۱۴،

اور برہان قاطع بھی زیر مطالعہ تھیں، برہان فارسی لغت کا نام ہے، جس کے مصنف کا نام مولوی محمد حسین تھا، مولوی صاحب تھے تو دکن کے باشندے، مگر اپنے آپ کو تبریزی کہلاتے تھے،

لمحات فرصت میں برہان کے مطالعہ کے دوران بے شمار لغوی غلطیاں سامنے آئیں، جن کے اعتراضات حاشیے پر نوٹ کئے گئے، اِن اعتراضات کو مرتب کرکے ۱۸۶۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع کیا،

۸۔ دِرَفشِ کاویانی

غالب نے قاطع برہان میں مزید اعتراضات کا اضافہ کرکے اسے دوسری مرتبہ دسمبر ۱۸۶۵ء میں شائع کیا، اور درفشِ کادیانی نام رکھا، [۱۷۱]

۹۔ مآثرِ غالب

یہ غالب کے ۳۲۔ فارسی خطوط کا مجموعہ ہے، جس کو قاضی عبدالودود پٹنوی نے مُفید حواشی کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں شائع کیا ہے، اڑسٹھ صفحات پر مشتمل یہ مفید مجموعہ پہلی بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۱۹۴۹ء کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا، اس میں غالب کے وہ خطوط ہیں جو ڈھاکہ اور کلکتہ کے دُوستوں کو لکھے گئے تھے،

۱۰۔ متفرقات غالب

اس کتاب کے ۱۸۶ صفحات ہیں، اور ۱۹۴۷ء میں بسلسلۂ مطبوعات کتابخانہ رامپور ہندوستان پریس رامپور میں شائع ہوئی تھی، اس میں غالب کے وہ خطوط شامل ہیں جو کلکتے کے احباب کو لکھے گئے تھے، کچھ نظمیں بھی ہیں، جو قیام کلکتہ کے دوران کہی گئی تھیں

---

[۱۷۱] عود ہندی صفہ ۱۷۱،

ایک اردو غزل اور سلام بھی شامل ہے، اس میں ۹۴ خطوط ہیں، جس میں سے بہت سے خطوط "پنج آہنگ" میں بھی موجود ہیں، "مثنوی باد مخالف" کی قدیم روایت بھی درج کی گئی ہے،

متفرقاتِ غالب اُس بیاض کی نئی صورت ہے، جو سید مسعود الحسن رضوی ادیب کے پاس تھی،

۱۱۔ دیوان اُردو

غالب کے اردو دیوان کو اردو زبان کا قرآن کہنا چاہیئے، بقول ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم:

"ہندوستان کی اِلہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب"، [۱۵]

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا، غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا، اس نے اردو شاعری پر کبھی فخر نہیں کیا، اس کے برعکس وُہ اپنے آپ کو اردو شعرائ کے زمرہ میں شمار کیئے جانے کو اپنی ہتک سمجھتا تھا، جیسا کہ کہا ہے:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو، کہ بیرنگ منست

لیکن اسی دیوان نے غالب کو زندۂ جاوید کیا، اور اسے لِسان الغیب اور شہنشاہ سخن بنایا،

یہ دیوان پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار، دہلی میں اشاعت پذیر ہوا، اِس میں ۱۰۹۵ اشعار ہیں، اس کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپا، اِس میں ۱۱۱۱۔ اشعار ہیں، تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی شاہدرہ، دہلی

---

[۱۵] محاسنِ کلامِ غالب،

میں جولائی ۱۸۶۱ کو چھپا، اور چوتھا ایڈیشن مطبع نظامی کانپور میں جون ۱۸۶۱ء شائع ہوا، تیسرے ایڈیشن میں ۱۷۹۶ اور چوتھے ایڈیشن میں ۱۸۰۲ - اشعار ہیں، منشی شیونرائن نے مطبع مفیدِ خلایق آگرہ سے پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شائع کیا، نسخہ حمیدیہ گزشتہ سال (۱۹۶۹ء) لاہور میں دوبارہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا گیا، انتخاب غالب ۱۹۴۲ء میں مولانا عرشی کے اہتمام سے شائع ہوا، آخر میں بیاضِ غالب زیرِ ادارۂ فروغِ ادب، لاہور میں اکتوبر ۱۹۶۹ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی،

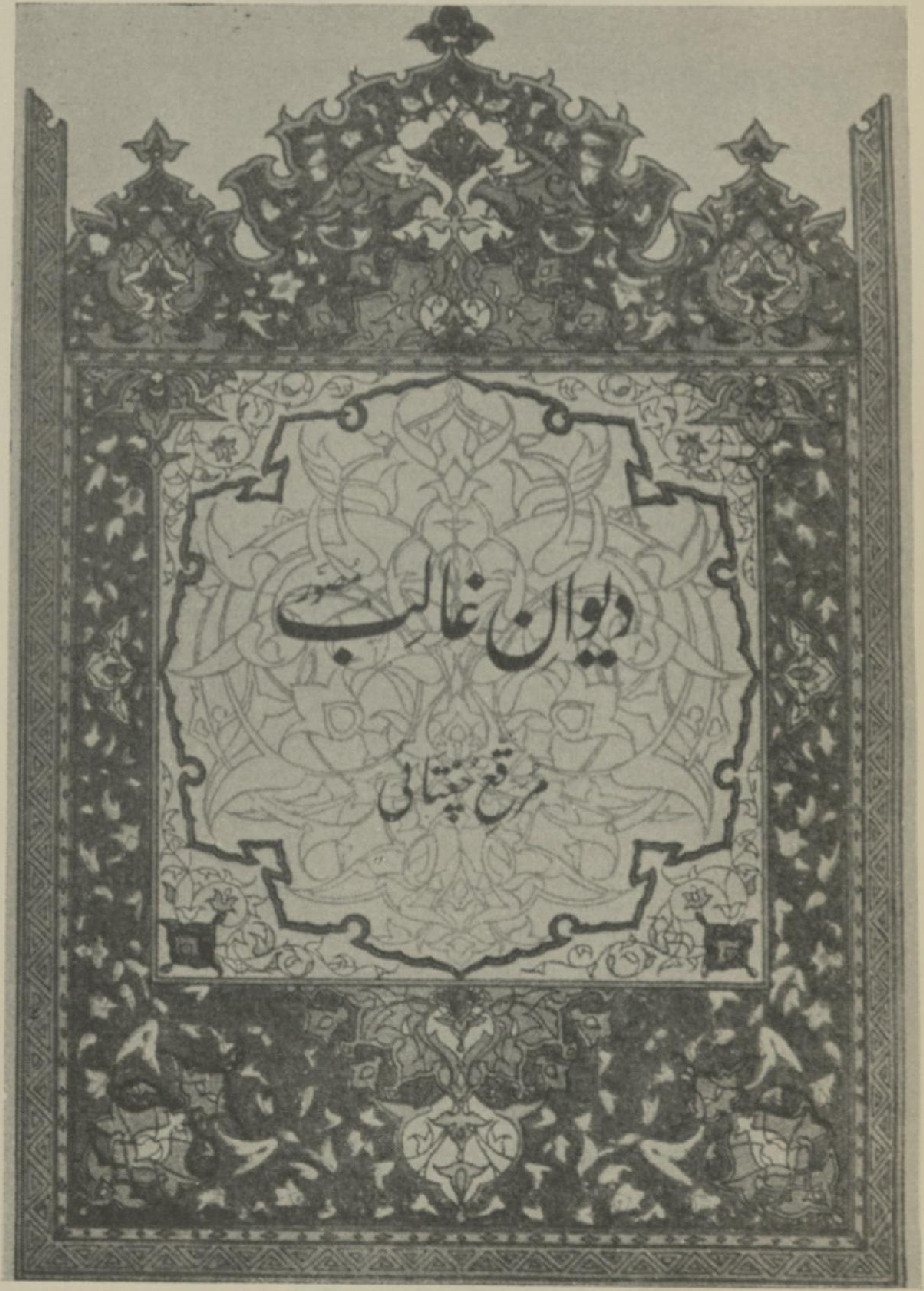
دیوانِ اردو' اردو زبان کی سب سے زیادہ چھپنے اور فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ہے، متعدد شارحین نے اشعار کی شرح میں مُوشگافیاں کیں، پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کا مصوّر نسخہ "مُرقعِ چغتائی" فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہے، غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر یونائٹڈ بینک لمیٹڈ کی جانب سے جاری کردہ غالب ڈائری میں صادقین نے بارہ اشعار کو اپنے آرٹ میں ڈھالا ہے"

۱۴- قادر نامہ

کہتے ہیں کہ غالب نے زین العابدین خان عارف کے بچوں کے لئے آٹھ صفحے کا ایک منظوم رسالہ قادر نامہ لکھا جس میں ضیاء الدین خسرو کی خالق باری' اور آمد نامہ کے طرز پر اردو فارسی کے ہم معنی الفاظ ہیں، چونکہ پہلا شعر قادر سے شروع ہوتا ہے، لہٰذا اس کا نام قادر نامہ رکھا گیا اس میں کل ۱۳۷ اشعار ہیں، پہلا شعر ہے:

قادر، اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی، مرسل، پیمبر، رہنما

اِس کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطانی، دہلی میں ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا تھا، دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں دہلی میں شائع ہوا، جس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں محفوظ ہے،



سرِورق مرقع چغتائی (مصوّر)



العلمہ طاقتہ

کتاب مستطاب بزبان فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی
تصنیف فردوسی ہند نواب اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص دہلوی موسوم بہ

جسمیں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدای ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولای ۱۸۵۸ تک
لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بزبان فارسی متعارفہ مروجہ ہے

مطبع مفید خلایق آگرہ میں واسطے افادہ خاص و عام کے باہتمام شیونراین کے چھاپی گئی

سرورق دستنبو

۱۳۔ بیاضِ غالب

بیاض غالب کا مفصل ذکر حرف اوّل میں کیا گیا ہے۔

۱۴۔ عود ہندی

یہ غالب کے بے شمار دوستوں اور مدّاحوں کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے، جس میں اس کی ملازمتِ دربار کے سال ۱۸۵۰ء سے لے کر آگے تک کے خطوط شامل ہیں، ممتاز علی خاں پہلا شخص تھا جس کو خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا، ۱۸۶۱ء میں غالب کے کے جگری دوست چودھری عبد الغفور خاں سرور مارہروی نے وہ ۳۱ خطوط جو اُن کے اور صاحب عالم اور شاہ عالم کے نام آئے تھے، ممتاز علی کے حوالے کر دیئے، اس مجموعہ کا نام مہر غالب تجویز ہوا، تاریخ کا قطعہ ہے:

اِنشا مملو بصد مطالب لکھی	یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو مہرِ غالب سے سرور	تاریخ بھی اِس کی مہر غالب لکھی

۱۲۷۸ھ

مگر ممتاز علی خاں نے اِس مجموعہ کی اشاعت ملتوی کر دی، اور مزید خطوط کی تلاش میں مصروف ہو گیا، 'جو بندہ یابندہ' کے مصداق خواجہ غلام غوث بیخبر کی وساطت سے مزید ۱۳۷ خطوط حاصل کئے، بعد میں چند تقریظیں اور نثریں بھی جمع کیں، ان سب کا مجموعہ "عودِ ہندی" نام رکھا، اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء مطابق ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے غالب کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع کیا۔

۱۵۔ اردوئے معلّٰی

یہ مجموعہ عود ہندی سے زیادہ ضخیم ہے، اور اس میں غالب کے انفرادی اسلوب میں لکھے ہوئے چند نہایت کارآمد خطوط شامل ہیں، یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ جوہر کے

اہتمام میں غالب کی وفات سے اکیس دن بعد بتاریخ ۶۔ مارچ ۱۸۶۹ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع ہوا، میر مہدی نے تقریظ لکھی تھی اور میرزا قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی تھی، یہ پہلا حصہ تھا۔ اس میں ۴۶۴ صفحے ہیں۔

دوسرا حصہ نہیں چھپا تھا، مولوی محمد عبدالاحد نے مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتبائی، دہلی میں پہلی دفعہ دونوں حصے یکجا کر کے اپریل ۱۸۶۹ء کو شائع کئے، دوسرا حصہ جو حالی نے مرتب کیا ۵۶ صفحات پر مشتمل تھا۔

بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر مولوی مہیش پرشاد نے الہ آباد اکیڈمی کی طرف سے کچھ نئے خطوط شامل کر کے اس مجموعہ کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا، اور خطوط غالب کے نام سے شائع کیا، اس کا پہلا حصہ ۱۹۴۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوا، دوسرا حصہ بھی چھپ چکا ہے[۳۲]، مولانا غلام رسول مہر نے بھی خطوط غالب کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے،

۱۶۔ مکاتیبِ غالب

یہ غالب کے پانچ فارسی خطوط اور ایک سو بارہ اردو خطوط کا مجموعہ ہے، جو والیانِ ریاست رامپور کے نام ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک لکھے گئے تھے۔ مولانا عرشی نے ان خطوط کو بڑی قابلیت کے ساتھ ترتیب دے کر، ۱۹۳۷ء میں شائع کیا اس کتاب میں ۱۶۷ صفحات کا گرانقدر مقدمہ شامل ہے، جو کتاب کی جان ہے، اور جس کا انداز بجائے خود مؤلف کے علم و فضل کی دلیل ہے، یہ ساتویں بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس میں ۱۲۰ مکتوبات ہیں۔

۱۷۔ نادراتِ غالب

یہ غالب کے اُن ۱۷ خطوط کا مجموعہ ہے جو منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے

---

[۳۲] مہیش پرشاد نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

نام لکھے گئے تھے، اور جن کو میر مہدی مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے جمع کیا تھا، یہ مجموعہ "ادارۂ نادرات کراچی" کی طرف سے میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین دہلوی نے بسوط دیباچے اور حواشی کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں شائع کیا،

۱۷۔ نکات غالب و رقعاتِ غالب

یہ دو مختصر رسالوں کا مجموعہ ہے، جو غالب نے رائے بہادر پیارے لال کی فرمائش پر اور صوبۂ پنجاب کے ناظم تعلیمات میجر فلر کے ایما سے مرتب کئے، پہلے رسالے میں اردو زبان کے قواعد ہیں، اور ۲۰ صفحوں پر مشتمل ہے، دوسرے رسالے میں ۱۵۔ فارسی مکاتیب ہیں، جو پنج آہنگ سے منتخب کئے گئے ہیں، یہ مجموعہ فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی، دہلی سے شائع ہوا تھا، اس کے کل پانچ سو نسخے چھپے تھے، یہ مجموعہ دوبارہ نہیں چھپا،

۱۸۔ نادر خطوط غالب

یہ ۲۷ خطوط کا مجموعہ ہے، جس کو سید اسمٰعیل رسا گیاوی مرحوم نے جمع کیا ہے، یہ خطوط سید کرامت حسین بہاری، سید صفیر بلگرامی اور صوفی منیری بہاری کے نام لکھے گئے ہیں، رسا صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ غالب نے پہلا اردو خط اُن کے دادا کے نام لکھا تھا،[۱۶] مالک رام اور قاضی عبدالودود کو اس دعویٰ کی صحت میں کلام ہے،[۱۷]

۱۹۔ انتخاب غالب

یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے اور ۴۸ صفحات کو محیط ہے، پہلے حصے میں دو

---

[۱۶] غالب صفحہ ۳۸۸ [۱۷] جامعہ دہلی مارچ ۱۹۴۲ء اور معیار پٹنہ جنوری ۱۹۴۳ء

دیباچے، ۱۲ خطوط، دو نقلیں اور ایک لطیفہ ہے، اور دوسرے حصے میں دیوانِ اردو میں سے ۱۳۱۔ اشعار درج کئے گئے ہیں، اور شروع اور آخر میں غالب کی دو مختصر نثریں ہیں، دیباچے اردوئے معلّیٰ میں موجود ہیں، پہلا میرزا رجب علی بیگ سرور کی کتاب گلزار سرور کا ہے اور دوسرا خواجہ بدرالدین خاں (خواجہ امان) کی حدائق الانظار کا ہے، اور خطوط میر مہدی مجروح کے نام ہیں، یہ مجموعہ غالب کا مرتب کیا ہوا ہے اور عودِ ہندی اور اردوئے معلّیٰ سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع ہو گیا تھا۔

۲۰۔ غالب کی نادر تحریریں

گزشتہ تیس سال میں غالب کے کئی خطوط اور تحریریں مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئی ہیں، اُن کو جمع کرکے "غالب کی نادر تحریروں" کے نام سے خلیق انجم صاحب نے فروری ۱۹۶۱ء میں شائع کر دیا،

۲۱۔ متفرقات

قاطع برہان کے معرکہ کے سلسلے میں غالب اور اُسکی مویدین نے مختلف پمفلیٹ شائع کیے، سب سے پہلے[۴۴] اس کے جواب میں ریذیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی سید سعادت علی نے "محرقِ قاطع برہان" شائع کی، "محرق" کے جواب میں مولوی نجف علی خاں نے فارسی میں "دافع ہذیان"، میاں داد سیاح نے اردو میں لطائف غیبی[۴۵] اور سوالات عبدالکریم شائع کیے، میرزا رحیم بیگ میرٹھی نے ساطع برہان لکھی، جسکے جواب میں غالب نے ۱۶ صفحے کا ایک خط بعنوان نامۂ غالب ۱۸۶۵ء میں چھپواکر تقسیم

۴۴؎ مالک رام کے نزدیک امین الدین امین دہلوی کی کتاب "قاطع القاطع" پہلی کتاب ہے جو "قاطع" کے جواب میں لکھی گئی، ذکر غالب صفحہ ۲۲۰،

۴۵؎ لطائف غیبی غالب کی اپنی تصنیف ہے، جسکو سیاح کے نام سے شائع کیا،

کیا،[۱۹] قاطع کے جواب میں قاطع القاطع کے علاوہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں فارسی کے مدرس آغا احمد علی احمدؔ نے مؤید برہان لکھی،[۲۰] مؤید کے جواب میں ۱۸۶۷ء میں غالبؔ نے تیغ تیز لکھی، جس کے جواب میں احمد علی نے اپنے شاگرد مولوی عبدالصمد سلہٹی فداؔ کے نام سے ایک قطعہ لکھا، جس کا ایک شعر ہے:

من کیم؟ عبدالصمد در شعر نامم من فدا
شہر سلہٹ مولدم، ایزد تعالیٰ کردہ است

اِس کے جواب میں غالبؔ کے دو شاگرد سید محمد باقر علی باقرؔ اور خواجہ سید فخرالدین حسین سخنؔ میدان میں اُترے، اِنہوں نے اسی زمین میں قطعات لکھے اور ہنگامۂ دل آشوب کے نام سے شائع کئے، اسکے جواب میں وفایا مولوی صاحب نے مجموعۂ تیغ تیز شائع کیا، ہنگامۂ دِل آشوب حصہ دوم جانبین کے پے در پے جواب الجواب کے مجموعے کا نام ہے، جو ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو شائع ہوا، بالآخر یہ ہنگامہ ۱۸۶۹ء میں احمد علی کے جواب الجواب شمشیر تیز تر کے ساتھ ختم ہوا۔ ممکن ہے کہ اگر غالبؔ زندہ رہتا تو یہ معرکہ جاری رہتا۔

---

[۱۹] اردوئے معلّٰی صفحہ ۱۹-۲۰،

[۲۰] احمد علی سے متعلق غالبؔ کا یہ شعر مشہور ہے:

لغو و حشو و ادعای محض و اطناب مُمل   مار و مُوش و سُوسمار و گربہ یکجا کردہ است

فصلِ سوم

قصائد

۱۔ تغزّل

تغزل شاعری کی جان ہے، غزلیہ شاعری روح کی شاعری ہے، اور شاعری کی روح، غنائی شاعری کے ذریعہ شاعر اپنے جذبات، محسوسات اور فن کے کمال کا مظاہرہ کرتا ہے، اِس میں اس کی شخصیت، مکمل اور بھرپور انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں اُس کے اندوہ وانبساط اور امید وبیم کا عکس نظر آتا ہے، ایسی شاعری شاعر کی روح کی آواز ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بیحد مؤثر اور مقبول بھی ہوتی ہے،

شاعر کی پروازِ تخیل جو معمولی پھول کو بھی گلاب کے خوشنما پھول سے زیادہ فرحت بخش اور رعنا بنا دیتی ہے، جب اُن ذاتی مشاہدات اور تجربات کا ذکر کرتی ہے جو بحر کی پُرکیف اور رنگین گھڑیوں میں حاصل ہوتے ہیں، تو ایسے آفاقی شاعر کو جنم دیتی ہے، جو انسان کو اس مادی دُنیا سے بلند کرکے ایک ایسے رومانی ماحول میں پہنچا دیتا ہے، جہاں اُسکی روح کو ابدی خوشی اور حیاتِ سرمدی حاصل ہوتی ہے، غنائی شاعری روح انسانی کو اُبھارتی ہے، اور یہ عرفانِ نفس کی شاعری جمالیاتی، نشاطیہ، داخلی اور باطنی شاعری ہے، اِسس میں وجدان بھی ہے، اور حسن بھی، یہ شاعر کے دل و دماغ کا آئینہ ہوتی ہے، یہ میٹھی بھی ہوتی ہے، اور غمناک بھی، بلند پایہ بھی، اور قابل قدر بھی، یہ ایک نغمہ بھی ہے، اور صدائے غم بھی، جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے، اور دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ دِل کی پکار ہوتی ہے،

مزاج کی داخلیت، خیال کی پرواز اور برجستگی، خلوص وانہماک، احساسات کی

پہنائی اور گہرائی، جذبات کی روانی، شوکت و شگفتگیٔ الفاظ، نغمہ کی فراوانی، تغزل کے لوازم ہیں، اِن خصوصیات کی روشنی میں قصیدہ کی تشبیب اور غزل لازمی طور پر غنائیہ شاعری میں داخل ہیں،

غالبؔ بنیادی طور پر غزل اور تغزل کا شاعر ہے، کیونکہ اس کی شاعری کا بیشتر سرمایہ ان اصنافِ سخن پر مشتمل ہے،

غالبؔ کو اپنے قصائد پر ناز تھا، اُس نے ایک بار منشی نبی بخش حقیر کو لکھا:-

"بھائی صاحب! تم غزل کی تعریف کرتے ہو، اور میں شرماتا ہوں، میرے فارسی کے قصیدے، جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا،،" [۱]

تعداد

غالبؔ نے کل ستّر قصیدے لکھے، جو چار ہزار ایکسو ساٹھ ۴۱۶۰ اشعار پر مشتمل ہیں، تعداد کے لحاظ سے یہ کچھ زیادہ نہیں، اگر اسلوب، چست بندشیں اور جذبات کی ہمہ گیری کی کسوٹی پر پرکھا جائے، تو غالبؔ کے بعض قصائد بہترین ادب میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

۲- پیروکار

غالبؔ نے قصائد میں ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، خاقانی، انوری رودکی، ظہیر فاریابی، امیر خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی، طالب آملی، صائب اور حزیں کے کلام کی پیروی کی ہے، ظہیر، نظیری، ظہوری اور عرفی کا رنگ زیادہ غالب ہے، اس کے تین چوتھائی قصائد ان ہی کے رنگ میں ہیں۔

ظہیر

پندرہ قصائد ظہیر کے شاہکاروں کے انداز پر ہیں، مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ظہیر

---

[۱] یادگار صفحہ ۱۲۰،

کا زرخیر تخیل اپنے ممدوحین کی غیر مرئی صفات کے بیان، خوشامد اور غلو کے تار و پود بنتے میں صرف ہوا، اور غالبؔ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ مدح، خوشامد کی حد تک نہ پہنچے، دونوں کے قصائد تعداد اشعار کے اعتبار سے انوریؔ، خاقانی اور قاآنی کے قصائد سے کافی مختصر ہیں، دونوں کے کلام میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں، دونوں طرز بیان میں تنوع، خیال میں ندرت، تراکیب میں جدّت اور نزہت، اور تشبیہات و استعارات میں حقیقت پسندی کا اہتمام کرتے ہیں، تشبیب کی حد تک دونوں کی راہ ایک ہے، دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ظہیرؔ مسلسل موضوع نظم کرتا ہے، اور غالبؔ اس کے برعکس اپنے زمانے کی عکاسی کرتا ہے، مختصر یہ کہ غالبؔ ظہیرؔ کا شاگردِ رشید ہے اور اپنے استاد کا تتبع، خیال اور اسلوب میں پوری ہوشیاری اور وفاداری کے ساتھ کرتا ہے۔

عرفیؔ

اس کے بعد نظیریؔ اور عرفیؔ آتے ہیں، عرفیؔ میں ہمتِ بلند، پرزور اسلوب، قوی تخیل اور خود بینی بدرجۂ اتم موجود تھی، غالبؔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ زمانے کی سرد مہری کو نہیں بھولتا، اس کا کلام اہل زمانہ کی رقابت اور بد ذوقی کا بلند بانگ نوحہ ہے، اس ضمن میں وہ انوریؔ کا ہمنوا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے۔

ای دریغا! نیست ممدوحی سزاوار مدیح

ای دریغا! نیست معشوقی سزاوار غزل

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے نادر خیالات اور پاکیزہ زبان سے زمانے کی سرد مہری اور معاندانہ رویے نے اُس کے مزاج میں کسی حد تک تعلّی اور خود بینی پیدا کر دی تھی،

غالبؔ نے قصائد نمبر اوّل، دہم، چہل و نہم، شصتم اور شصت و یکم عرفی کی طرحوں میں لکھے ہیں، اِن قصائد میں وہ اکثر بلندیٔ خیال، انتخاب الفاظ اور انفرادیت میں عرفیؔ کے ہم پلہ نظر آتا ہے، وہ براہِ راست اصل موضوع پر آجاتا ہے، اور لگی لپٹی نہیں رکھتا، اُسکی تشبیہیں ہمیں عرفیؔ کے قصائد یاد دلاتی ہیں، جن میں وہ اپنی صفات بیان کرتاہے، اور بے مصرف خیال آرائی اور لفظی بازیگری سے اجتناب کرتا ہے، اشعار

گویا اُس کے قلب وجگر سے خون کی صورت اس طرح پرورش کرتے ہیں، جیسے درخشاں موتیوں کے ہار، اور جب ہم اُس کی تشبیب پڑھتے ہیں تو مجموعی طور پر بہترین غزل کا تاثر پیدا ہوتا ہے، اور ہمارے سامنے حقیقت پسندانہ تصوّرات اور اعلیٰ شعریت کی انوکھی دنیا ہوتی ہے،

نظیری

نظیریؔ اس عہد کی رُوح تھا، اور اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا، اُس نے غالب کے فن اور ذہن پر بہت بڑا اثر مرتب کیا ہے، غالبؔ کے قصائد وغزلیات کے مطالعہ سے نظیریؔ کا رنگ جھلکتا ہے، نظیریؔ کا خیال بار بار اثر انداز ہوتا ہے، وہ زبان کو خیال سے ہم آہنگ کرتا ہے، نظیریؔ کی اہم خصوصیات، تراکیب کی تازگی، الفاظ کی شستگی اور شگفتگی، مراعاۃ النظیر کا آزادانہ استعمال، نادر تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال، مقامی رنگ، تخیل کی بلند پروازی، پُرخلوص اظہارِ خیال اور تغزل کی شیرینی، ہے اسی لئے اس کا کلام دلپذیر ہے،

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جو نظیریؔ کے مائدہ کا زلہ خوار تھا، اس کے کلام میں بھی ان اِن تمام خصوصیات کے علاوہ، اُسکی ذاتی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے، غالب کا تخیل زندہ تخیل ہے، جس میں بیباکی بھی ہے اور اُپج بھی، بنا بریں غالبؔ کو اگر نظیریؔ سے بلند مرتبہ نہیں تو اُس کے ہم پلہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ غرضیکہ اُس نے نظیریؔ کی اِس عمدگی سے پیروی کی ہے، اور اس کے اسلوب بیان کو اِس خوبی سے اپنایا ہے کہ پڑھنے والے ششدر اور حیران رہ جاتے ہیں، اور اُن کو اُستاد اور تلمیذ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، غالبؔ نے نظیریؔ کی خصوصیات میں رنگ بھرا ہے، مثلاً شخصی احساس، اختصار اور ایسے خیالات جو جاندار ہیں۔ اور جو حوصلہ مندی، آزادی اور انفرادیت کی ہوا میں سانس لیتے ہیں، ان اوصاف نے غالبؔ کی شاعری کے وقار اور تاثر کو بڑھا دیا ہے،

غالبؔ نے قصائد نمبر سوم، چہارم، نہم، یازدہم، پانزدہم، بست ویکم، پنجاہ ودوم

اور پنجاہ و ششم نظیری کے تتبع میں لکھے ہیں، اور نظیری نے رودکی، مسعودِ سعدِ سلمان، انوری، خسرو، اور خاقانی کی پیروی کی ہے،

ولیعہد شاہزادہ فتح الملک کی شان میں غالب کے قصیدہ کا مطلع ہے:

داورِ سلطان نشان آید ہمی سرورِ گیتی ستان آید ہمی

یہ قصیدہ فارسی شاعر کے باوا آدم رودکی کی اُس نظم کی پیروی میں لکھا گیا ہے جسکو سُنکر بادشاہِ وقت بغیر از کلاہ و پاپوش ایک جست میں ہرات سے بخارا پہنچ گیا تھا،ٰؒ سُنا ہے کہ ایران کے نغز گو شاعر امیر معزّی جو سلطان سنجر سلجوقی کا ملک الشعرا تھا، اِس قصیدے کی زمین میں قصیدہ نہ کہہ سکا، صد آفرین ہو ہندی نژاد غالب پر جس نے اِس عمدگی سے اِتنا بڑا قصیدہ کہہ دیا، یہ قصیدہ ۷۴۔ اشعار پر مشتمل ہے اور سلاست اور روانی کا بہترین نمونہ ہے،

غالب نے رودکی اور مسعود کی پیروی قصائد نمبر سوم، چہارم، یازدہم، سیزدہم پانزدہم، بست و ہفتم، سی و دوم، چہل و یکم دوم، پنجاہ و چہارم و ششم و ہفتم میں کی ہے، ان قصائد میں سوم، چہارم، یازدہم، سیزدہم، پانزدم، بست و ہفتم پنجاہ و چہارم و ششم، ہشتم میں انوری، ظہیر، نظیری، عرفی اور حزیں کی تقلید کی ہے، قصائد نمبر بست و یکم، سی و چہارم، پنجاہم، پنجاہ و دوم اور شصت و ششم انوری کی ناقابلِ تقلید پیروی میں لکھے گئے ہیں، قصائد نمبر اوّل، ششم، ہفتم اور سی و ہفتم خاقانی کی پیروی میں ہیں، اور قصائد نمبر بستم اور بست و پنجم خواجہ حافظ شیرازی کی دو غزلوں کے انداز پر ہیں، قصیدہ نمبر ہفدہم مرزا صائب کی اس غزل کی تقلید میں لکھا ہے، جس کا مطلع ہے:

پیشِ کسی کہ درد بہ درمان برابر است ہر خندۂ بزخم نمایان برابر است

ٰؒ بادشاہ امیر نصر بن احمد سامانی تھا، قصیدے کا مطلع ہے:

بُوئے جُوئے مولیان آید ہمی بوُئے یارِ مہربان آید ہمی

۳۔ قصائد کی خصوصیات

غالبؔ کے قصائد کی اہم خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں :

ا۔ ساخت

۱۔ تعدادِ اشعار میں اختصار

۲۔ "تشبیب" "مدح" سے زیادہ طویل

۳۔ "گریز" انوریؔ، عرفیؔ اور قاآنیؔ کے مقابلہ میں کمزور

۴۔ "مدح" حقیقت پسندانہ اور برمحل

۵۔ "حسن طلب" معدوم

۶۔ دعائیہ اشعار کم

ب۔ اسلوب

۱۔ مختصر اور چست بندش

۲۔ زور

۳۔ موسیقی

۴۔ روانی

۵۔ برمحل صنائع و تراکیب

ج۔ خیال

۱۔ انفرادیت

۲۔ گہرائی

۳۔ تسلسل

ا۔ ساخت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، غالبؔ نے کل ستّر قصیدے لکھے ہیں، طویل ترین قصیدہ ۱۱۲ اشعار کا ہے، اور مختصر ترین قصیدہ ۲۷۔ اشعار کا ہے، صرف چار قصائد میں تعداد اشعار سو سے زائد ہے، تقریباً ۴۵ قصائد میں

یہ تعداد ۵۰ اشعار تک ہے، تعداد اشعار کا اوسط ۶۹ ہے، اِس سے غالبؔ کے بیجا طوالت اور بے معنی اصراف الفاظ کا پتہ چلتا ہے،

یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ نیچرؔ خوشامد پسند اور دروغ گو نہیں تھا، نہ وہ جھوٹی تعریف کے تانے بانے بنتا تھا، وہ ایک بہادر اور نڈر سپاہی تھا، اُس نے لوگوں کے بارے میں بے خطر اپنی رائے کا اظہار کیا، یہ درست ہے کہ اُس کے بعض قصائد میں غیر ملکیوں کی بلند آہنگ مدح سرائی کی ہے، لیکن اِن لوگوں سے دیرینہ تعلقات کے مدِّنظر، ہم اُس کو معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُس کی زیست کا دارومدار انگریزوں کی مدح سرائی پر تھا، لہذا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کہ اُس نے اُن لوگوں کی تعریف کی، جن سے اُس کی زندگی کے مصارف وابستہ تھے،

غالبؔ کے زیادہ تر قصائد تمہیدیہ ہیں، اور اُس کی عظمت کے صحیح آئینہ دار ہیں، تشبیب میں وہ عام طور پر ذاتی احساسات اور جذبات کی نمایاں جھلک دکھاتا ہے، جو اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اثر انگیزی کی بنا یہی ہے، تشبیب ہی سے کسی فنکار کے فن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ قصیدہ کا غزلیہ جزو ہے، اور اس میں شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو نظم کرنے میں مختار ہوتا ہے، اس اعتبار سے غالبؔ کی تشبیب بڑے سے بڑے شاعر کی تشبیب سے کسی طرح کم نہیں، اس کو اپنی تشبیب پر بڑا ناز ہے، تفتہؔ کو ایک بار لکھا:۔

> "کیا کروں؟ اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا، وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی، کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردوں، میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے، اور مدح کے شعر کم تر،، [۳]

ایک اور خط میں تفتہؔ ہی کو لکھا:

---

[۳] خطوط صفہ ا

"بھائی، قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی اور انوری پہنچے ہیں، اُفتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستائش میں مجھ سے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا"، ؎ۂ

غالب کے قصیدوں میں زور بیان تمام کا تمام موجود رہتا ہے جس سے سارا قصیدہ ایک سلسلہ میں منسلک ہو جاتا ہے، حالی، 'یادگار غالب' میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتے ہیں:

"مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہیں، اور اس سے قصیدے کی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ..... مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں"،

غالب پورے قصیدے میں زور کا پہلو دبنے نہیں دیتا، جس سے پورا قصیدہ فن کا پختہ نمونہ بن جاتا ہے، وہ غلط مقاصد سے متنفر تھا، وہ ایک فنکار تھا، اور اس نے قصائد اس لئے نہیں لکھے، کہ اُن کے صلہ میں محض انعام حاصل کیا جائے، بلکہ اس لئے کہ اُس کی جبلّت اُس کو آبدار موتیوں کی تخلیق پر مجبور کر دیتی تھی، حتیٰ کے ان قصائد میں بھی جو حصول مقصد کی خاطر لکھے گئے، اُس نے اپنی عزّت اور وقار کو برقرار رکھا ہے، اس کے بہترین قصائد وہ ہیں جو اُسکے احباب اور مدّاحوں مثلاً شیفتہ، نیرّ، آزردہ وغیرہم کی تعریف میں لکھے گئے، یا پھر حمد و نعت و منقبت کے مضامین، شاہِ وقت اور والیان رامپور کی شان میں، باقی قصائد بھی محض بیکار خامہ فرسائی نہیں ہیں، بلکہ ہر اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، اس سے غالب کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کی تشبیب سے اُس کی مدح اور گریز اسقدر پُر زور اور پُر وقار نہیں ہوتے قاآنی اس فن کا بادشاہ ہے، وہ اصل موضوع کی طرف اتنی نفاست، خوبی اور چالاکی سے

ۂ ایضاً صفحہ ۱۷،

گریز کرتا ہے، کہ بیساختہ داد دینا پڑتی ہے، ہمارے شاعر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے، جہاں تک اصل موضوع کا سوال ہے، غالبؔ فطری طور پر مبالغہ آمیز مدح سے گریز کرتا ہے، وہ اپنے فن کو نااہلوں کی بیجان تعریف کے پُل باندھنے میں ضائع کرنا اپنی ہتک سمجھتا ہے۔

غالبؔ کے قصیدوں کی سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے، کہ اُن میں "حسن طلب" معدوم ہوتا ہے، وہ "دست غیب" کا قائل نہیں تھا، یہ قابلِ تعریف وصف غالبؔ کے مقصد کے خلوص کا بیّن ثبوت ہے، مختصر یہ کہ اس نے دوسرے قصیدہ نگاروں کی طرح اپنے فن کو ذلیل نہیں کیا، وہ تلمیذ رحمانی تھا، اس کے نزدیک شاعری ایک مقدّس امانت تھی، لہذا وہ اس کی دل وجان سے عزّت اور مخلصانہ آبیاری کرتا تھا؛ اس نے اسے روزی کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ فن سے محبت کی، بقولِ خود

شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فن ما   ما بنو دیم بدین مرتبہ راضی غالبؔ

اُس نے شاعری کی پرورش خونِ دل سے کی ہے، شاعری کا جذبہ اُس کے لئے فطری تھا، اُس نے اپنے تخیل کی خوشبو ہر سُو پھیلائی، اور گوناگوں پھول نچھاور کئے، اُس نے اپنی پوزیشن صاف لفظوں میں واضح کردی ہے:-

"منت خدای را...... کہ زبان را جز بہ ستایشِ یاران، دلفرینِ خویش نکشادہ، نہ دلکش نوایم، نہ ہرزہ فروشم، نہ تحسین فروشم، نہ تحسین خریدارم، نہ شعر فروش" [۵]

ب۔ اسلوب

اختصار نکتہ سنجی اور ذہانت کی جان ہے، اختصار الفاظ میں شوکت دقار، اور خیال میں وسعت پیدا کرتا ہے، ایک قادر الکلام شاعر کوزے میں دریا بند کردیتا ہے، غالبؔ کے یہاں اختصار حد درجہ کو پہنچ چکا ہے[۶]، وہ اس بات کا خاص لحاظ رکھتا ہے، کہ صرف

---

[۵] کلیاتِ نثر صف ۵۷، [۶] وہ کہتا ہے: "میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا، کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں" خطوط صف ۲۵

وہی الفاظ استعمال کئے جائیں، جو خیال کی صحیح ترجمانی کرتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ اُس کا کلام دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے، وہ غیر شعوری طور پر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، جو اُس کے اشعار کے نغمائی اثر کو فزونی بخشتے ہیں، اور خیال کی منزلت میں اضافہ کرتے ہیں۔

غالبؔ نہ صرف وسیع المطالعہ تھا، بلکہ زبان کے رگ و پے سے آشنا تھا، اور اسکی تمام نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف تھا، وہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ صرف موزوں ترین الفاظ کے ذریعہ خیال ادا کیا جائے، اس کے اسلوب کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اُس کا ہر لفظ خیال سے ایسی ہم آہنگی رکھتا ہے، جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

اختصار سے اسلوب پُرزور، برمحل اور برجستہ ہو جاتا ہے اور بندشوں میں سستی یا ڈھیلا پن نہیں رہتا، نیز زبان پُرزور، جذباتی اور پُراثر ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اس اہتمام سے ادا کئے ہوئے خیالات قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

انگریزی کا شاعر آلگرینن سوِن بَرن صنعت تجنیس استعمال کرنے کا اِس قدر دلدادہ تھا، کہ اکثر مفہوم کو صوتی تاثر پر قربان کر دیتا تھا، وہ اس بات کی کوشش کرتا تھا، کہ خیال کی نشتریت اور جوش کی بہ نسبت، زبان کی غلغلہ انگیزی بھاری ہے، برعکس اِسکے ہمارا شاعر، ایک کامل اسلوب کا مالک ہے، اور شعوری طور پر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، جو تغزل کی موسیقی بھی ہوں، اور خیال کی واضح ترجمانی بھی کرتے ہوں، وہ ایسی بحریں تلاش کرتا ہے، جن میں زیر و بم کے ساتھ نپا تُلا نغمہ ہوتا ہے،

ج۔خیال

خیال کی انفرادیت، گہرائی اور تسلسل پر بحث آگے چل کر قصائد پر مزید تنقید کے سلسلے میں کی گئی ہے،

فصل چہارم

قصائد کا تنقیدی مطالعہ

غالبؔ، قصائد کو بہ اعتبار حروفِ تہجّی ترتیب دینے کے خلاف تھا، موجودہ ترتیب میں اُس کے قصائد کو "بکھرے ہوئے موتی" کہا جا سکتا ہے، تفتہؔ کو ایک بار غالبؔ نے مشورہ دیا تھا:۔

"ہزار آفریں، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ واہ، چشم بد دُور، تسلسلِ معنی، سلاستِ زبان!...... خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس[۲] جزو قصائد کا کہہ لو، مگر خبردار! قصائد بہ حروف تہجی نہ جمع کرنا"[۱]

غالبؔ کے قصائد کی تقسیم مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) حمد، نعت اور منقبت میں،

(۲) شاہان و شہزادگانِ مغلیہ کی مدح میں،

(۳) برطانوی حکام کی مدح میں،

(۴) والیانِ ریاستہائے رامپور، اودھ، پٹیالہ، الور، ٹونک اور وزیر اعظم حیدر آباد کی مدح میں،

(۵) ہندوستانی دوستوں اور مدّاحوں کی تعریف میں،

(۶) فخریہ قصائد،

---

[۱] خطوط صفحہ ۷۹،

پہلا قصیدہ حمد میں ہے، قصائد نمبر ۲ تا ۱۲ نعت اور منقبت ائمہ کے مضامین پر مشتمل ہیں، قصیدہ نمبر ۱۳ اکبر شاہ ثانی کی واحد مدح ہے، پندرھواں اس کے بیٹے بہادر شاہ ثانی سے خطاب ہے، قصائد نمبر ۲۹-۳۰-۳۱ اور ۷۰ ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ہیں، برطانوی حکام، جن کی مدح میں قصائد لکھے، لارڈ آکلینڈ، لارڈ آلن برا، چارلس مٹکاف، سر جیمس ٹامس، مسٹر پرنسپ، سر ٹامس میڈاک، اینڈریو آسٹرلنگ ولیم فریزر، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ کیننگ، لارڈ ایلجن، سر جان لارنس، سر بنجامن ایڈ ماقسٹن، اور سر رابرٹ منٹگمری ہیں، قصائد نمبر ۳۲ تا ۴۵ اور ۶۵ علی الترتیب انہیں لوگوں سے متعلق ہیں، ولی عہد شہزادہ فتح الملک کو تین قصائد ۴۶، ۴۷، اور ۴۸ کا ممدوح ہونے کا شرف ملا، اُنچاسواں قصیدہ نصیر الدین حیدر کی شان میں ہے اور پچاس واں امجد علی شاہ والیٔ اودھ کی تعریف میں ہیں، قصائد نمبر ۵۱، ۵۲ اور ۵۳ واجد علی شاہ اختر کی شان میں ہیں، ۵۴، ۵۵، ۵۶ اور ۶۸ نواب یوسف علی خاں کی مدح میں اور ۶۷ اور ۶۹ نواب کلب علی خاں کی تعریف میں، بقیہ قصائد ۵۷ تا ۶۳ والیانِ ٹونک، الور، پٹیالہ، اور نواب مصطفےٰ خاں، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں، اور وزیر اعظم ریاست حیدر آباد کی تعریف میں ہیں، چونسٹھواں قصیدہ فخریہ ہے۔

اب ہم ان قصائد پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے،

حمد باری تعالیٰ (پہلا قصیدہ)

یہ قصیدہ حمد اور خالق حقیقی کی صنعتوں کے ذکر میں ہے اور براہ راست حمد ہی سے شروع ہوتا ہے، یہ عُرفی کے اُس قصیدے کے تتبع میں ہے جس کا مطلع یہ ہے

ای متاعِ درد در بازار جان انداختہ
گوہر ہر سُود در جیب زیان انداختہ

اِسی زمین میں عُرفی کے بھی دو قصیدے ہیں، جن کے مطلع حسب ذیل ہیں۔

(۱) ای جلالت، فرشِ ذاتِ جاودان انداختہ
عکس نورت، تابشی در کن فکان انداختہ

(۲) ای جمالت، عرشِ ذاتِ جاودان انداختہ
گوئی در میدانِ وحدت کامران انداختہ

اِسی طرح میں مرزا صائب کی غزل ہے:

نامۂ رُوی تو، پرتو در جہانِ انداختہ
پیشِ ہر پروانہ، گنجی شائگان انداختہ

خاقانی کا ایک قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

خورشیدِ کسریٰ تاج بین، ایوان نو پرداختہ
یک اسبہ برگوی فلک، میدان نو پرداختہ

انوری کے قصیدہ کا مطلع ہے:

ای زیزدان تا ابد، ملک سلیمان یافتہ
ہرچہ جستہ از نظر، از فضلِ یزدان یافتہ

قاآنی کا قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

عیداست، وساقی در قدح صہبا زمینا ریختہ
درگوہر الماس گوُن لعل مصطفیٰ ریختہ

غالب نے یہ قصیدہ لکھ کر اپنے دوست اور رہنما جناب مولوی فضلِ حق خیرآبادی کو ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا:۔

"درین رُوزہا ہوائی آن در سر اُفتاد، کہ بیتی چند در توحید مجیبا بہ عُرفی گفتہ آید، چوُن کوششِ اندیشہ بجای رسید، کہ نہ عُرفی را محل ماند، و نہ مرا جای، ناگزیر آن ابیات را بر کسی عرضہ میدارم، کہ چوُن منی صد و عُرفی صد ہزار را بسخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک بہ ہر یک تواند نمود،" ؎۲

؎۲ کلیات نثر صفحہ ۱۹۶

اگرچہ یہ قصیدہ مختصر ہے، لیکن بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس میں غالب اپنی ذات کا اِدراک رکھتے ہوئے، عُرفی کے مقابلے پر اُتر آیا ہے، حقیقت ہے، کہ وہ عُرفی کا ہم پلہ ہوگیا ہے، بلکہ زبان و خیال کے اعتبار سے اُس سے بازی لے گیا ہے، اس میں تخیل پاکیزہ اور بلند ہے، اور زبان بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔

غالب قصیدہ براہ راست خدا سے تخاطب سے شروع کرتا ہے، جسے وہ بازیگر کہتا ہے، کیونکہ اُس نے بے شمار اشکال، چہرے، ہیولے، شخصیتیں، نسلیں اور رنگ پیدا کئے، مگر خود پسِ پردہ رہ کر فلسفیوں کے عقلی معرکے دیکھا کرتا ہے، شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، کہ کثرت اور تنوع کی اس کائنات سے صرف خالق حقیقی کی وحدت نمودار ہوتی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں

ای ز وہم غیر غوغا در جہان انداختہ — گفتہ خود حرفی و خود را در گمان انداختہ
نقش بر خاتم ز حرفِ بی صدا انگیختہ — شور در عالم ز حسنِ بی نشان انداختہ
عاشقان در موقفِ دار و رسن وا داشتہ — غازیان در معرضِ تیغ و سنان انداختہ
رنگہا در طبع اربابِ قیاس آمیختہ — نکتہا در خاطرِ اہل بیان انداختہ
باچنین ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مُردہ را از خویش در یا بر کران انداختہ

آخری شعر دیکھئے، کس قدر پُر مغز اور تیکھا ہے، یہ ایک حقیقت ہے، کہ سمندر مُردہ جسم کو اندر نہیں رکھتا، وہ اُسے کنارے پر پھینک دیتا ہے، اِسی طرح غالب کے نزدیک "دوئی" ایک لاش ہے، جسے دریائے وحدت کنارے پر پھینک دیتا ہے، یہ کس قدر خوبصورت اور نادر خیال ہے!

قصیدے کے دوسرے حصّے میں غالب نے عُشاقِ وحدت کی قدر و قیمت بیان کی ہے جو ناقابلِ بیان صعوبتیں جھیلتے ہوئے بھی ہمت و استقلال کا دامن اس وقت تک نہیں چھوڑتے، جب تک معرفت الٰہی کی دولت سے مالا مال نہیں ہو جاتے، ذیل کے اشعار کی معنی آفرینی ملاحظہ ہو:

تا بود عاشق بزندانِ عدم دائم اسیر — در نہادش شور سودای دہان انداختہ

تا بود شاہد بہ آزارِ دلِ عاشق اسیر — در دلش ذوقِ سماعِ "الامان" انداختہ
غم چو گیرد سخت، نتوان شکوہ از دلدار کرد — بہرِ آسانی، اساسِ آسمان انداختہ
گل چو مانند دیر، گردد بر دلش بازار سرد — بہرِ تجدیدِ طرب، طرحِ خزان انداختہ
جادہ پیمایانِ راحت، نہ فلک را چوں جرس — در گلوی ناقہای کاروان انداختہ
سر بہ تیغ از دوش جانبازان سبک بر داشتہ — بار بر دلہای نامردان گران انداختہ
ذوقِ تمکین گدایانِ تو گنج شاہ را — از دلِ رنجور، و چشمِ پاسبان انداختہ
تا علاجِ خستگی آسایش دیگر دہد — خارہا در رہ گذارِ میہمان انداختہ

ان اشعار میں غالبؔ نے شیفتگانِ ذاتِ الٰہی کے مصائب اور تنہائیاں ناقابلِ اتباع اسلوب میں بیان کی ہیں، عشقِ الٰہی گلزار نہیں، کانٹوں کی سیج کا نام ہے، پے در پے رکاوٹیں در پیش رہتی ہیں، یہاں تک کہ ایسی منزل آجاتی ہے، جہاں کم حوصلہ فرومایہ اور مذبذب سالک، ایک ایک کرکے ہمت ہار بیٹھتے ہیں، اور منزلِ مقصود تک کی رسائی صرف اُن پُر عزم اور سخت کوش افراد کے لئے مخصوص رہ جاتی ہے، جو "وفاداری بشرطِ اُستواری" کے مصداق، تمام رکاوٹوں اور دشواریوں سے گذر جاتے ہیں، اقبالؔ نے سچ کہا ہے

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی — حیاتِ جاودان، اندر ستیز است

زندگی دلیروں اور جانبازوں کو زیب دیتی ہے،

آخر میں، شاعر اپنا تذکرہ ایسے انداز میں کرتا ہے، اور طالبِ توجہ بن کر، ہزاروں منکرات و معاصی کے باوجود بہشت کی توقع کرتا ہے، بقول خود

سوخت عالم را صریرِ کلکِ من، غالبؔ منم — کآتش از بانگِ نی اندر نیستان انداختہ
زانکہ این تُرکِ تباہ اندیشہ در عنوانِ حمد — حرفی از فقر و فنا اندر میان انداختہ
تا شناسد حدِّ خود زین سرزنش، خود را بقہر — در تمنای بہشتِ جاودان انداختہ
این گران جان عندلیبِ بینوا کاندر خیال — شاخِ طوبیٰ را ز بارِ آشیان انداختہ
زاہلی سنجد کہ رضوان در ہوای مقدمش — طرحِ جشنِ تازہ در باغِ جنان انداختہ

رسول اللہؐ کی شان میں (تیسرا قصیدہ)

یہ قصیدۂ نابغہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی شانِ مبارک میں لکھا گیا ہے، اور غالب کا شاہکار ہے، اِس میں غالب کا فن انتہائی عروج پر نظر آتا ہے، اِس کا نغمائی زیر و بم، بحر و خیال کا امتزاج، تخیل کی انوکھی جدت و خیز خیالات کی فراوانی، الفاظ کی روانی، صنائع کا حسن و وقار، اور جادو بیانی، اِس کو بلند ترین مقام پر فائز کرتی ہے، یہ عطیۂ وجدان ہے، یہ الہامی نظم ہے، بنا براین اِس کو فن کی دنیا میں بہترین تخلیقات میں شمار کیا جانا چاہیئے، یہ قصیدہ اور قصیدہ نمبر ۸ ظہیر فاریابی کے مندرجہ ذیل قصیدے کی زمین میں لکھے گئے ہیں:۔

چون بر زمین طلیعۂ شب گشت آشکار
آفاق ساخت کسوتِ عبّاسیان شعار

اس طرح میں مسعود سعد سلمان کے پانچ قصیدے ہیں، ایک کا مطلع ہے:

این آتشِ مبارز، و این بادِ کامگار
وین آبِ تیز قوّت، و این خاک مایہ دار

الوری کے قصیدے کا مطلع یوں ہے:

دی بامدادِ عید کہ بر صدرِ روزگار
ہر روز عید باد، بتائید کردگار

رودکی کا قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

ای ملک را جمالِ تو افزودہ کاروبار
مسعود بیخ و شاخ تو، مسعود برگ و بار

نظیری نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے، مطلع ملاحظہ ہو:

نوروز شد کلیدِ درِ عیشِ نو بہار
دولت شگوفہ کرد کہ فتح آورد بہار

شیخ علی حزین کا مطلع ہے:۔

چشمم کشودہ است در فیضِ نوبہار
از داغ ریختہ است، دلم طرح لالہ زار

طوالت کے اعتبار سے یہ دُوسرا بڑا قصیدہ ہے، سب سے طویل قصیدہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں لکھا ہے، اِس کو غالب نے کلکتہ سے دہلی آتے ہوئے لکھا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

داغی بدل ز فرقت دہلی نہادہ ام — کش غوطہ دادہ ام بجہنم ہزار بار
بخت از سواد کشور بنگالہ طرح کرد — بر خویش رخت ماتم ہجران آن دیار

سچ تو یہ ہے کہ ایسا انتخاب الفاظ اور ایسی برمحل ترکیبیں، ایسی چست بندشیں، تخیل کی بلند پروازی، خیال کی یہ کیفیت، بیان میں روانی، جوش و خروش، ولولہ اور منظر نگاری، غالب کے دوسرے قصیدوں میں نہیں پائی جاتی ہے، یہ قصیدہ زندگی کی آگ سے روشن کیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جیسے شیکسپیئر اگر ہیملٹ کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتا، تب بھی وہ شیکسپیئر ہی ہوتا، بعینہٖ غالب کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی، اگر وُہ اِس عظیم الشان قصیدے کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتا۔

یہ قصیدہ غالب کے عظیم فن کا شاہکار ہے، جس میں شاعری کے تمام حُسن و روایات بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس میں شاعر نے اپنے دل کی دھڑکنیں ایسی فنکاری اور برشتگی کے ساتھ سمودی ہیں، کہ پڑھنے والا اس فن پارے میں چھپی ہوئی شاعرانہ شخصیت سے مرعوب ہو جاتا ہے، یہ قصیدہ غالب کو نظیری اور عرفی کے دوش بدوش بٹھاتا ہے، چونکہ یہ پختہ عمر میں لکھا گیا ہے، اس لئے اس میں جوانی کا ولولہ بھی ہے، پختگی خیال کی ہوشمندی اور دانشمندی بھی، یہ قصیدہ غالب کے دل کی آواز ہے، اس کی روح کا نغمہ ہے، اس کے رنگ شباب اور اندوہگین زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

شروع میں غالب اُس زمانے پر نظر ڈالتا ہے، جب نوجوانی کی سرشاریاں

عروج پر تھیں، اور ہماری نظروں کے سامنے وہ مناظر لاتا ہے، جب اُس پر زمانے کی کاری ضرب زندگی کی رنگینی و خوشحالی پر نہیں پڑی تھی، اُس نے ایام جوانی کی لغزشوں اور رنگینیوں کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے، تشبیہات کی معنویت ملاحظہ ہو:

آن بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار — بُود آشیانِ من شکنِ طرّۂ بہار
آن ساقیم کہ از اثر رشحۂ کفم — خمیازہ را بموجِ گل اپناشتی خمار
آن مطربم کہ سازِ نوای خیال من — غیر از کمند جاذبۂ دل نداشت تار
آن کوکبم کہ در تب و تابِ نورد شوق — اوجِ من از رسیدنِ می یافتی قرار
آن ریشۂ نگاہٴ امیدم کہ دم بہ دم — بُود از نمِ طراوتِ دِل شوقم آبیار
ہر غنچہ از دمم بفضای شگفتگی — فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ را زمن بتقاضای دلبری — از غنچہ بود محملِ نازی بر ہگزار
ہم سینہ از بلای جفا پیشہ دلبران — فرہنگ کاروانیٔ بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادای مغان شیوہ شاہدان — فہرستِ روزنامۂ اندوۂ انتظار
ہم در زمانہ بہرِ رواج نشاط خویش — ہم در میانہ از اثر عکس رُوی یار
پیمانہ را بہ نرخِ چمن دادمی بہار — آئینہ را بموجِ شفق مُژدۂ کنار
شوقم جریدۂ رقم آرزُوی بوس — ذوقم قلمروِ ہوسِ مُژدۂ کنار
فکرم بجیب شاہدِ اندیشہ گلفشان — کلکم بطرف گلشنِ نظارہ لالہ زار
از چشم و دل نہادِ مرا بود تاج و تخت — وز رنگ و بو بساطِ مرا بُود پُود و تار
بختم بجیب عشرتیان می فشاند گل — سعیم زپای محنتیان می کشید خار
وقتِ مرا روانیٔ کوثر در آستین — بزم مرا طراوت فردوس در کنار
ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سُرور و سُور — پیوستہ شعر و شاہد و شمع و می و قمار
باکیسہ در خُصومت و باکاسہ در لجاج — رندانِ پاکباز و شگرفانِ شادخوار
بدمستیٔ شبینہ و خواب سحر گہی — رنگینیٔ سفینہ و اشعار آبدار

یہ خاص طور پر ہندوستان کے مانی کی واضح مصوّری ہے، اِن اشعار میں صنائع کا تنوع قابلِ رشک ہے، اور زورِ بیان اور روانی اُس پر مستزاد ہے۔

اگلے پچیس۲۵ اشعار میں شاعر نے خوشحالی کے ابتدائی ایام کا مُوازنہ آخری ایام کی محرومیوں سے کیا ہے اور اُس زمانے کی رنگینی اور بے فکری کا مقابلہ ناقابل بیان صعوبتوں سے کیا ہے، جب غالب زندگی کے بحرِ بیکراں کے منجدھار طوفان کے تھپیڑے کھا رہا تھا، المیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اکنون منم کہ رنگ بُرویم نمی رسد — تا رُخ بخونِ دیدہ بشویم ہزار بار
نم در جگر نماندہ ز تر دستیٔ مژہ — دل را بہ پیچ و تابِ نفس میدہم فشار
چشمم کشودہ اند بہ کردار ہای من — ز آیندہ ناامید و از رفتہ شرمسار
در پیکرم ز درد و دریغست جان و دل — در بسترم ز خارہ و خار است پود و تار
ہم تن ز ضعف وقف شکنہای بیحساب — ہم دل ز رنجِ داغِ المہای بے شمار
از خونِ دیدہ ہر مژہ ام شاخِ ارغوان — وز سوزِ سینہ در نفسم تابِ لالہ زار

کاشانۂ مرا در و دیوار شعلہ خیز
ہمسایۂ مرا سر و دستارِ پُر شرار

غالب انبیا علیہم السلام کی کہکشاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کرتا ہے اور کہتا ہے:-

آن ابتدای خلق کہ آدم درین نورد
ہمچو امامِ سُبحہ، برون است از شمار

حضرت علیؓ کی شان میں (چھٹا قصیدہ)

یہ قصیدہ بھی غالب کے طویل ترین قصائد میں سے ہے، اس میں کل سو اشعار ہیں جو بہ اعتبار ابجد لفظ علی کے ہم عدد ہیں، مندرجۂ ذیل شعر میں اشارہ موجود ہے:

نُطقم بشمارِ عدد صرفِ علی شد
در رشتۂ تحریر ز شوخی گوہر آما

متصوفانہ لب و لہجے نے اِس کو نرم اور سنجیدہ بنا دیا ہے، غالب نے اس قصیدے کی تشبیب سے بہتر کوئی تشبیب نہیں لکھی، تشبیب کے اشعار کی تعداد ساٹھ ہے، جن میں خیال کی رنگا رنگی ہے۔

یہ قصیدہ اُس زمانے کی تخلیق ہے، جب شاعر کے ذہنی بالیدگی اور طبیعت کی سنجیدگی شباب پر تھی، اس میں ایسے ذہنی سکون و طمانیت کا پتہ چلتا ہے، جو ہمارے شاعر کو کم نصیب ہوئی، ایسے لمحات اُس کی زندگی میں کم آئے، اور جب آئے، تو غالب نے انہیں اپنی گرفت میں لاکر بہترین تخلیقات پیش کی ہیں، اس کے علاوہ یہ خیال کہ مدح کشتی کے ناخدا کی ہے، اُس کا تخیل اور بڑھ گیا، اِس خیال نے بھی سکون و سنجیدگی بخشی،

حسبِ معمول، قصیدے کا آغاز اپنی ذات کی تعریف سے ہوتا ہے، اِس قصیدے کی بحر، مترنم، اور روانی، فطری ہے، اپنے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

میراث رسیدہ است ز خونین نفسانم ۔۔۔ داغی شرر اندای و بیانی جگر آرا
یابی تہ خاکستر ہر حرف شراری ۔۔۔ آتشکدہ کا داست دمم پارسیان را
از بسکہ سیہ مست می جنبش کلکم ۔۔۔ در پردۂ ہر نفس دلم میرود از جا
آنم کہ رباعی ز غزل باز ندانم ۔۔۔ تاریخ بمعنی نشناسم ز معما

معنی آفرینی اور علوِ جذبات ملاحظہ ہو:۔

دل می طلبد دوستی و دشمنی خلق ۔۔۔ لب تشنۂ خون اند چہ اعدا چہ احبا
ہش دار کہ مجنون نتوان شد بتکلف ۔۔۔ دیوانہ توان گشت ولیکن بمدارا
آزادگی از موج برد برد گلیمم ۔۔۔ ورنہ من واین دعوئ واین حوصلہ حاشا
نفرین نزند سیلیٔ صرصر بچراغم ۔۔۔ تحسین نہ دماند نمکم ریخت بہ صہبا

زور عشق کے بیان میں ذیل کے اشعار تڑپتی ہوئی رُوح کی آہ و بکا سے مملو ہیں، پڑھنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے، کہ اگر وہ خلافِ شرع عمل کرتے ہیں، تو یہ عمل شعوری نہیں ہوتا، بلکہ منصور کے مانند سرمستیٔ عشقِ ازل کی ترنگ ہوتی ہے، وہ کہتا ہے:۔

بیسراہ اگر گام زنم، خردہ مگیرید   در عربدہ راہم ز درازی است بہ پہنا
با نغمۂ مطرب نتوان شد متعصب   از جلوۂ ساقی نتوان کرد تبرا
شوق است کہ چون نشاۂ توحید رساند   از دار برد پایۂ منصور ببالا
شوق است کہ فرہاد از و مرد بسختی   شوق است کہ مجنون شد از و بادیہ پیما
شوقم ہمہ راز است و من عربدہ ہرگز   سوزم ہمہ ساز است من و شکوہ مبادا
گر مہر و گر کین ہمہ رعنائی وہم است   شاد آنکہ بہ نیرنگ نگردد فریبا
اندیشہ دو صد گلکدہ گل بردہ بدامن   اما ہمہ از نقش و نگار پر عنقا

غالب اپنے مخالفین کی نگارشات سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، اور انہیں پر کاہ کے برابر بھی نہیں گردانتا، جو سطح سمندر پر بغیر کسی مقصد کے تیرتے رہتے ہیں، ہوا جہاں چاہتی ہے، انہیں لے جاتی ہے، غالب دوسرے آب و گل کا بنا ہوا تھا، اس نے رائے عامہ کے سامنے سر نہیں جھکایا، وہ اپنی ذات میں ایک ارادہ تھا، گویا وہ کسی اور سیارے کا باشندہ تھا، وہ کہتا ہے:-

قانع بہ سخن نیستم و باک ندارم   نز خویش سپاس است و نہ از غیر محابا
نظارگئ جلوۂ اسرار خیالم   در آئینۂ چشم حسود و دل اعداء
ز آویزش دونان ز سخن باز نمانم   سیلاب مرا زین خس و خاشاک چہ پروا

اس کے بعد، غالب تصوف کی سرحد میں داخل ہوتا ہے، اور اس کے کوائف بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتا ہے، خیال کا تسلسل اور زبان کی روانی ملاحظہ ہو:-

وحدت ہمہ حدی است معین کہ خود از وی   ہستی ہمہ جز نیست حقیقی کہ مراد را
طرفی نتوان بست بسر گرمئ اوہام   ہرگز نتوان کرد پراگندہ براجزا
پیدا و نہان مشغلۂ حب ظہور است   چون پردہ برافتد نہ نہان است نہ پیدا
ایمان من، ای لذت دیدار کجائی؟   در کام مذاقم بچگان رشحۂ الا
آن رشحہ کہ گوئی ز گران مایگئ ناز   مہریست بہ گنجینۂ کیفیت اسما
آن رشحہ کہ ساریست در اعداد چو واحد   آن رشحہ کہ حالیست بصورت چو ہیولا

آن رشحہ کہ آئینۂ تصور نمائیست — اسرار ورقہای حیات ابدی را
آن رشحہ کہ گرد در طلبش باز شتابند — کوشش زعرق مزد دہد لؤ لوئی لالا
آن رشحہ کہ گرد در صدفش باز چکانند — ازموج گہرہا دمد انگارۂ دلہا
آن رشحہ کہ بی خواست چکد از کف ساقی — درعرض قدح در زدن اندر خم صہبا

اس کو بھی قصیدۂ نابغہ کہا جا سکتا ہے، عظیم فنکار کے سوا کوئی غالب کی برجستگئ خیال اور روانئ اُسلوب کو نہیں پا سکتا، جو اس قصیدے کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اتنے بڑے نغز گو کو جو صف اوّل کے شاعر کا ہم پلّہ تھا، نظر انداز کرنے والے بد ذوق اور کوُر عقل تھے؟ یہ بد ذوقی اُس کے عہد پر ایک بدنما داغ ہے،

حضرت امام حسینؓ کی شان میں (دسواں قصیدہ)

یہ قصیدہ، جو بحر کے زیر و بم، الفاظ کے ترنّم اور صوتی اثرات کی بنا پر ممتاز ہے، عرفی کی مندرجۂ ذیل لاثانی غزلوں کی پیروی میں لکھا گیا ہے:

دانی کہ چیست مصلحت ما، گریستن — پنہان ملول بودن و تنہا گریستن
خوش درخوراست حسرت تو با گریستن — بی باد تو حلال مبادا گریستن

اسی طرح میں صائب کی ایک غزل ہے۔

چندای دلِ غمین بمدارا گریستن
عیب است قطرہ قطرۂ دریا گریستن

غالب نے لکھا ہے، کہ طالب آملی کا ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے، [۳]
دراصل یہ قصیدہ عرفی کی ایجاد کردہ طرح:

عرفی اگر بہ گریہ میسّر شدی وصال
صد سال میتوان بہ تمنا گریستن

---

[۳] کلیاتِ نثر صفحہ ۲۰۱،

کی زمین میں ہے، اس کی فرمائش نیّر رخشاں نے ایک مشاعرے میں کی تھی، ؎۴
حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ میر نظام الدین ممنون کے مدرسہ میں ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا، میر صاحب ۱۸۴۱ء کے لگ بھگ ایسے اجتماعات کیا کرتے تھے۔ ؎۵
غالب نے شیفتہ کو لکھا:۔

"امیدگاہا! آدینہ روز بود، و نوید بزم سخن افروز، شامگاہ ہمال دو فرخ سروش، از در در آمدند، و مرا بہ انجمن بردند، و میر نظام الدین ممنون، و مولوی امام بخش صہبائی چون رنجور بودند، نیامدند، کس بخدمت آزردہ فرستادہ شد، اگرچہ دیر آمدند، اما آمدند، و دلم را صفا و زبانم را نوا بخشیدند، بندہ را در زمین "گریستن" نگارش قصیدہ افتادہ بود، آن می سنجیدم، کہ این ورق چون برات نامقبول باز برم وریختہ گویان را دردِ سر ندہم، از آمدنِ حضرتِ آزردہ دِل بخود بالید، و زبان بزمزمہ دستوری داد، سحابی نیز ناخواندہ حاضر بود، و در زمین "گریستن" غزلی انشا کردہ، چون قصیدۂ مرا شنود، خجل شد، و از گفتۂ خود لختی خواندہ در گذشت"۔ ؎۶

مومن خاں مومن کی ایک غزل اس زمین میں ہے، بقول حالی، جب غالب یہ قصیدہ پڑھ رہا تھا، تو مجمع ہمہ تن متوجہ تھا، اور ہر شخص اشکبار تھا، اور ساری محفل مجلس عزا معلوم ہوتی تھی، اتفاقاً بوندا باندی شروع ہوئی، تو آزردہ نے کہا: "آسمان ہم گریست" حالی ہی نے بیان کیا ہے، کہ ایک بار بصرہ کے ایک اجتماع پر اس قصیدے نے عالم حیرت طاری کر دیا تھا۔

اِس قصیدے کے ۶۳ اشعار ہیں یہ تین حصّوں میں منقسم ہے، ہر حصہ مطلع سے شروع ہوتا ہے، پہلا ہی مطلع نشتر لئے ہوئے ہے،

؎۴ یادگار صفہ ۲۰۱، ؎۵ ایضاً صفہ ۲۰۲، ؎۶ ایضاً صفہ ۲۰۲

ابر اشکبار، و ما خجل از نا گریستن
دارد تفاوت آب شدن، تا گریستن

رونا غذا ہے، یہ ذہن کو مجلا کرتا ہے، اور اس کرب سے نجات دلاتا ہے، جو اگر "دل نشین" ہو جائے، تو مہلک ہوتا ہے، اِسی لئے غالب کا دل جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی کس مپرسی اور ناقابلِ بیان مصائب، پر لبریز غم تھا، کھُلا اور اتنا کھُلا کہ اشکوں کی بارش ہونے لگی، اِسی لئے کہا ہے:۔

ہر قطرہ اشکم آئینہ رونمای تست　　　بتخانۂ منست ہمانا گریستن

اس شعر کی تشریح دیکھئے:۔

از دل غبار شکوہ بشستن نمی رود　　　گفتن مکدر است و مصفا گریستن

جو لوگ دنیوی سود و زیان پر روتے ہیں، اُن پر کیسے اچھوتے انداز میں طنز کیا ہے:۔

کفر است کفر، در پئ روزی شتافتن　　　ننگ است ننگ، در غم دنیا گریستن
گاہی بداغ شاہد و ساقی گداختن　　　گاہی بمرگ مامک و بابا گریستن
باید بدرد ہرزہ گرستن دگر گریست　　　بیجا گریستیم و دریغا گریستن

آخر میں امامؑ سے مخاطب ہوئے شاعر یقین دلاتا ہے، کہ ساری دنیا اُن کے مصائب میں اب تک برابر کی شریک ہے، وہ کہتا ہے:۔

چوں رزق غیب در د ترا عام کردہ اند
سر میزند ز مؤمن و ترسا گریستن

حضرت عباس علمدار کی شان میں (گیارھواں قصیدہ)

یہ مختصر مگر پُر مغز اور اہم قصیدہ عرفیؔ کے مندرجۂ ذیل قصیدے کی زمین میں لکھا گیا ہے:۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را　　　ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

غالباً عرفیؔ نے انوریؔ کی پیروی کی تھی جس کا مطلع ہے:۔

ای قاعدۂ تازہ ز دست تو کرم را ای مرتبۂ نو ز بنان تو قلم را

انوری نے رونی کی تقلید کی تھی، جس کا قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

امروز نشا طیست فرہ فضل وکرم را وامروز وفا قیست عجب تیغ وقلم را

ظہیر کی ایک غزل ہے:۔

صیاد نہ بندد رہ آہوی حرم را کز آہوی چشمان تو آموختہ رم را

حزین کے دو قصائد اسی طرح میں ہیں، ایک کا مطلع ہے:

یک پردہ نشیداست صلاگوش اصم را ناقوس صنم خانہ و لبیک حرم را

نظیری کا قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

چندین بغلط بتکدہ کردیم حرم را وقت است کہ ازکعبہ برآریم صنم را

یہ قصیدہ جرأت مندانہ انداز میں لکھا گیا ہے، اور عرفی کے قصیدہ کی طرح اس میں بھی شاعر کی آزادئ فکر وعمل، خاندانی نجابت اور عظمت کے نشان ملتے ہیں، غم کی تصویر کھینچی ہے، ملاحظہ ہو:۔

حاشا! کہ زغم نالم، اگر غم غم عشق است
پیوند نشاط است بدین زمزمہ دم را

غم کاسۂ سم بود، فگندند درین خاک
وآن خاک تبہ کرد گوارائی سم را

این چرخ ستم گر کہ چون من غرقۂ خون باد
بایکدگر آمیخت دوصد گونہ الم را

گویند کہ با دست تہی عشق وبال است
افتادہ برین قاعدہ اجماع امم را

شاعر عشق کے آلام وکرب کی آرزو کرتا ہے، اور غم کو ایسے ساغرِ ستم سے تعبیر کرتا ہے، جو عالم انسانیت کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، وہ اپنی نجابتِ اصلی علمی صلاحیت اور مرتبہ پر مطمئن نظر آتا ہے، اور کہتا ہے:۔

گوہر نہ بکان، کان بگوہر، روی شناس است
بر فرخئ ذات دلیلم اب و عم را
کو بلبل شیراز؟ و کجا طوطئ آمل؟
تا پایہ بسنجم نوا سنجئ ہم را
لا، بلکہ اگر خواہم ازین ہر دو سخنور
تحسین روش کلک دلاشوب رقم را
فرمان دہٗ اقلیم کمالم، نکنم جمع
لعل و در و فیل و فرس و کوس و علم را

اِمام مہدی کی مدح میں (بارھواں قصیدہ)

یہ قصیدہ ظہیر کے اُس قصیدہ کی زمین میں لکھا گیا ہے، جس کا مندرجۂ ذیل شعر بہت مشہور ہے:

نہ کرسئ فلک نہد اندیشہ زیر پای — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

امیر خسرو کا قصیدہ ہے۔

شیریں دہن یار کہ راحت نشان دہد — آبِ حیات از آن لب شکر فشان دہد

عطار کی غزل کا مطلع ہے:۔

گر دلبرم بیک شکر از لب نشان دہد — مرغ دلم ز شوق بشکرانہ جان دہد

حزیں کا قصیدہ ہے:۔

چون شست غمزۂ تو کشاد کمان دہد — صیدافگنی خدنگ قضا را نشان دہد

یوں معلوم ہوتا ہے کہ خسرو اور حزیں کے قصائد عطار کی غزل پر لکھے گئے ہیں، شعر ملاحظہ ہو:

دارم ز روزگار نویدی کہ آن نوید — در پیریم بشارت بخت جوان دہد

مندرجہ ذیل اشعار میں ان عطیات قدرت کا تذکرہ ہے، جن کی انسان کو مختلف زمانوں اور موسموں میں ضرورت ہوتی ہے، تاکہ یکسانیت، عالمِ انسانیت کے مشاغل

میں جمود نہ پیدا کر دے، شعر یہ ہیں:۔

گنج سخن نہد بہ نہان خانۂ ضمیر — وآنگہ کلید گنج بدست زبان دہد
تا روز خاک تیرہ نگردد ز رشک چرخ — رخشانئی ستارہ بریگ روان دہد
تا آدمی ملال نگیرد ز یک ہوا — سرما و نوبہار و تموز و خزان دہد
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن — تا راحت مشام و نشاط روان دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق — تا آرزوی کام و مراد دھان دہد
آن را کہ بخت دسترس بذل مال نیست — طبع سخن رس و خرد خردہ دان دہد
آن را کہ طالع کف گنجینۂ پاس نیست — نعم البدل زخامۂ پروین فشان دہد

یہ شعر بشریت کا آئینہ دار ہے:۔

مرد است مرد ہر چہ کند بی خطر کند — راد است راد ہر چہ دہد رایگان دہد

اگرچہ ہم غالب کو بار بار کم نصیبی کا نوحہ خواں پاتے ہیں، لیکن اکثر وہ قسمت پر شاکر ہو جاتا ہے، اور قضا و قدر پر ایمان لاتا ہے، اور صبر و توکل پر استقلال کا اظہار کرتا ہے، اس نے کہا:۔

چون جنبش سپہر بفرمان داور است — بیداد نبود آنچہ بما آسمان دہد
رنگ از گل است، و سایہ زنخل، و نوا زمرغ — ہر جا بہار ہر چہ بود در خور آن بود
دارو زبہر زندگی آمد نہ بہر مرگ — جرم پزشک چیست؟ اگر خستہ جان دہد
پرویز دیریاب شہی بود ورنہ بخت — آوارہ را براہ ز شیرین نشان دہد
فرہاد زود میر کسی بود ورنہ دہر — کام دل غریب پس از امتحان دہد

آخر میں، کچھ اپنے بارے میں ارشاد ہوا:۔

چیند ز گرد و پیش گہر ریزہا ظہیر — کارایش سریر قزل ارسلان دہد
ہر کس کہ سوی صفحۂ شعرم نظر کند — مشکل کہ دل بطرۂ عنبر فشان دہد

ہم نغمہ سنج عشقم و ہم نکتہ دان علم
ناہید ساز و مشتریم طیلسان دہد

بہادر شاہ ثانی کی مدح میں (چودھواں قصیدہ)

غالب نے بہادر شاہ ثانی کی شان میں کل پندرہ قصیدے لکھے ہیں، یہ قصیدہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، یہ خسرو کے قصیدے کی پیروی میں ہے، اور بہترین الفاظ اور تراکیب کا مجموعہ ہے، ان سے اسلوب میں تنوع اور زور پیدا ہوگیا ہے، یہ نظم ہر رنگ اور ہر ناپ کے موتیوں کا ہار بن گئی ہے، اس کا ابھرتا ہوا اسلوب بیان، خیال سے ہم آہنگ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

می بر کنار چشمۂ حیوان کشیدہ ایم — از خضر انتقام سکندر کشیدہ ایم
مینای می زمیکدۂ جم خریدہ ایم — فتویٰ می ز ساقی کوثر کشیدہ ایم
این مزد آن دریغ کہ شب ہا درین رباط — از خارو خارہ بالش و بستر کشیدہ ایم
شیخی و شاعری نہ سزا وار شان ماست — یک بارہ ترک خرقہ و دفتر کشیدہ ایم

بادشاہ کو آسمانوں کی رفعت چڑھاتے ہوئے، شاعر مدح کا اثر بلند کرتا ہے، اور کہتا ہے:-

خاموشی از ثنای تو حد ثنای تست — دین نیز از سخنور دیگر کشیدہ ایم

جب سب کچھ کہا جا چکا، تو قصیدہ کھوکھلی تعریف بن کر رہ گیا، جس کے ذریعے توجہ شاہی کو اپنی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ شعر اس بیان کی تائید کرتے ہیں:-

خواہیم قرب شاہ ولیکن درین مراد — عبرت ز نامرادیٔ سنجر کشیدہ ایم
خورشید منظرا. نظری. کاندرین شمار — لعل و گہر برشتۂ مسطر کشیدہ ایم

ایضاً (سترھواں قصیدہ)

یہ اس سلسلے کا بہترین قصیدہ ہے، اور عید کے موقعہ پر پیش کیا گیا تھا، یہ صائب کی غزل کی زمین میں لکھا گیا ہے۔ جس کا مطلع ہے:-

پیش کسی کہ درد بدرمان برابر است — برخندۂ برخم نمایان برابر ست

اس قصیدے میں بادشاہ کی حقیقت پسندانہ مدح کے ساتھ متصوفانہ خیالات

کا غلبہ ہے، اور زبان خیال سے ہم آہنگ ہے، مطلع ضرب المثل بن چکا ہے:۔

گفتم حدیث دوست بقرآن برابر است | نازم بکفر خود کہ بایمان برابر است

یدہ کے بلند پایہ ہونے کی دلیل میں کہا ہے:

ع ہر بیت این قصیدہ بدیوان برابر است

ناامیدی کے عالم میں غالب عشق کی راہ میں نفیٔ ذات اور نفس کشی کی تلقین کرتا ہے، آگے چل کر ریا کاری پر چوٹ کی ہے:۔

تن زن ز شکر و شکوہ کہ در مسلک رضا | راحت بر نج، و سود بنقصان، برابر است

ترک وجود گیر، سخن در وجود چیست | بگزر ز طاعتی، کہ بعصیان برابر است

در دیدۂ جریدہ روان یگانہ بین | کثرت بخوابہای پریشان برابر است

جاروب لا بیار کہ این شرک فی الوجود | با گرد و فرش و سینہ بایوان برابر است

ذات حق است واحد، و ہستی است عین ذات | بزم جہان بہ مجمع اعیان برابر است

اپنے معاصر، خصوصاً ذوقؔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب کا لب و لہجہ دُرُشت ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہو۔

بالد بخویش خواجہ چو گوئی سخنورش | غافل کہ این ترانہ بہ بہتان برابر است

نی ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود | نی ہر سخن سرای بہ سحبان برابر است

نی ہر شتر سوار بہ صالح بود ہمال | نی ہر شبان بموسیٰ عمران برابر است

نی ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوی برد | نی ہر کہ باغ ساخت برضوان برابر است

امروز من نظامی و خاقانیم بفن | دہلی ز من بہ گنجہ و شروان برابر است

اپنی وجدانی شاعری کے بارے میں وہ کہتا ہے:۔

دست مراست لالۂ خود رو چمن چمن | تمکین من بکوشش دہقان برابر است

روح اللہ ہم جلیس، و بدیر از فروتنی | رخت تنم بہ بستر رہبان برابر است

کلک مرا سواد سویدا مثال نظم | با سرمۂ دیار صفاہان برابر است

گر من سکندرم، تو ہر آئینہ خضر باش | گفتار من بچشمۂ حیوان برابر است

ذیل کے اشعار میں ہلال کو متعدد اشیاء سے تشبیہ دی ہے:۔

گر ماہ نو بہ ابروی جاناں برابراست — کو جنبشی کہ گفتہ شود، ہاں برابراست
یارب جبین کیست کہ از بس بسجدہ سود — باقی بہ ابروی مہ کنعان برابراست
چون مہ شود بگوی کہ ماند ہمی بگوی — در پیکر ہلال بچوگان برابراست
زین سیمیا کہ ذورق سیمین دود بر آب — ہر گو کبی بدیدۂ حیران برابراست
بالای طفل یک شبہ درخم زراستی — باقامت خمیدۂ پیران برابراست
وقتیکہ از گرانئی بار ثمر خمد — باشاخ نخلۂ ثمر افشان برابراست
چون آسمان ہر آئینہ ماند بہ پیل مست — این با کجک بہ ہیبت وعنوان برابراست
محراب مسجد است بیاتا ادا کنیم — آن طاعت قضا کہ بتاوان برابراست
باپشت کوز، ونعل سمند، ورکاب رخش — در پیشگاہ مرد ادا دان برابراست
قلاب شست ماہی وخم کمند سیر — در حوت و در اسد دم جولان برابراست
این نیم دائرہ کہ فرو ریخت کلک صنع — بانصف طوق ودور گریبان برابراست
اندازہ دان کسی است کہ گوید ہلال عید — باناخن بریدۂ سلطان برابراست

اس قصیدے کی پیش کش کی وجہ یہ تھی، کہ شاعر اپنے گزشتہ برتاؤ کی تلافی کر کے بادشاہ کے التفات کا طالب تھا، چنانچہ کہتا ہے:۔

پوزش پزیر و مکرمت انگار کز توام — خود یک نگہ بہ لطف نمایان برابراست

ایضاً (بائیسواں قصیدہ)

یہ قصیدہ ظہیر کے قصیدہ کے تتبع میں لکھا گیا ہے، جس کا مطلع ہے:۔

شاہا! اساس ملک بتو استوار باد — عمر تو ہمچو دور فلک پایدار باد

غالب کا تخیل ایک بار پھر انگڑائی لیتا ہے اور مسرت انگیز ہوتا ہے، اور ایک باغ کی تصویر کشی میں کارنامہ انجام دیتا ہے، جس میں جاڑوں بھر کی نیند کے بعد قدرت کی تمام رعنائیاں جاگ اٹھتی ہیں، اور بہار جلوہ فگن ہوتی ہے، یہ قصائد غالب کے روزمرہ مشاغل زندگی کے مقابلہ میں، اس کے احساس جمال کا آئینہ ہے، اور قصیدہ روحانی

مسرتوں، جوش اور پُرزور اسلوب کا مرقع ہے، اس پر تراشے ہوئے الفاظ، پُرزور اور چُست فقرے اور تراکیب نے قصیدے میں مزید حسن، وقار اور عظمت پیدا کردی ہے، اس قصیدے میں تشبیہ نظم کی جان ہے، شاعر، مناظر کی سحرکاری اور فطرت کے حُسن سے متاثر ہوتا ہے، اور بلند آہنگ نغموں پر مجبور ہو جاتا ہے، مناظر قدرت کی عکاسی میں یہ قصیدہ ورڈزورتھ کی مشہور نظم "ڈیفوڈلس" کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے، جس میں گلُوں کی لاہوتی رقص نے شاعر کو وہ "باطن نظر" عطا کی تھی، جو خلوت کی مسرّت بن گئی تھی، برق کی سی سُرعت سے شاعر ایک نئے اور لااُبالی حسُن کی منظر کشی کرتا ہے، ایسے لمحات نے غالبؔ کے تخیل کو برانگیختہ کیا اور لافانی کلام کو جنم دیا ہے۔

نظم کی روانی حیرت انگیز ہے، مناظر بڑی تیزی سے گذرتے ہیں، اور ان کا سیربینی اثر ذہن پر باقی رہ جاتا ہے،

تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دیگر بدان ادا کہ وزد در بہار باد — دارد بپویہ کلک مرا بیقرار باد
وقتست است کز تراوش شبنم زجوش مہر — گوہر فشان شود بسر سبزہ زار باد
وقت است کز شگرفیٔ آثار نامیہ — بندد حنا ز لالہ بدست چنار باد
سوسن کشیدہ خنجر و سنبل نہادہ دام — نشگفت کز میانہ رود بر کنار باد
از گونہ گون شقایق و از رنگ رنگ گل — زد نقشہای بوقلمون صد ہزار باد
صبر از نہاد خاک بدر برد نو بہار — تا رشک بر زمین نبرد زینہار باد
یا سرو سنج سنجد و گل پیرہن درد — رقص از تذرو جست و سرور از ہزار باد

ذیل کے اشعار میں کچھ اپنے متعلق کہا ہے:-

در بزمگاہِ نظم ز دودِ چراغ من — یابد شمیم نافۂ مشکِ تتار باد
از جنبشِ قلم و کمینگاہ فکر من — باشد فرشتہ صید، و سلیمان شکار باد
از بختِ تیرہ طبع روانِ مرا چہ بیم — خوش بگذرد ز خلوتِ شبہای تار باد
نازم بدان ہُمای ہمایون اثر کہ ہست — در کارہ زار آتشِ، و در خار زار باد

یہ آخری شعر غالب کے کردار کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت کا اظہار کرتا ہے، اس میں اپنی ذات پر اعتماد تھا، اور وہ کسی ایسے شاعر کو مستند ماننے پر تیار نہ تھا جو پیدائش اور خون کے رشتے سے ایرانی نہ ہو، وہ واحد عندلیب تھا جو دہلی کے زوال پذیر چمن میں گلوسوزی اور نغمہ سرائی کرتا رہا،

ایضاً (تیئیسواں قصیدہ)

اس قصیدہ میں چند نادر متصوفانہ خیال کی جھلک ہے۔عید کے موقعہ کی عظمت اس کے ذہن کو روحانیت کی طرف مائل کرتی ہے، مسرت انگیز ماحول میں اس کے خیالات بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں، اور اسرار قدس کے پاکیزہ ایوان میں باریاب ہوتے ہیں۔ وہ اعلان کرتا ہے:۔

صُوَرِ کون نقوش است و ہیولا صفحہ	صفحہ عنقاست چگوئی ز نقوش الوان
ہستیٔ محض تغیر پذیر د زنہار	حرف الآن کماکان از ین صفحہ بخوان
ہمچنان در تتق غیب ثبوتی دارند	بوجودی کہ ندارند زخارج اعیان
نتوان گفت کہ عین است، چرا نتوان گفت؟	صوَرِ علمیہ کز علم نیاید بعیان
پرتو و لمعہ ندانی، کہ بود جز خورشید	موج و گرداب نسنجی، کہ بود جز بہ عمان
عالم از ذات جدا بنود، و بنود جز ذات	ہمچو رازی کہ بود در دلِ فرزانہ نہان

اپنی شاعرانہ عظمت، قوت اور دوام کے شعور کے ساتھ وہ کہتا ہے:۔

بہ سخن زندۂ جاوید شدم، داد آن است
کاین سوائے است کہ در وی بود از مرگ امان[1]

قصائد فی المدح ملکہ وکٹوریہ (قصیدہ ۲۹ اور ۳۱)

ملکہ وکٹوریہ کے اعزاز میں غالب نے تین قصائد لکھے ہیں اور سب میں یہ درخواست کی ہے کہ لارڈ لیک کی مقرر کردہ پنشن واگزار کی جائے اور نئے خطابات نیز ملک الشعرائی سے نوازا جائے۔ بدقسمتی سے آرزوئیں کبھی پوری نہ ہوئیں،

اس سلسلہ کے قصائد، نمبر ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ ہیں، جن میں ۲۹ اور ۳۱ ظہیر کی

پیروی میں ہے۔ ظہیر کے مطلعے ترتیب وار مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) شرحِ غمِ تو لذتِ شادی بجان دہد
ذکرِ لبِ تو طعمِ شکر در دہان دہد

---

(۲) صبحِ دگر از مشرقِ اقبال برآمد
در گلشنِ ایام نسیمِ سحر آمد

ان قصائد میں مجموعی تعداد اشعار ۱۸۲ ہے، یہ پختہ عمر کی پیداوار ہیں جب غالب فیروز پور جھرکا کے خزانہ سے پنشن کی پوری رقم حاصل کرنے کے لئے زمین و آسمان ایک کر رہا تھا، نیز پنشن کی واگزاری خلعت اور گورنر جنرل کے دربار میں کرسی کے لئے دن رات کوشاں تھا، یہ اعزازات ۱۸۵۷ میں بند ہوئے تھے، ملکہ اور برطانوی حکام کے نام تقریباً تمام قصائد اسی مقصد کے حصول کے لئے لکھے گئے تھے، غالب نے اصول بنا لیا تھا کہ ہر نئے گورنر جنرل اور پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو قصیدے پیش کئے جائیں۔ قصیدہ نمبر ۳۱، جان بوجھ کر "دستنبو" میں شامل کیا گیا تھا، تاکہ اسکی تعریف ہو، اور اسے بغاوت کے مبیّنہ الزام سے بری کیا جائے، یہ قصیدہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ کے ہندوستان کا انتظام سنبھالنے کے موقعہ پر لکھا گیا تھا، اس زمانے میں شاعر کا فن کمال پر تھا، اس وجہ سے قصیدہ کا اسلوب پرزور، معنی خیز اور چست ہے، خیالات سادہ، رواں اور برمحل ہیں۔

اس قصیدہ میں شاعر اپنے نصیب پر نوحہ خواں ہے، ان سب منظومات میں غالب ایک ہی لہجے میں، یہی موضوع بیان کرتا ہے، اس نے کہا ہے:۔

آں مور سرکشم، کہ چو مرگش امان دہد — از ننگ پایمال بہ پرواز جان دہد
بختم ندیم، لیک ندیمی کہ چوں ازو — پرسم ز آسمان، خبر از ریسمان دہد

ملکہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

آں باد دخوش بود کہ شہنشاہ بحر و بر — انجام خواہشِ اسد اللہ خان دہد

قصائد فی المدح حکام برطانوی (قصیدہ ۳۲)

غالب نے ہر نئے گورنر جنرل کے نام ایک قصیدہ پیش کرنا اپنا اصول بنا لیا تھا، اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر آتے ہیں، تو میری طرف سے ایک قصیدہ بطریق نذر جاتا ہے" ؎

یہ غالب کے بہترین قصائد میں سے ہے، اور مسعود کے قصیدہ کی زمین میں ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

چون رہ اندر بر گرفتم دلبرم در بر گرفت
جان بدل مشغول گشت و تن زجان در بر گرفت

یہ قصیدہ لارڈ آکلینڈ، گورنر جنرل کے پہلی بار دسمبر ۱۸۳۷ء کو دہلی آنے کے موقعہ پر پیش کیا گیا۔ اس کی تشبیب شاندار اور پر اثر ہے۔ اسلوب میں ندرت، نفاست اور بلندی پائی جاتی ہے، جس کے ساتھ خوبصورت رنگوں کا تنوع اور تخیل کی سچائی شامل ہے۔ اس کی تشبیب کا موزوں عنوان "کھلا ہوا چمن" ہو سکتا ہے۔ ان اشعار کا زیر و بم، محاکات اور لب و لہجہ ملاحظہ فرمائیے۔

باز بہ اطراف باغ، آتش گل در گرفت — مرغ بر سم مغان، زمزمہ از سر گرفت
سبزہ بر اندام خاک، حلہ ز مخمل برید — مہر بہ دیوار باغ آئینہ در زر گرفت
دشت، ز پرکار باد، طرح صنم خانہ ریخت — باد، بر اطراف دشت، صنعت آذر گرفت
سرو ببالای سرو طرہ ز سنبل فگند — گل بتماشای گل دیدہ ز عبہر گرفت
قامت رعنای سرو، پردۂ گلبن درید — عارض زیبائی گل، دل ز صنوبر گرفت
بسکہ نیامد فرود سر بہ گہر گشتنش — قطرہ، ز بالا دوی ہیئت اختر گرفت
مہر، بسودای، تاک لمعہ زکان باز چید — از زر اصفر گذشت، بادۂ احمر گرفت

؎ خطوط غالب صفحہ ۳۰۳،

یسکہ بہ آتش سپرد نامیہ سیمائی گل — اُمت گُل فوج فوج، کیشِ سمندر گرفت
بلبلِ آشفتہ را، حسنِ گل از یاد رفت — در صفتِ رنگ و بو، جانب اخگر گرفت
شعلہ بسنگ از شرار، بال چراغان کشود — بادہ بہ خم از حُباب صورت ساغر گرفت

ساری نظم غلغلہ انگیز خیالات اور جذبات انگیز زبان سے بریز ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ بجائے درخواست کے، شکریۂ کرم کے طور پر لکھا گیا ہے، یہ شعر دیکھئے

شست ہمشک و گلاب، کام و زبان چندبار
تا اسد اللہ خان، نامِ گورنر گرفت

قصیدہ نمبر ۳۶

یہ قصیدہ سر جیمس ٹامسن لفٹننٹ گورنر شمالی مغربی صوبہ کی مدح میں ہے، مسٹر ٹامسن فارسی کا عالم تھا، اور ایک زمانے میں دہلی کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا۔ وہ غالب کی شاعری کا بڑا مداح تھا، اور اکثر اس نے غالب کی مدد بھی کی تھی، غالب نے بھی اس کا بدلہ اکثر مدحیہ اشعار کی صورت میں دیا، اس نے لفٹننٹ گورنری کے عہدہ پر ترقی کی مبارک باد میں ایک قطعہ لکھا تھا۔ قطعہ قصیدے سے کہیں زیادہ شاندار ہے،

اس قصیدہ میں قوافی کی تلاش شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہے، تشبیب میں چند نادر خیالات ہیں، اس میں صنایع کی نقاشی بھی ہے:۔

در رہِ شوق نیم، تنگ دل از بیم ہلاک — خضر این دشت ز خوبی بہ مسیحا ماند
سجدہ خواہم کہ ز مسیحا گذارد اثری — اثر سجدہ چہ خواہی کہ بہ سیما ماند
ما بجامی کہ ز جم ماند، قناعت کردیم — بہ سکندر بدہند، آنچہ ز دارا ماند
نیم شب فکر صبوحی ز توکل دور است — نہ پسندیم کہ یک جرعہ ز صہبا ماند
عالم آئینہ راز است، نہ بازیچۂ کفر — عارف آن بہ کہ، بنظارہ ز غوغا ماند
قدم یوسف اگر در رہِ ایمان لغزد — بُتی از دور نمایند، کہ ہر جا ماند

اپنی شاعری کی بقاء دوام کے بارے میں کہتا ہے:۔

سخن از پیشروان ماند، ہمانا زین پس — ما نمانیم و بگیتی سخن از ما ماند

سر ٹامسن کی مدح لکھتے ہوئے شاعر کو اپنی جائے پیدائش یاد آجاتی ہے، اور وہ کہہ اٹھتا ہے:

دل نشین شد آگرہ کس چون نردد یدیاری کہ سوادش بسویدا ماند

مندرجہ ذیل اشعار میں حروف کا صوتی تاثر دیکھئے:۔

فروفرہنگ فریدون دہد آشائش خلق کشور آباد ز فرمانِ دہِ وا ماند
نیست کس، بلکہ بنود است، ونخواہد بود کہ بفرہنگ بفرزانۂ یکتا ماند

قصیدہ نمبر ۳۸

یہ قصیدہ خاقانی کے اس قصیدہ کی زمین میں ہے، جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے:۔

خردِ خریطہ کش خاطر وبیان من است سخن جنیبہ برِ خامہ وبنانِ من است

یہ سر ٹامس میٹروک کے نام ہے، جو ۱۸۴۳-۱۸۴۹ء میں سپریم کاونسل کا ممبر تھا، یہ بھی فارسی کا عالم تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہے:

از زبانِ تو اگر مدح تو گویم بپذیر کاین ادا بر شرفِ ذاتِ تو برہان نست

اس قصیدہ میں غالب نے اپنے متعلق مدحیہ وفخریہ اشعار بھی لکھے ہیں

بسکۂ دلدادہ موز ونیّ افکار خودم خامہ ہنگام رقم سرو خرامان منست
مستیم عام مدان ورو شم سہل مگیر ناقۂ شوقم وجبریل حدی خوان من است
جادۂ عرفی و رفتار شفائی دارم دہلی وآگرہ شیراز وصفاہان من است
تاجر نطقم و از کشور جان می آیم مدح وتشبیب وسپاس وگلہ سامان من است

اس قصیدہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسے شخص کی شان میں لکھا گیا جس سے غالب کبھی نہیں ملا، لیکن چونکہ سر ٹامس فارسی شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا، اور ہمارا شاعر ایک باذوق قدر دان کی آرزو رکھتا تھا، اس لئے اشعار میں برجستگی آگئی، وہ کہتا ہے:۔

شرطِ اسلام بود، ورزشِ ایمان بالغیب ای تو غائب زنظر، مہر تو ایمان من است

آخر میں بڑے سلیقے کے ساتھ اپنا مقصد دلی بیان کیا ہے :-

چون برین دائرہ بینی شفق از من یادآر
کان کف قلزم خونابہ مژگان من است
چون بدریا بودت راہ زمن جوی نشان
کان فرو ریختۂ دیدۂ گریان من است
پر تہی دستم و بی برگ، خدایا، تا چند
بہ سخن شاد شوم، کاین گہر از کان من است

قصیدہ نمبر ۳۴

موسم کی تازگی کے ساتھ آرائش بیان نے اس قصیدہ کا بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کا، اس نوع کے بہترین اشعار سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے :-

باز پیغام بہار آورد باد — مژدہ بہر روزگار آورد باد
نیکوئی در رنگ و بوی افزود دہر — تازگی در برگ و بار آورد باد
گنج باد آورد خسرو یکطرف — گنجہای بی شمار آوردباد
گر ترنج زر نباشد، گو مباش — زین نمائشہا ہزار آوردباد
شاہدِ گل تاب مستوری نداشت — مستش اندر رہگذار آوردباد
از ہجوم غنچۂ در صحن چمن — کودکان نی سوار آوردباد
نقشہائے دل فریب انگیخت چرخ — ابرہائی دجلہ بار آوردباد
از غم پائیز دستش بر خداست — شاہد از برگِ چنار آوردباد
گل ہوائے خسروی از سر گرفت — نیم تخت از شاخسار آوردباد
غنچہ بنگر کز بیابانِ تتار — نافۂ مشک تتار آوردباد
حسنِ گل بین کز نگارستان چین — گونہ گون نقش و نگار آوردباد
نسترن زاری بصحرا عرضہ داشت — خیمہ ہائی زرنگار آوردباد

گل زمین، و بزم عیش وقت خوش — رامش از بانگ ہزار آورد باد

یہ پرمسرت ماحول غالبؔ کو اپنا کلبۂ احزان یاد دلاتا ہے، جو اسی کے الفاظ میں "گاہے گاہے طوفانی بجلی سے منور ہوجاتا ہے" مندرجہ ذیل شعر میں اس کیفیت کی طرف اشارہ بڑا غم انگیز ہے:

کلبۂ درویش را بنود چراغ
برق در شب ہای تار آورد باد

قصیدہ نمبر ۶۵

یہ لارڈ ایلجن کے نام معنون ہے، اس میں مندرجہ ذیل تعلی کے اشعار قابلِ ذکر ہیں:۔

ہزار زمزمہ دارم، ہمین نہ یک سخن است — کہ چون تمام شود آن، سخن ز سر گویم
من آن نیم، کہ بہنگامۂ سخن سازی — گہی ز خاور و گاہی ز باختر گویم
دران دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست — دکان کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم
سخن نہالِ نو و کہنہ باغبان غالبؔ — نہال را بہ نوی مژدۂ ثمر گویم

قصیدہ نمبر ۴۸

یہ فنکارانہ اور فلسفیانہ قصیدہ ہے، اور رومیؔ کی مشہور غزل پر ہے، جس کا مطلع یہ ہے:۔

ہر لحظہ بشکل آن بت عیار بر آمد
ہر دم بلباسِ دگر آن یار بر آمد

یہ شیریں اور حسین نغمہ، پُر وقار زیر و بم اور جمال پسندی و تصوف کے خیالات سے مملو ہے، موسیقی ملاحظہ ہو،

گویند کہ در روز الست از رہِ مستی — حرفی ز لب کافر و دیندار بر آمد
آن آب کہ از خاک ہمی سبزہ دماند — در طینتِ آہن، ہمہ زنگار بر آمد
در دشت یکی آبلہ زد دانۂ تسبیح — بر دوش یکی رشتۂ زنّار بر آمد

زآنگونہ در آمیخت یکی با صنم خویش | کش نقش دو پیکر بنمودار برآمد
راندند یکی را چو لب تشنۂ میرفت | ہم تشنہ لب از خانۂ خمار برآمد
خواندند بدان مہر کہ از کعبہ یکی را | آواز "بیا" از درو دیوار برآمد
آں رُو فت درِ میکدہ و خردۂ زر یافت | ایں کوفت در صومعہ و یک مار برآمد
شوریدہ ادائی بدمِ تیشہ روان شد | آشفتہ نوائے بسرِ دار برآمد
آسودہ بفردوس برین آدم و ناگاہ | از دمدمۂ دیوِ تبہ کار برآمد
آن یک کہ برآمد، چہ قدر نام برآورد | دین یک کہ برآورد چسان خوار برآمد

غالب نے فارسی زبان کے محاورے میں ملکۂ تمام حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور مستقل کوشش اور مشق سے اپنے فن کی تکمیل کی، چنانچہ نوجوانی کے جذباتی تخیل اور اسلوب کے برعکس آخر عمر کی تخلیقات زیادہ سنجیدہ بھرپور، بلند اور ٹھوس ہیں، مندرجہ بالا اشعار میں سے دوسرا شعر اس خیال پر مبنی ہے کہ ایک چیز جو ایک شخص کے لئے اکسیر ہے، دوسرے کے لئے زہر ہو سکتی ہے۔ اسلوب سے ادیب کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، شاعر مبصر ہوتا ہے، وہ اشیا کا تمام و کمال جائزہ لیتا ہے، خارج سے وہ اشیا کے باطن تک پہونچتا ہے، محققانہ ذہن، بلند پرواز تخیل، دروں بینی اور ماحول سے عملی واقفیت کے ساتھ، غالب نے ان چیزوں کا تجزیہ کیا، جو اسکے مشاہدے میں آئیں، اور مشاہدہ کے بعد، انھیں اپنے انفرادی شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا، کہ وہ حسین، فنکارانہ، عملی اور سائنسی معلوم ہونے لگیں،

قصائد فی المدح شاہانِ اودھ

غالب نے شاہان اودھ کی تعریف میں پانچ قصائد لکھے ہیں، ان میں نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ کی تعریف ہے،

قصیدہ نمبر ۴۹

یہ سفر کی پیداوار ہے، غالب نے اسے کلکتہ جاتے ہوئے لکھا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:۔

تا نیا شد المی ترکِ وطن نتوان کرد　　مشکلی در نظر آوردم، وآسان رفتم
چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخون　　خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنوان رفتم

غالب نے یہ قصیدہ بذات خود بادشاہ کو پیش کرنے کے لئے لکھا تھا۔ تاکہ سفر کے اخراجات کا مناسب بندوبست ہو سکے[۸] بد قسمتی سے جب وہ لکھنؤ پہونچا تو پہلے اس کا تعارف آغا میر، وزیر اعظم نواب نصیر الدین حیدر سے کرایا گیا، غالب اس شخص سے نفرت کرتا تھا، لہٰذا اس نے قصیدہ[۹] نذر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بجائے اس نے صنعتِ تعطیل میں کوئی چیز لکھی، اور شہر کو نفرت اور ناامیدی کے عالم میں چھوڑ دیا۔

کلکتہ سے واپسی پر غالب نے پہلے یہ قصیدہ بادشاہ کے وکیل راجہ صاحب رام کو بھیجا، اس کے بعد بادشاہ کی نذر کرنے کے لئے منشی محمد حسن کو بھیجا، اس زمانے میں آغا میر معزول اور شہر بدر کیا جا چکا تھا، اور اس کی جگہ روشن الدولہ نے لے لی تھی، چونکہ قصیدہ میں اس کا ذکر بھی ہے، اس سے ہم نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ ۱۸۳۲ء کے بعد لکھا گیا تھا، جو روشن الدولہ کی وزارت کا سال ہے،

شاید یہ پہلا قصیدہ ہے، جو کسی حاکم اودھ کی شان میں لکھا گیا، کہا جاتا ہے، کہ قصیدہ بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا تھا اور اس نے پانچ ہزار روپیہ انعام دیا تھا، جس کا تین چوتھائی وزیر اعظم نے اور بقیہ منشی محمد حسن نے ہڑپ کر لیا تھا، اور مزید ستم یہ کہ ان لوگوں نے شاعر کو اطلاع کرنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی[۲۲] لطف کی بات یہ ہے کہ غالب نے اس انعام پر اپنی توقعات وابستہ کر لی تھیں، وہ اس رقم کی مدد سے کلکتہ جا کر دوبارہ قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا[۱۰] لیکن اس کی تمام توقعات رائیگاں گئیں اور اس کا اعتماد اٹھ گیا،

قصیدہ عرفی کی طرح میں ہے۔ عرفی کا مطلع درج ذیل ہے:

---

۸ کلیات نثر صفہ ۱۷۶، ۹ ایضاً صفہ ۶۵، ۲۲ خطوط ص ۷۹،
۱۰ کلیات نثر صفہ ۱۷۶،

رفتم ای عمر، ز درِ عمر شتابان رفتم ہان شتاب، ار طلبی ہست، ز من ہان رفتم

حزؔین کا ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے اور یوں شروع ہوتا ہے:

مژدہ یاران کہ ازین منزلِ ویران رفتم رُستم از جسم گران، از پیِ جانان رفتم

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے نزدیک یہ غالبؔ کا سب سے عمدہ قصیدہ ہے، اس کی تشبیب کسی طرح عرفیؔ سے کم نہیں [۱]

یہ نہ صرف بہترین بلکہ طویل ترین قصائد میں سے ہے۔ اس میں ۱۰۴ اشعار ہیں بلندیِ خیال اور لطافت تغزل میں یہ قصیدہ کسی بڑے شاعر کے قصیدہ کے جواب میں پیش کیا جا سکتا ہے، اور فن کا بیش قیمت شاہکار ہے، زورِ بیان سارے قصیدہ پر حاوی ہے، شاعر نے بیش قیمت موتیوں کا یہ ہار گوندھنے میں بڑی کاوش کی ہے،

تشبیب میں ۱۵۲ اشعار ہیں۔ یہ غالبؔ کا دوسرا بہترین قصیدہ ہے۔ اس میں گہری معنویت ہے اور پوری نظم شاعر کے ذہن کی گہرائیوں سے نکلی ہے، سوز و گداز پوری نظم کا خاصہ ہے،

پورا قصیدہ نادر، منفرد اور تازہ خیالات سے بھرپور ہے، مندرجہ ذیل اشعار اس بیان کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں:-

عالم از کثرتِ خوننابہ فشانی دریاب کہ بتاراجِ جگر کاویِ مژگان رفتم

جز در آئینہ ندیدم اثرِ سعیِ خیال ہر قدر بہر طلبگاریِ اِنسان رفتم

نتوان منتِ جاوید گوارا کردن ہمچو تشنہٴ زسرِ چشمہٴ حیوان رفتم

ذوقِ غم، حوصلہٴ لذتِ آزارم داد پای کوبان بسرِ خارِ مغیلان رفتم

بسکہ تاریکیٔ شبہائے جدائی دیدم سایہ گردیدم و بیخود ز شبستان رفتم

ناروا بود، ببازارِ جہان جنسِ وفا رونقی گشتم و از طالعِ دکان رفتم

زحمتی بر نفسِ اہلِ طرب ریختہ ام خواب خوش گشتم و از یادِ عزیزان رفتم

---

[۱] غالب صفحہ ۲۱۷ حاشیہ ۲

تا دگر رنج جلوداری مجنوں نہ کشد — بہر آرامش طفلان بہ بیابان رفتم
نکہتم نقب بہ گنجینۂ دل ہا می زد — مژدہ بادا اہل ریا را کہ زمیدان رفتم
داغ حسرت بدل، و شکوۂ اختر بزبان — منت از بخت کہ بسیار بسامان رفتم
بیخودی بادیہ پیمائی تحیر شدن است — نہ بکاشانہ کشیدم نہ بکاشان رفتم
مہر را یافتم از شرم جمالش تہ خاک — بہ عزاداری خورشید پرستان رفتم

وہ مقصد جو اس نظم کا محرک ہوا ہے، مندرجہ ذیل اشعار میں بڑے سلیقے سے ظاہر کیا گیا ہے:-

ناز پروردۂ خلوت کدۂ آزادگیم — کافرم گر بسرا پردۂ سلطان رفتم
صلہ جو نیستم، و شعر فروشی نکنم — راہِ مدح تو بسر گرمیٔ ایمان رفتم
نازشِ قطرہ بدریاست، تکلف برطرف — مرد بودم بسجودِ شۂ مردان رفتم
آب و رنگِ سخنم بنگر، و معذورم دار — گر چو عرفی رہِ فخریہ بہذیان رفتم

زندگی کی ناکامیوں کا تذکرہ، مندرجہ ذیل پُرسوز اشعار میں ملتا ہے:

گاہ از ولولۂ نازشِ جادو رقمی — سخن خود شدم و تا بہ صفاہان رفتم
گہ بحکم ہوسِ تربیت و عرضِ کمال — مہر تابان شدم و سوی بدخشان رفتم
گہ ز جان بخشی انفاس درون پرورِ خویش — بوئے یوسف شدم، از مصر بکنعان رفتم
گاہ دیوانہ صفت سیر بیابان کردم — گاہ مستانہ بہ گلگشتِ گلستان رفتم
گہ چو بلبل سرِ دیوانِ چمن بگزیدم — گہ ز پروانگیٔ دل بچراغان رفتم
قطرہ ام قطرہ، ولی حال خرابم دریاب — کہ ز دریادلیٔ خویش بطوفان رفتم

من ہم از خیل کریمانم و خجلت نبود
گر بدریوزہ بدرگاہِ کریمان رفتم

قصیدہ نمبر ۵۱

یہ قصیدہ امجد علی شاہ کو پیش کرنے کے لئے لکھا گیا تھا، لیکن اس سے قبل اس کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں غالب نے "امجد" کی جگہ "واجد" کمال چالاکی سے

لکھدیا۔ اور اسے قطب الدولہ کے پاس، شاہ کے حضور گذارنے کے لئے بھیج دیا، یہ شخص قطب الدولہ، دہلی کا ایک گویّا تھا۔ اس نے دربار میں رسائی کی عزت حاصل کرلی تھی،

قصیدہ کی قدر و قیمت کی تعریف میں، غالب نے یہ قطعہ لکھا:

قصیدۂ گرش برگذشتگان خوانند زہم نفسان تو آئین ترانہ پیشین
کمال رابعنا داز نفس چکد زہراب ظہیر را زحسد در جگر خلد ژوپین

شاہ اودھ کے نام کی تبدیلی کے بارے میں، غالب مرزا یوسف کے نام ایک خط میں کہتا ہے:۔

"جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کرسکا، یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے نہ گذرا تھا، میں نے اس میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا...... انوری نے بارہا ایسا کیا ہے، کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کردیا، میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کردیا تو کیا غضب ہوا،" ۱۲ہ

قصیدے کی پیش کش کا خاص سبب مالی اعانت کا حصول تھا۔ اُسی خط میں غالب لکھتا ہے:۔

"اِس قصیدے سے مجھکو عرض دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے" تشبیب میں روحانی جذبات ہیں، اس میں شاعری کی ابتدائی باغیانہ زندگی کا پرتو ملتا ہے،

سخن زروضۂ رضوان بکوئے یار کشد جو جادۂ کہ زصحرا بہ لالہ زار کشد
تو باش حاسدِ رضوان بباغبانیٔ خلد من آن نیم کہ مرا دل بہ ہیچ کار کشد
سخن بذکر قیامت دراز کن واعظ مگر ز طولِ ببالائی آن نگار کشد

۱۲ہ خطوط غالب صفحہ ۱۶۴،

بشہر شہرت حسنِ تو فتنۂ انگیخت ... کہ شیخ شہر خجالت زشہر یار کشد
بہیچ حیلہ غم از دل نمی رود بیرون ... کسی برای چہ منت زغمگسار کشد

قاری سے مخاطب ہوتے ہوئے، غالب کہتا ہے کہ فریبی اور عیار دنیا کے وعدوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے، نہ اس کی چمک دمک پر توجہ دینا چاہیئے، ملاحظہ ہو:۔

توای ندیم کہ مانی زتازہ رُوئی خویش ... بسبزۂ کہ سر از طرف جویبار کشد
فریب مہر زگردون مخور، کہ این مہر ... دہد فشار کسی راکہ درکنار کشد
زمانہ بی سبب آزار دو تو پنداری ... کہ انتقام تو از اہلِ روزگار کشد

مندرجہ ذیل اشعار میں غالب نے بلند پایہ فلسفہ پیش کیا ہے۔

ستم مکن، کہ ستم گر بحکم قہر و غضب ... خود از نہاد خود آزار بی شمار کشد
بہ بخش جرم عدو، در با نتقام خوشی ... مباش رنجہ زغم کا فرید گار کشد
بقدر فہم تو گفتم، دگرنہ کار آنست ... کہ مرد خط بر رقمہای اعتبار کشد
مبین بزخمۂ و جنبش نگر، کہ آن زکجاست ... نہ زخمہ بلکہ مغنی صدا زتار کشد

شاعری کی تعریف میں کہا ہے:۔

سخن در اصل ہمانا بود، سیہ خونی ... کہ کاتبش، زرگِ کلک مشکبار کشد
کشد چہ رنج سخنور کہ نقشہائی بدیع ... زبہر آنکہ گذارد بیاد گار کشد

حجاباتِ ذاتِ واحد کے بارے میں یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

زاصل خلق سرایم، سخن بہ پردۂ راز ... نسب بہ پنبہ ردا راز پود و تار کشد
نیافت راہ زکثرت خلل بوحدتِ ذات ... یکی یکسیت عدد، گر بصد ہزار کشد

زمانے کے ظلم و ستم کی چوٹ کھا کر، شاعر چیخ اٹھتا ہے:۔

غم زمانہ خود، اندوہِ عشق بازی نیست ... کہ دل ہر آئینہ لذت زخار خار کشد
ستم رسیدہ لوازا، من آن لوا سنجم ... کہ نالہ رشک نوائی من از ہزار کشد
کفِ مرا بنگارش دوائر الفاظ ... زحلقۂ الیست کہ در گوشِ نوبہار کشد

قلم زمن بسر انگشتِ محرمی ماند کہ پردہ از رخِ خوبان گلعذار کشد
چنین کسی کہ خپانست در زمانہ تست
نہ درخور است کہ خواری ز روزگار کشد

قصائد فی المدح والیان رامپور

جیسا کہ کہیں پہلے کہا جا چکا ہے، غالب کا تعلق رامپور سے، ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا اور وفات تک قائم رہا۔ نوابان رامپور کی مدح میں اُس نے کل چھ قصائد لکھے ہیں، چار نواب یوسف علی خاں کی شان میں اور دو اسکے لائق بیٹے اور جانشین کی مدح میں ہیں۔ ان قصائد کی نمایاں خصوصیات، مقصد کا خلوص، پرجوش جذبات پاکیزہ خیالات اور ماہرانہ طرز بیان، ہیں،

قصیدہ نمبر ۵۴

نواب یوسف علی خان کے ۱۸۶۰ء میں یہ پہلا قصیدہ ہے، یہ مولوی فضل حق خیرآبادی کے ایما پر لکھا گیا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:-

بتوقیع فضلِ حق، آں عینِ معنیٰ کہ آبادیِ روی فراوان فرستم
گزشت اندر اندیشہ کز خامہ رشحی بدان قلزم فیض و احسان فرستم

یہ قصیدہ ایک فارسی خط مورخہ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کے ساتھ نواب کو بھیجا گیا تھا، ۲ فروری ۱۸۵۷ء کو وہاں پہونچا، اسے نواب نے پسند کیا اور ایک خط کے ساتھ ۲۵۰ روپیہ بھجوائے، خط میں قصیدہ کی بڑی تعریف تھی، اصل قصیدہ میں تین اشعار جو لفظ "گرفتم" سے شروع ہوتے ہیں، شامل نہیں تھے، لیکن فارسی دیوان میں شامل ہیں، ان اشعار کو مولانا امتیاز علی عرشی نے مکاتیب میں پایا اور دیوان میں شامل کر دیا۔

یہ ردیف کے قصیدہ پر لکھا گیا ہے، جس کا مطلع ہے:-

گُلی سُوئ خُلد برین می فرستم شبہ پیشِ درِ ثمین می فرستم

حزیں نے جو قطعہ نجف اشرف بھیجا تھا، یوں شروع ہوتا ہے :

حزیں از تقاضائے ہمت برآنم   کہ خوانِ سخن را با خوان فرستم

الوری کا ایک قطعہ بھی اسی زمین میں ہے :

بحمد و ثنا چون کنم رائی نظمی   نہ دشوار گویم نہ آسان فرستم

قصیدے کا مطلع پر زور اور شیریں ہے اور پوری نظم کی جان ہے ، اس میں خلوص بے پایاں ہے ، کیونکہ کسی کو انتہائی بیش قیمت تحفہ پیش کرنا تو آسان ہے ، لیکن جان نثار کرنا انتہائی مشکل ہے ، مگر ہمارا شاعر نذر کے لئے زندگی سے دستبردار ہونے کو تیار ہے ، وہ کہتا ہے :۔

ہمانا اگر گوہر جان فرستم   بنواب یوسف علی خان فرستم

یہ شعر بذاتِ خود ایک قصیدہ ہے ،

مندرجہ ذیل اشعار کی سادگی و شیرینی ملاحظہ فرمایئے :۔

گرفتم ، کہ رنگین بیانم بگیتی   شقائق بہ نبگاہ لقمان فرستم

گرفتم ، کہ بحر روانم بمعنی   گہر جانب ابر نیسان فرستم

گرفتم ، کہ روشن روانم بدانش   چراغی بمہر درخشان فرستم

ان اشعار میں تعلی و خود ستائی ہے اور یہ اپنے فن کی تعریف کا بڑا لطیف طریقہ ہے ، شاعر نے نواب کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنے فن کی مدح بھی کی ہے ، صرف غالب کے مرتبہ کا استاد ہی ان بلندیوں کو چھو سکتا ہے ،

قصیدہ نمبر ۲۶

یہ عرفی کے پُر شکوہ قصیدہ کی پیروی میں کہا گیا ہے ، اس کا مطلع ہے :

ای داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را   وی ساختہ دیرانہ ہم فصل و کرم را

اس زمین میں غالب کے تین قصیدے ہیں ، قصیدہ نمبر ۲ پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے ، تیسرا قصیدہ ، جیسا کہ غالب کے فارسی خط بنام شمس الامرا وزیر اعظم حیدر آباد سے ظاہر ہوتا ہے ، مکتوب الیہ کی تعریف میں تھا ، صرف مندرجہ ذیل اشعار ، جو خط میں ہے ،

اس قصیدہ کی یادگار ہیں، ورنہ پورے قصیدے میں ۶۷[۱۳] اشعار تھے،

یہ قصیدہ خاصا طویل ہے، اس میں ۷۰ اشعار ہیں، ہر شعر پاکیزہ تراکیب اور منتخب خیالات سے مزین ہے، پہلا شعر بڑا چست اور پر زور ہے، عرفی کے مطلع سے بلند ہے، پورا قصیدہ عشوۂ ترکانہ کی یاد دلاتا ہے، اور ہر شعر خوبصورت اور شیرین نغمہ ہے، بطور استعارہ یوں سمجھئے کہ پوری نظم ہموار و مصفّا موتیوں کا گلوبند ہے، جس کا ہر دانہ دوسرے دانے پر چشمک کرتا ہے، مختصر یہ کہ یہ مکمل فن پارہ غالبؔ کے بہترین قصائد میں سے ایک ہے، ذیل میں چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

ای ذات تو جامع صفت عدل و کرم را ۔۔۔ وی بر شرف ذاتِ تو اجماع اُمم را
صد غوطہ بزمزم زدہ از بہر طہارت ۔۔۔ تا رُخصتِ پابوسِ تو داوند قسم را

یہ قصیدہ پیرانہ سالی کی پیداوار ہے، اور فارسی شاعری کے بہترین قصائد میں شمار ہو سکتا ہے، پیرانہ سالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالبؔ کہتا ہے:۔

ہر چند بپیری شدہ دل سرد زہستی ۔۔۔ از سردیٔ موسم چہ زیان گرمیٔ دم را
برنائیٔ اگر رفت نہ آنست کہ برمن ۔۔۔ حقی نبود پرورشِ آموزہ ہرم را
فرخ دم پیری کہ کند در نظرم خوار ۔۔۔ خوبان قمر طلعت و ناہید نغم را

آخری شعر، پہلے شعر کی طرح پر زور ہے، ملاحظہ ہو:۔

تا چرخ کشد محمل برجیس، بقا باد
نواب فلک محمل برجیس شیم را

قصیدہ نمبر ۶۷

قصیدہ ۶۷ اور ۶۹ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہیں، "سبد چین" میں شامل ہیں، قصیدہ ۶۷ ظہیر کے پہلے قصیدہ کا ہم طرح ہے، جس کا مطلع ہے:

سپیدہ دم چو شدم محرم سرای سرور ۔۔۔ شنیدم آیت تو بوا الی اللہ از لبِ حور

---

[۱۳] کلیات نثر صفحہ ۱۹۳،

عُرفی کا قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

سپیدہ دم چو زدم آستین بہ شمع شعور ۔۔۔ شنیدم آیت اِستفتحوا ز عالمِ نور

صائب کا قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

زہی ز چین جبین آیہ آیہ سورۂ نور ۔۔۔ زخال تازہ کن داغہائی لالۂ طور

یہ قصیدہ جشن تاجپوشی کے موقعہ پر پیش کیا گیا تھا، رامپور ۲۷ مئی ۱۸۶۵ء کو پہونچا، اگرچہ یہ مختصر نظم ہے، مگر اعلیٰ شاعری کے جملہ اوصاف اس سے عیاں ہیں، اس میں بھی مطلع بڑا پُرزور، لیکن مبالغہ آمیز ہے:

تجلئی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور ۔۔۔ بشکل کلب علی خان دگر نمود ظہور

اسی طرح مبالغہ آمیز، مدحیہ اشعار بھی ہیں:۔

دم نگارش وصفِ کلام شیرینش ۔۔۔ چو خیل مُور دَوَد بر ورق حروف طور

بجوانِ شرعِ ببین ہم نوالۂ شبلی ۔۔۔ بہ بزم عشق ببین ہم پیالۂ منصور

بحکم مرتبہ او حاکم و فلک محکوم ۔۔۔ ز راہ قاعدہ شرع آمر است او مامور

بنائی منظرۂ جاہ ترا زحل معمار ۔۔۔ ثوابت کُرّہ چرخ ہشتمین مز دور

جہانِ جانی و جانِ جہان، عجب بنود ۔۔۔ کہ از ورود تو ہر مُردہ رقص اندر گور

قصیدہ نمبر ۶۰

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ غالب کے سب سے زیادہ مخلص اور محب رفقا میں تھے، یہ شریف النفس انسان، اُس وقت بھی شاعر کا شریک حال رہا، جب وہ قیدِ بامشقت میں گرفتار تھا، اور عزیز و اقارب سب ساتھ چھوڑ چکے تھے، مولوی فضل حق مفتی صدالدین آزردہ، اور نواب ضیاءالدین احمد کے دوش بدوش، شیفتہ بھی غالب کے لئے پشت پناہی کا باعث تھے، حقیقت یہ ہے شیفتہ اور مذکورہ اشخاص اگر نہ ملتے، تو غالب، غالب نہ ہوتا، وہ بھی ان کی بڑی عزت کرتا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

ہنر را خوش نفسا نند، سخنور کہ بود ۔۔۔ با و در خلوت شان مشکفشان از دم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگہ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

حقیقت یہ ہے کہ غالب اور نواب صاحب میں اس قدر یک رنگی تھی کہ دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں ملی ہوئی تھیں، لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ غالب نے انسانیت کے اعلیٰ نمونہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا،

غالب نے نواب کی صفات اِس قصیدہ میں اور "اسیریہ" میں گنائی ہیں، اور ان میں نواب سے محبت کا علی الاعلان اعتراف کیا ہے،

یہ قصیدہ، عرفی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں ہے، جو اس نے حکیم ابوالفتح کے اعزاز میں کہا تھا، عرفی کا مطلع ہے:

باز گلبانگ پریشان می زنم آتش اندر عندلیبان می زنم

ایک دوسرے انداز میں شاعری کی تعریف کرتے ہوئے غالب کہتا ہے:

زخمہ برتار رگ جان می زنم کس چہ داند تا چہ دستان می زنم
زخمہ برتارم پریشان می رود کاین نواہای پریشان می زنم
خامہ ام ہمراز دم گرم من است آتش از نی در نیستان می زنم
جوئی شیراز سنگ راندن اہلی ست بہر گوہر پیشہ بر کان می زنم

طبیعت کے انقباض نے اس میں زہرخندگی کیفیت پیدا کر دی ہے، مندرجۂ ذیل اشعار میں غالب نے قصیدہ کا مقصد بیان کیا ہے:

گریہ را در دل نشاطِ دیگر است خندہ بر لبہای خندان می زنم
در جنون بیکار نتوان زیستن آتش تیز است دامان می زنم
خار خار چاک دیگر داشتم بخیہ برچاک گریبان می زنم

سرچشمۂ آبِ رز سے خوب سیراب ہو کر، شاعر اپنے گناہ چھپاتا نہیں، بلکہ صاف صاف اعلان کرتا ہے:

راز دان خوی دہرم کردہ اند خندہ بر دانا و نادان می زنم
خوی آدم دارم، آدم زادہ م آشکارا دم زعصیان می زنم

غالبم از می پرستی ننگ ذرم غوطہ در گرداب طوفان می زنم

خوش مزاجی کے ساتھ، بطور استعارہ کے غالب کہتا ہے کہ ہر زمانے میں زندگی کا مقصد ایک ہی رہا ہے، یعنی رجال پرستی،

دعویٰ ہستی ہمان بُت بندگیست کافرم گر لافِ ایمان می زنم

غالب اپنی برگشتہ طالعی پر نوحہ خواں ہے، وہ تقدیر سے لڑتا ہے، اگرچہ اس سعیٔ رائیگاں کے مفہوم سے واقف ہے:۔

می ستیزم با قضا از دیر باز خویش را بر تیغ عریان می زنم
لعب با شمشیر و خنجر می کنم بوسہ بر ساطور و پیکان می زنم

غالب، نواب سے اپنی دوستی پر نازاں ہے اور اعلان کرتا ہے:۔

دست رد بر تاجِ قیصر می نہم پشت پا بر تخت خاقان می زنم
آن ہمای تیز پروازم کہ بال در ہوائے مصطفیٰ خان می زنم
عرفی و خاقانیش فرمان پذیر سکہ در شیراز و شروان می زنم
گلشن کو میش گذرگاہ من است دُوش در رفتن بر رضوان می زنم

قصیدہ نمبر ۶۱

یہ بھی غالب کے بہترین قصائد میں سے ہے، اور یہ مولوی مفتی صدرالدین آزردہ کی تعریف میں ہے، غالب کے دوست، رہنما اور فلسفی تھے، مولوی صاحب بڑی حد تک شاعر کے فکر و فن کی ناہمواریوں کو دور کرنے کا ذریعہ تھے۔ اس قصیدہ میں شاعر اس احساس کا بدلہ چکاتا ہے، یہ قصیدہ عرفی کے مشہور قصیدہ کی طرح میں ہے۔ اس کا مطلع ہے:۔

صبحدم چون در دمد دل صُور شیون زائی من
آسمان صحن قیامت گردد از غوغائی من

عرفی کا قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے، اور تعلّی کے مضامین سے پُر ہے، غالب نے عرفی کا آہنگ برقرار رکھتے ہوئے، ممدوح کے ساتھ

پورا انصاف کیا ہے اور پر خلوص احساسات کے ساتھ، مولوی صاحب کے نمایاں اوصاف کو بیان کیا ہے۔ دونوں قصیدے ۶۸۔۶۸۔ اشعار کے ہیں، ہمارے شاعر نے شوکتِ الفاظ اور بلندی افکار میں عرفی کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ ۶۸ اشعار میں سے ۱۷ اشعار ہم قافیہ ہیں، اور باقی ۲۴ اشعار عرفی کے قصیدہ سے کہیں زیادہ پرزور اور چست قوافی پر مبنی ہیں،

قاآنی کا مطلع ہے:

رُود آمون گشت جیحون زاشک جیحون زائے من
رشک سیحون شد زمین از چشم خون پالائی من

عرفی کا قصیدہ خود نمائی، اور خود ستائی کے جذبات سے اُبل رہا ہے، اسکے برعکس غالب نے ممدوح کی چہرہ نمائی کی ہے، عرفی کا قصیدہ بے شک زیادہ پُرزور ہے، لیکن دراصل یہ دونوں نظمیں ایک دوسرے کا جواب ہیں، اگر انھیں ایک ساتھ ترتیب دے دیا جائے، تو فارسی زبان کے بہترین قصائد میں شمار ہو سکتی ہیں،

تشبیب میں نامساعدت زمانہ کا رونا ہے:

زان نمی ترسم کہ گرد و قعر دوزخ جای من
وای گر باشد ہمین امروز من فردای من
از برون سُو آبم امّا از درون سُو آتشم
ماہی از جوئ سمندر یابی از دریائ من
روزگارم را بنا کامی شماری دیگر است
خود پس از روز شمار آید شب یلدائ من
آن فغان سنجم کہ ہم در علم حق پیش از ظہور
خواب از چشم ملائک رفتہ از غوغائ من

آخری شعر، عرفی کے جواب میں ہے،

مولوی صاحب کی تعریف میں غالب کہتا ہے:

صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار
میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائی من
صاحبا، از میمن فیض رُوشناسیہای تست
روشناس چرخ و انجم پایۂ والائی من
اینکہ در وصفت سخن راندم، رحیق مشکبوست
وین رحیق است آبروی ساغر و مینائی من

آخری شعر میں اشارہ ہے کہ قصیدہ شراب کے اثر کے تحت لکھا گیا تھا، عموماً غالب رات کے وقت، شراب سے سرشار ہو کر لکھا کرتا تھا اور شراب میں گلاب ملا لیا کرتا تھا تاکہ اس کے مضر اثرات اعتدال پر آجائیں، اس نے خود کہا ہے:

آسودہ باد خاطر غالب، کہ خوئے اوست　　آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

اسی خیال کا اعادہ قصیدے کے مندرجہ ذیل شعر میں ہے:

رِندِ دُرد آشام غالب نام در ساقیگری
پارۂ مشک و گلاب افزود در صہبائی من

مندرجہ ذیل شعر میں شراب سے والہانہ محبت دیکھئے:

گر ننوشم دیگر و در شیشہ دارم پیش رُوی[۱]
بوئی می از بس خوشی باشد روان آسائی من

قصیدہ نمبر ۶۲

یہ آخری قصیدہ ہے جو غالب نے اپنے مربی، دوست، شاگرد اور قریبی عزیز نواب ضیاء الدین احمد خاں المتخلص بہ نیر ؔ و رخشاں کے نام معنون کیا ہے، یہ وہ

---

[۱] یہی خیال اردو کے اس شعر میں باندھا گیا ہے:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

شریف زادہ ہے جس نے غالب کے اردو اور فارسی سرمایۂ حیات کو جمع کرنے کا فرض انجام دیا[۱۵] ان کے بغیر شاید اس روحانی مسرتوں کے خزینے سے دنیا یکسر محروم رہ جاتی،

نواب کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہتا ہے :-

منم خزینۂ رازو درِ خزینہ راز ضیای دین محمد کہین برادر من
بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق بعمر کہتر و از رُوی رتبہ مہتر من
بہ نکتہ شیوۂ شاگردِ من بما ماناست صنم بہ صورت خود می تراشد آذر من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم بود بپا پہ ارسطوئے من سکندر من

مندرجہ ذیل اشعار، نواب کی عظمت کے آئینہ دار ہے، جو غالب کے لئے بڑا اسہارا تھا :-

زمین کوئے مرا آسمان کند ہر صبح طلوع نیر روشن ز طرف منظر من
اگر شوم بمثل آتشی شرارہ فشان شود بقاعدۂ ہمدمی سمندر من
بہ بحر گر فتدم رہ بود سفینۂ من بہ بخت گر بودم رای گردو افسر من

اگرچہ بعض اوقات بخل اور تعصب کا غلبہ ہو جاتا تھا، لیکن عمومی طور پر غالب کا دل انسانی اخوت کے جذبے سے منور تھا۔ اس خیال کا اظہار اس نے متعدد موقعوں پر کیا ہے، شعر دیکھئے :

اگرچہ بدر دِشم، پاس ہر روش دارم
چراغِ دیر و حرم نورِ چشم صرصر من

قصیدہ نمبر ۶۴

یہ دیوان کا آخری قصیدہ ہے، اور اس دور کی تخلیق معلوم ہوتا ہے، جب یاس و ناامیدی کی انتہا تھی، کیونکہ پوری نظم میں کرب، آلام اور اذیت کی تیز رو

---

[۱۵] اردوئے معلیٰ صفہ ۱۰۶، ۱۶۳، ۲۹۷،

موجود ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ قصیدہ غالب نے قید سے رہائی کے فوراً بعد لکھا ہو، تیر و تند خود ملامتی، اور زہر خند اس کی نمایاں خصوصیت ہے، اصل میں اسے شاعر کے آلام و یاس کا مرتبہ کہا جا سکتا ہے، نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہر شے غالب کے خلاف ہے اور وہ ظالم قسمت کے تیر گنتا ہے، جن کے نشانے اس نے عمر بھر خالی دیئے، اس نظم اور ہملٹ کی خود کلامی میں بہت کچھ مشترک ہے، جب وہ "دیوانۂ ہوشیار" چیخ اٹھتا ہے، اور کہتا ہے:

"زندہ رہا جائے، یا نہ رہا جائے"، بے مہر قسمت پر شاکر ہو کر شاید شاعر اس قیاس میں تسکین پاتا ہے: بقول خود:-

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ نظم شاعر کی آرزوؤں اور حسرتوں کا نوحہ ہے۔ اس میں غالب کے زخم خوردہ دل کی گہرائیاں نمودار ہوتی ہیں۔

قصیدے میں ایک ناتواں مخلوق کی جھلک دکھائی دیتی ہے، ملاحظہ ہو:-

از نکوئی نشان نمی خواہم
خویش را بدگمان نمی خواہم
بادۂ من مدام خونِ دل است
از مُغان ارمغان نمی خواہم
دوستان زینہار غم نخورند
شادئ دشمنان نمی خواہم
ہیچ کس سود من نمی خواہد
ہیچ کس را زیان نمی خواہم
ہر یکی دشمنی ست دوست نما
یاری از اختران نمی خواہم

بہرِ خویش از زمانۂ غدار
راحت جاودان نمی خواہم
آتش اندر نہادِ من زدہ اند
لالۂ وارغوان نمی خواہم
گہر افشانم و بہا طلبم
سیم و زر رائیگان نمی خواہم
بالش از مخملم تمنّا نیست
بستر از پرنیان نمی خواہم
خستۂ چشم زخمِ خویشتنم
ناوکی بر نشان نمی خواہم
جا بر احباب تنگ نتوان کرد
خویش را در جہان نمی خواہم
سینہ صافم، قلندرم، مستم
راز خود را نہان نمی خواہم
خو بہ بیداد کردہ ام غالب
عدلِ نوشیروان نمی خواہم

فصلِ پنجم

غزلیات

۱۔ شاعری کے تین دبستان

ہم اِس صنف شاعری کی ابتدا اور ارتقا پر بحث نہیں کریں گے، اِس موضوع پر بے شمار تصانیف موجود ہیں، لیکن مختصراً ہم غزل کے مختلف اسالیب و مکاتب کا جائزہ لیں گے، جو وقتاً فوقتاً قائم ہوئے اور مستند اور قابلِ اتباع قرار پائے،

غالب چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتا ہے۔

"پیر و مرشد! حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے، کہ میں نے ممتاز[۱] اور اختر[۲] کی شاعری کو ناقص کہا تھا، حضرت صاحب، ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار قتیل و واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں، رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہ ہم تک ایک گروہ، ان حضرات کا کلام تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے، فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا

---

[۱] مولانا شیخ احسن اللہ کانپوری ممتاز فارسی کا مانا ہوا شاعر تھا، مثنوی "بحر مواج" اس کا شاہکار ہے، [۲] قاضی محمد صادق قتیل کا شاگرد تھا، اِس کی دو تصنیفات "آفتابِ عالمتاب" اور "لعل و گوہر" مشہور ہیں، ۱۸۵۸ء میں وفات پائی،

مبدع ہوا،...... اس شیوہ کی تکمیل ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی[۳] نے کی، سبحان اللہ! قالب سخن میں جان پڑ گئی، اس روش کے بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربا دیا، صائب و سلیم[۴] و قدسی[۵] و حکیم شفائی[۶] اس زمرہ میں ہیں...... تو طرزیں اب تین ٹھہری ہیں: خاقانی اس کے اقران، ظہوری، اس کے امثال، صائب، اس کے نظائر، ممتاز اور اختر وغیر ہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے، پس ہم نے جانا کہ ان کی چوتھی طرز ہے"[۷]

اس میزان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ بیدل، ناصر علی، اور قتیل اپنے جداگانہ مکتبۂ خیال کے بانی اور پیرو تھے، جو کچھ بھی ہو، مگر فارسی دبستان نہ تھا، کیونکہ اُس میں مقامی یعنی ہندوستانی محاورہ کی بھرمار تھی، جب غالب منظر عام پر آیا، تو یہ اسلوب عروج پر تھا، چنانچہ اوائل میں وہ بھی اِس کا حلقہ بگوش ہوگیا، یا یوں کہیئے، کہ شکار ہوگیا، اردو اور فارسی میں اس نے ابتداً اسی اسلوب میں خامہ فرسائی کی، لیکن جلد ہی

---

[۳] مُلّا نوعی جیشانی فیضی اور عرفی کا ہم عصر تھا، شہزادہ دانیال کا درباری تھا، بعد ازآن نواب عبدالرحیم خانخانان سے متعلق ہوگیا، "ساقی نامہ" اور "مثنوی سوز و گداز" اسکے شاہکار ہیں، ۱۶۱۰ء میں برہان پور میں وفات پائی،

[۴] مرزا محمد قلی ترشتی شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، ۱۶۴۷ء میں کشمیر میں وفات پائی، کوہ "تخت سلیمان" کے دامن میں مدفن قرار پایا،

[۵] حاجی جان محمد مشہدی سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا، ۱۶۴۶ء میں لاہور میں وفات پائی (خزانۂ عامرہ) [۶] حکیم شرف الدین حسن ایران کے شاہ عباس کا درباری طبیب تھا، ہجو گوئی میں مسلّم تھا، ۱۶۲۷ء میں وفات پائی "ایران کی ادبی تاریخ" از پروفیسر براؤن، جلد چہارم، ص ۲۵۶، [۷] اردوئے معلّٰی صفہ ۱۱۴،

اِس اسلوب کی خامیوں اور کمزوریوں سے باخبر ہو کر، اس نے اسے یکقلم ترک کر دیا، اور مشاہیر ایران بمثل نظیری، ظہوری، محتشم کاشی، حکیم شفائی، عرفی، طالب، صائب، شوکت[۸]، جلال آسیر[۹] اور حزین وغیرہم سے استفادہ کیا، اور انہیں کے اسلوب کو ترقی دی، اُس کے فارسی دیوان کی تقریظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے،

ناصر علی کی شاعری ثقیل الفاظ و مرکبات، بے مزہ اور پھیکے تشبیہات و استعارات، ڈھیلی اور بے جوڑ تراکیب، مضحکہ خیز اور پامال خیالات اور غیر حقیقی تصورات سے بھری پڑی ہے، دراصل یہ ایک مہمل اور بیراہ روش بیان ہے، کوئی تعجب کی بات نہیں، کہ غالب نے اِس قابلِ شرم مہملیت کو ترک کر دیا، گہرائی نظر اور بدیع طرزِ فکر کا حامل ہونے کی بنا پر، غالب نے اپنے فن کی تہذیب کی، وہ کہتا ہے:

"ایک سپاہی زادۂ ہیچمدان .... ہاں، ایک طبع موزون، اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں، اور یہ بھی یاد رہے، کہ فارسی کی ترکیب، اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز ہیں، میرا قول اکثر خلافِ جمہور پایئے گا،"[۱۰]

غالب الفاظ اور فقرات کے استعمال میں بہت زیادہ محتاط تھا، اس نے کوئی ایسا لفظ یا ترکیب استعمال ہی نہیں کی، جس کی سند اساتذۂ زبان کے یہاں نہ ہو، اُس نے کہا ہے:

"ہندوستان کے باتونی لوگوں کو "خم وچم" بولتے سُنا ہی آجتک کسی نظم و نثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا، لفظ پیارا، مجھ کو بھی پسند

---

[۸] سید مرزا جلال ولد مرزا مومن شہرستانی شراب کا دلدادہ تھا، ۱۶۳۹ء میں جوانا مرگ ہوا، میرزا صائب کا ہمعصر تھا، [۹] محمد اسحاق بخارائی اسیر اور صائب کا ہمعصر تھا، [۱۰] عود ہندی صفحہ ۶،

مگر کیا کروں، جو اپنے پیشواؤں سے نہ سُنا ہو۔ اس کو کیوں کر صحیح جانوُں؟"[1]

یہی وجہ ہے، کہ اُس نے ہندوستانی شعرار کی فارسی شاعری اور زبان سے بیزاری کا اظہار کیا،

غالبؔ بہت بڑا مجتہد تھا، اس کی قوت تمیز، اور قوت تنقید نے ایک بار پھر فغانیؔ کے وضع کردہ اسلوب کو تازہ کیا،

۲۔ ان ادبی دبستانوں کی خصوصیات

رودکی کے زمانے میں یہ اسلوب فطری تھا، خیال کی سادگی اور زبان کی نفاست پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی، اوحدیؔ کرمانی نے جذباتی رنگ دیا، اور غزلیات میں انفرادیت کی روح پیدا کی، سنائیؔ، عطارؔ، رومیؔ اور عراقیؔ نے غزل کو صوفیانہ افکار و خیالات کا ذریعۂ اظہار بنایا، سعدیؔ، امیر خسروؔ اور حسنؔ نے زبان میں سادگی، صفائی اور شیرینی پیدا کی، سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے سنائیؔ اور ان کے امثال کی پیروی کی، لیکن یہ بے جان نقل تھی، حافظؔ نے غزل میں انقلاب پیدا کیا، اور اُسے تکمیل کے آخری نقطے اور عظمت کے منارے پر پہنچایا، یہاں تک کہ اس کے بعد ڈیڑھ سو سال تک اُس کے فن کے آب و تاب کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا، یہ فغانیؔ تھا، جس نے ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی، جو اگرچہ حافظؔ کے اندازِ بیان کو نہیں پہنچتا، لیکن خصوصیات کے لحاظ سے آخری ہے، یہی انداز اکبرؔ، جہانگیرؔ اور شاہجہانؔ کے درباروں میں مقبول تھا۔

مولانا شبلیؔ نے فغانیؔ کے دبستان کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی ہیں

۱۔ واضح تخیّل

۲۔ نئے استعارات و تشبیہات

---

[1] خطوط صفہ ۲۰،

۳- پُرزور اندازِ بیان

اس کے بعد مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس اسلوب کے رواج، ارتقا، اور زوال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: [۱۲]

"فغانی کے سلسلے میں رفتہ رفتہ خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی پیدا ہوئی، جس کی ابتداء عرفی نے کی، ظہوری، جلال اسیر، طالب آملی، کلیم وغیرہ نے اس طرز کو ترقی دی، اور یہی طرز مقبول ہو کر تمام دنیائے شاعری پر چھا گیا، اور چونکہ اس طرز کی بے اعتدالی سخت مضر نتائج پیدا کرتی ہے، اس لئے ملکِ سخن ناصر علی، بیدل وغیرہ کے قبضۂ اقتدار میں آگیا، اور اس طرح ایک عظیم الشان سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا"

ناصر علی اور بیدل کی شاعری کے متعلق مولانا نے لکھا ہے: [۱۳]

"یہ پھول تھا، مگر بے بُو، شراب تھی، مگر بے نشہ، حسن تھا، مگر بے جاذبیت، پیکر تھا، مگر بے رُوح"

اس لئے یہ کلیہ آسانی سے قائم کیا جا سکتا ہے، کہ غالب نے اپنی انفرادیت فکر اور صحیح وجدان کی بنا پر اس بودے ڈھانچے کو ڈھا دیا، جس کو ناصر علی کے منقلب ذوق نے کھڑا کیا تھا، اور ایک بار پھر فغانی کے شاندار اسلوب کی طرح ڈالی، ہمارے شاعر نے فغانی کے متبعین کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کیا، اور اُس کی پیروی کی، اور اس کی رُوح کو سمجھتے ہوئے، اس سے وفاکیشی کے ساتھ وابستہ رہا، اس نے اسی اسلوب پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، اور اس کا خاکہ، نظیری، ظہوری، صائب کلیم، عرفی، طالب، شوکت اور جلال کے اصولوں پر مرتب کیا، حالی بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں، [۱۴] غالب کی شاعری کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ فغانی اور اُس کے

---

[۱۲] شعر العجم جلد ۵ ص ۶۸، [۱۳] ایضاً ص ۶۵، [۱۴] یادگار ص ۲۶۹،

نامور پیروکاروں کی روش پر ہے، انوری، خاقانی، سعدی، امیر خسرو، حافظ اور قاآنی کا بھی غالب کے فن پر بڑا اثر پڑا ہے،

۳- غزلیات کی وسعت

غالب نے کُل ۲۳۴ غزلیں کہیں، جو ۱۶۲۲ اشعار پر مشتمل ہیں، ان میں سے دس غزلیں، جن کی تعداد اشعار ۱۰۳ ہے، "سبد چین" میں شامل ہیں، غالب کی سب سے زیادہ شاندار اور خیال انگیز غزلیں وہ ہیں جن کی ردیف ا، ت، د، م، ن، اور ی ہے، ایسی غزلیں تین چوتھائی کی تعداد میں ہیں، پہلی غزل حمد ہے،

۴- اساتذہ کا تتبع

غزلیات میں جن شعراء نے غالب کے ذہن پر سب سے زیادہ اثر ڈالا، وہ رومی، امیر خسرو، حافظ، نظیری، ظہوری، عرفی، طالب اور حزین ہیں، اگرچہ چند غزلیں بیدل اور قاسم الانوار کی زمینوں میں بھی کہی گئی ہیں۔

(ا) نظیری کا تتبع

غزلیات کا معتدبہ حصّہ نظیری کے شاندار اسلوب کی پیروی میں ہے، کلیات میں اُن کے نمبر ترتیب وار یہ ہیں:۔

۵، ۷، ۱۳، ۱۹، ۲۳، ۴۵، ۵۱، ۵۲، ۶۲، ۹۴، ۹۷، ۹۹، ۱۵۴، ۱۶۴، ۱۸۲، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۴۳، ۲۴۶، ۲۵۸، ۲۷۷، ۲۹۲ اور ۳۰۲

(ب) ظہوری کا تتبع

غزلیات نمبر ۸، ۳۹، ۸۳، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۷۱، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۵۱، ۲۷۱، ۲۷۶ اور ۳۰۳

ظہوری کی طرحوں میں لکھی گئی ہیں،

(ج) صائب کا تتبع

غزلیات نمبر ۹، ۲۰، ۲۷، ۳۰، ۴۷، ۵۰، ۱۲۰، ۱۳۳، ۱۳۴،

۱۴۶، ۱۵۴، ۱۷۰، ۲۲۹، ۲۳۴، ۲۴۵، ۲۵۱، ۲۸۲ اور ۳۱۱ میں صائب کا تتبع کیا ہے،

(د) حافظ کا تتبع

غزلیات نمبر ۴۹، ۹۲، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۳۷، ۱۴۵، ۱۹۰، ۲۴۲، ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۰، ۳۲۵ اور ۳۲۹ میں حافظ کی پیروی کی ہے،

(س) امیر خسرو کا تتبع

غزلیات نمبر ۸۵، ۱۵۵، ۲۰۰، ۲۲۴، ۲۷۵، ۳۲۲ اور ۳۲۸ امیر خسرو کی زمین میں کہی گئی ہیں،

(ع) رومی کا تتبع

رومی کا تتبع غزلیات نمبر ۷۴، ۱۱۰، ۱۱۳، ۳۰۰، ۳۳۰ اور ۳۴۲ میں کیا گیا ہے،

(ف) انوری، سعدی، قاسم الانوار اور فیضی کا تتبع

اِن شعرار کا تتبع غزلیات نمبر ۸۱، ۱۱۵، ۱۵۷ اور ۳۲۲ میں کیا گیا ہے،

(ص) عرفی کا تتبع

عرفی کی پیروی میں غزلیات نمبر ۴۶، ۵۷، ۱۴۰، ۲۳۲، ۲۵۰، ۲۷۸ اور ۲۹۸ لکھی گئی ہیں،

(ق) ظہیر کا تتبع

غزلیات نمبر ۲۸، ۱۶۷ اور ۲۴۸ میں ظہیر کا تتبع کیا گیا ہے،

(ر) شیخ علی حزین کی تقلید غزلیات نمبر ۲، ۳۶، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۸۲، ۸۹، ۱۰۵، ۱۴۱، ۱۸۶، ۲۱۸، ۲۳۳، ۲۶۴، ۲۹۱، ۳۰۳ اور ۳۲۱ میں نظر آتی ہے۔

۵۔ غزلیات کی خصوصیات

غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی شخصیت کے انمٹ نقوش سموئے ہیں، ان کی خصوصیات کی درجہ بندی حسب ذیل ہے :۔

(ا) ساخت

۱۔ باستثنائے غزلیات نمبر ۱۸۶ اور ۳۳۲، کسی غزل میں ہندوستانی شعرا کی طرح دو یا تین مطلعے نہیں لکھے گئے،

۲۔ غزلوں میں تعدادِ اشعار اوسطاً یکساں ہیں، کسی غزل میں ۲۰ سے زیادہ اشعار نہیں ہیں،

۳۔ ہر غزل کا مطلع اور مقطع کلیدی اہمیت رکھتا ہے،

(ب) اسلوب

۱۔ مکمل اور بے عیب تکنیک

۲۔ نادر تشبیہات و استعارات کا تنوع

۳۔ بحور کی فراوانی

۴۔ زور، روانی اور شکوہ

(ج) خیال

۱۔ عشقیہ جذبات کی کمی

۲۔ ابہام

ساخت

ہندوستان کے دیگر شعراء کے برعکس، غالب یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ غزل کی خوبی اور اہمیت ایک سے زائد مطلع لکھنے سے بڑھ جاتی ہے، صرف غزل نمبر ۸۶ کے علاوہ جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ "مژدہ ای ذوقِ خرابی، بہار است بہار" ہے غالب نے ایک سے زائد مطلع ٹھونسنے سے گریز کیا ہے، اس غزل میں بھی دوسرے مطلع کی ضرورت یوں پڑی، کہ مضمون "قطعہ بند" ہوگیا اور اشعار کا مرکزی خیال ایک رہا،

یعنی بہار کی آمد، یہی وجہ ہے، کہ اس کی غزلوں میں چستی، شوکت اور رعنائی آگئی، قاضی عبدالجمیل جنوں کے نام غالب نے لکھا:

"مطلع دو لکھنے، یہ ایجاد ریختہ والوں کا ہے،" ۱۵

غالب کی غزلیں طول میں دیگر شعراء کی غزلوں سے کم ہے، اس کی سب سے طویل غزل میں ۲۰ اشعار ہیں، اور سب سے مختصر غزل کے اشعار چھ ہیں، غزلوں کا اوسط طول دس اشعار ہے، وہ خود کہتا ہے:

"میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذونادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو سے کم نہیں،" ۱۶

عموماً غالب کا مطلع اور مقطع، پُرمغز، خیال افزا اور پرشکوہ ہوتا ہے، "مطلع" سے متعلق غالب نے کہا ہے:

ہر مطلعیکہ ریزد از خامہ ام، فغانیست
جزُ نغمۂ محبّت، سازم نوا ندارد

مطلعوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

بادۂ مشکبوی ما، بید و کنارِ کشتِ ما
کوثر و سلسبیل ما، طوبیٰ ما، بہشت ما

جنون محفل بصحرای تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم، وآہم در جگر، واماندہ است امشب

چہ عیش از وعدہ، چوُن باور زعنوانم نمی آید
بنوعی گفت "می آیم"، کہ میدانم، نمی آید

---

۱۵ خطوط، ص ۲۶۹، ۱۶ ایضاً ص ۲۹۳،

نومیدی ما گردشِ ایّام ندارد
روزی کہ سیہ شد، سحر و شام ندارد

بُتی دارم، ز شنگی، روزگاران جو بہاران بر
بمستی، خویش را گِرد آر، وگُومی ہُوشیاران بر

زُلکنت، می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہر بارش
شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش است گفتارش

چو عکسِ پُل بسیل، بذوق بلا برقص
جا را نگہدار و ہم از خُدا برقص

مرد آنکہ، در ہجومِ تمنا، شود ہلاک
از رشکِ تشنہ ای، کہ بدریا شود ہلاک

تن، برکرانہ ضائع، دل، در میانہ غافل
چُون غرقہ ای، کہ ماند رختش بسُوی ساحل

تا فصلی از حقیقتِ اشیاء نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

بیا، کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضاء بہ گردشِ رطلِ گران، بگردانیم

ہم أنا اللہ خوان درختی کہ بگفتار آورد
ہم انا الحق گو مردی را سرِ دار آورد

مقطعوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے :۔

جانِ غالب، تاب گفتاری گمان داری ہنوز
سخت بیدردی، کہ می پرسی ز ما احوال ما

چند رنگین نکتۂ دلکش، تکلف برطرف
دیدہ ام دیوانِ غالب، انتخابی بیش نیست

گر دہم شرح ستمہای عزیزان غالب
رسم امید، ہمانا کہ زجہان برخیزد

کاش ! پای فلک، از سیر بماندی غالب
روزگاری کہ تلف گشت، چرا گشت تلف؟

غالب، الف ہمان علم وحدتِ خود است
برلا چہ برفزود ؟ گر اِلاّ نوشتہ ایم

فرجامِ سخن گوئی غالب، بتو گویم
خونِ جگر است، از رگِ گفتار کشیدن

غالبؔ! بقدرِ حوصلہ باشد کلامِ مرد
باید زحرف نبضِ حریفان شناختن

درتہِ ہر حرف، غالبؔ، چیدہ ام میخانہ ای
تا زدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

جہانیان زتو برگشتہ اند، گر غالبؔ
تراچہ باک ہ، خدائی کہ داشتی، داری

اسلوب

غالبؔ زبان کا ماہر کامل اور تکنیک کا اُستاد تھا، اُس کے اشعار میں ڈھیلا پن یا بے جوڑ کیفیت نہیں ہوتی، جو سماعت پر بار ہو، تکنیکی اعتبار سے غزلیں اور زیادہ بھرپور ہوتی ہیں،

غالبؔ نے اکثر ادق اور حیران کن بحریں اختیار کی ہیں، اور اس میں کامیاب ہوا ہے، یہی ایک حقیقت، کہ غالبؔ نے رومیؔ کی مندرجۂ ذیل زمین میں کامیاب اور شاندار غزل لکھی ہے، واقعاً وہ اپنے دور کا اُستاد تھا، رومیؔ کی غزل کا مطلع ہے:

ہلہ، من عاشقِ ذاتم، تنہ نا ہا یا ہُو
ناظرِ حُسنِ صفاتم، تنہ نا ہا یا ہُو

مختصر بحریں لکھی ہوئی غزلیں خصوصی طور پر شیریں ہیں، ان میں فطری روانی موسیقی اور نفاست ہے، صرف غالبؔ اُستادانِ فن کا کامیاب تتبع کرسکتا تھا،

غزلیاتِ غالبؔ کی ممتاز و نمایاں خصوصیات میں نئی، برمحل اور برجستہ اور دل و دماغ میں اُتر جانے والی تشبیہات اور استعارات کا متنوع استعمال ہے، اس وصف میں وہ صرف قاآنی سے دوسرے درجہ پر ہے، اس بیانکی وضاحت

کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را
مہتاب کف مار سیاہ است شبم را

ما ہمای گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ہمچو دود بالا میرود از بال ما

جہان دو کیست از سودا کہ میگرداندش غالب
تو گوئی گنبد گردون سر شوریدہ را ماند

جعد مشکین مرا غالیہ سایست نسیم
رخ رنگین ترا غازہ نگاراست بہار

بی پردہ شو از ناز و میندیش کہ مارا
چون آئینہ چشمیست کہ دیدن نشناسد

از مہر جہان تاب امید نظرم نیست
این طشت پر از آتش سوزان بسرم ریز

بتی دارم کہ گوئی گر بردی سبزہ بخرامد
زمین چون طوطئ بسمل تپد از ذوق رفتارش

چوں عکس پل بسیل بذوق بلا برقص
جارا نگہدار و ہم از خود جدا برقص

ہم بعالم زاہل عالم برکنار افتادہ ام
چون امام سبحہ بیرون از شمار افتادہ ام

فرجام سخن گوئی غالب بتو گویم
خون جگر است از رگ گفتار کشدن

غالب کی غزلیات کی نمایاں خصوصیت اُس کا اختصار ہے، ایمائی اور کنایہ آمیز اسلوب کے ساتھ اُس کا تغزل چُست اور پُر لُطف لب و لہجہ اختیار کر لیتا ہے، جس سے خیالات میں زور اور بلاغت پیدا ہو جاتی ہے، اس نے خود کہا ہے:

"میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا، کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر

ع ہر سخن وقتی و ہر نکتہ مکانی دارد

یہ فرق، البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں" [۵]

انتہائی پختہ اور چست اسلوب کی بنا پر خیالات میں ابہام پیدا ہو گیا ہے، اگرچہ اس کا انوکھا اسلوب حیران کن ہے، ایسے اشعار بے شمار مل جاتے ہیں جن میں ایک حسن اور خیال کی ندرت ہے، شوکت الفاظ سے روانی پیدا ہوتی ہے اور یہ شکوہ اور یہ روانی، غالب کی غزلوں کو ان بلندیوں تک پہونچا دیتی ہے، کہ نظیری ظہوری اور حزیں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، الفاظ کی تیز اور فطری روانی، برمحل

---

[۵] خطوط، صفہ ۲۵۔

تراکیب اور محاورات کا بے روک سیلاب، درخشاں تشبیہات اور طرب انگیز استعارے، اس کی غزلوں میں مزید رنگینی پیدا کرتے ہیں، اس کی غزلیں، جذباتی، فلسفیانہ اور متصوفانہ ہونے کے ساتھ ساتھ، بے ساختہ فن کا نمونہ ہیں، الغرض غالبؔ اُستادانِ فن کے شانہ بشانہ، نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے،

خیال

اِس نظریہ کے برخلاف، کہ

ہر مطلعیکہ ریزد از خامہ ام، فغانیست
جُز نغمۂ محبت، سازم نوا ندارد

غالبؔ نے کہیں اور اعتراف کیا ہے:

"عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے، جو ایمان سے کفر کو" [۱۸]

اِس قولِ محال کی بنا پر، قاری اُس کی غزلیات کی رُوح کو سمجھ کر، خود ایک غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکتا ہے، جہاں تک محبت کی تپش، شعلہ مزاجی اور سوز کا تعلق ہے، ہمیں غالبؔ کے کلام میں پوری طرح نہیں ملتا، حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی غزلوں میں ایسی جذباتی روح نہیں پاتے، جو اس کے قصیدوں میں ملتی ہے، حافظؔ اور نظیریؔ کے سے عشقیہ جذبات اور تڑپ اُس کے کلام میں نہیں ہے،

اساتذہ کی قابل ستایش اور ٹکسالی خصوصیات کی پیروی کے ساتھ، غالبؔ کے کلام میں روشِ خاص کا واضح پتہ چلتا ہے، میری مراد خیال و اسلوب کی انفرادیت نیز اس کی زندگی کے ہر طرز سے ہے، اسی اہم لیکن پیچیدہ خصوصیت کی جستجو میں غالبؔ نے ایک کنایہ آمیز اسلوب ایجاد کیا، جو پُر شکوہ تو ضرور ہے، مگر ابہام سے پُر بھی ہے،

یہ حقیقت ہے، کہ غزلیات میں غالبؔ اُن حیرت انگیز بلندیوں پر نہیں پہونچ سکا،

---

[۱۸] ایضاً صفہ ۳۲۱،

جو اس کے قصائد میں نظر آتی ہیں، خیالات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، حالی نے بھی کہا ہے:

"غزل[۱۹] عام فہم نہیں ہے"

عجب اتفاق ہے کہ عرفی اور غالب، جو غزل اور قصیدے پر فخر کرتے تھے، اس کے برعکس قصیدہ اور غزل کی بنا پر مشہور ہوئے۔ عرفی اعلان کرتا ہے:۔

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

غالب کا نظریہ ہم جانتے ہی ہیں، یہ قسمت کا مذاق ہے، کہ ان مشاہیر کی شہرت ان اصناف سے ہوئی، جن سے انھوں نے بیزاری کا اظہار کیا۔ عرفی کے قصیدے بے شک ایسے ہیں کہ اپنے خالق کو بلندیوں پر پہونچا سکتے ہیں، لیکن یہی بات غزلیات غالب کے باب میں درست نہیں ہے، اس کا میدان قصیدہ ہے، لیکن بہت کم لوگ اس کے قصائد پڑھتے ہیں، میں اس کے قصائد یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں ہوں، اس کے قصائد پکار پکار کر اس کی زباندانی کا اعلان کرتے ہیں، کیونکہ یہ قصائد دوسروں کے بہترین قصائد کے ہم پلہ ہیں،

آمد بر سر مطلب، غالب کے خیالات پیچیدہ، مبہم، ادق اور ناقابل فہم ہیں، وہ بال کی کھال نکالنے کا عادی ہے، اس لئے اس کے بعید از قیاس مفہوم تک پہونچنے کے لئے قاری کو ذہنی ورزش کرنا پڑتی ہے،

غالب کی اردو غزلیں اس کی فارسی غزلوں سے ہزار بار بہتر ہیں، بقول خود:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہیں

۱۹؎ ایضاً صفحہ ۲۹۴

۶- غزل مُسلسل

سروِلیم جونس[۲۰] نے خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی مشہور و معروف غزل

اگر آن ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

میں غزل کا ترجمہ "ایشیائی موتیوں کا بکھرا ہُوا ہار" کیا ہے، کیونکہ غزل کا ہر شعر بذاتِ خود ایک خیال ہوتا ہے، غزل میں کوئی مرکزی خیال نہیں ہوتا، اس کے علاوہ غزل کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے، جس میں غزل کی تمام خوبیوں کے ساتھ کسی ایک مرکزی خیال کو باندھا جاتا ہے، اِسے "غزل مسلسل" کہتے ہیں، ایسی غزلیں صوفیانہ خیالات بیان کرنے کے لئے بڑی موزون ہوتی ہیں۔

فارسی شاعری کے باوا آدم، رودکی نے سب سے پہلے اس کی آبیاری کی، عطار اور سنائی نے اسے متصوفانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، سعدی نے اپنے "بدائع" میں اختیار کرکے اس میں گُل کاریاں کیں، امیر خسرو نے سعدی کی پیروی میں اس کی افادیت میں مزید اضافہ کیا، اور پھر حافظ نے اسے مکمل آرٹ کی صورت بخشی،

غالب نے تیئیس ایسی غزلیں کہی ہیں، مثلاً دیوانِ فارسی کی غزل نمبر ۱، ۴۷، ۹۸، ۱۲۷، ۱۵۷، ۲۱۳، ۲۳۶، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۴، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۷، ۳۰۱، ۳۰۹، ۳۱۸، ۳۲۸، ۳۳۱ اور ۳۳۴ مسلسل ہیں، ان کے مطلعے یہ ہیں:-

ای بخلا و ملا خوی تو ہنگامہ زا
با ہمہ، در گفتگو، بی ہمہ، در ماجرا

---

[۲۰] جونس فارسی اور سنسکرت کا عالم تھا،

سحر دمیدہ، وگُل در دمیدنست، مخسپ
جہان جہان گُلِ نظارہ چیدنست، مخسپ

حق جلوہ گر، ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آری، کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

بعشق، از دو جہان بی نیاز باید بود
مجاز سُوز، حقیقت گداز باید بود

دلستان بجلند، ارچہ جفا نیز کنند
از وفائی کہ نکردند، حیا نیز کنند

ہم انا اللہ خوان درختی بگفتار آورد
ہم انا الحق گوُی مردی را سرِ دار آورد

بمقصدی کہ مر آن را رہ خدا گویند
برو برو، کہ از آن سُو "بیا، بیا" گویند

چوُن عکس پل بسیل، بذوقِ بلا برقص
جا را نگہدار، و ہم از خود جُدا برقص

بیا، کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا، بگردشِ رطلِ گران بگردانیم

رفتم که کهنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو، نمطی دیگر افگنم

زهی، باغ و بهار جانفشانان
غمت، چشم و چراغ رازدانان

ما، پری شیوه غزالان وزم دُم رَم شان
دل مردم به خم طرّه و خم در خمِ شان

خیره کند مرد را، مهرِ درم داشتن
حیف، ز همچون خودی، چشم کرم داشتن

چه غم؟ ار بجد گرفتی، ز من احتراز کردن
نتوان گرفت از من، بگزشته ناز کردن

تا ز دیوانم، که سرمستِ سخن خواهد شدن
این می، از قحطِ خریداری، کهن خواهد شدن

دولت، به غلط بنود، از سعی پشیمان شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

جُبتی دارم، ز اہل دل رم گرفته
بشوخی، دِل از خویشتن ہم گرفته

چوں زبانہا لال، وجانہا پُر زغوغا کردۂ
یادت از خویش پُرسید، آنچہ با ما کردۂ

بردست وپای بندِ گرانی نہادۂ
نازم بہ بندگی، کہ نشانی نہادۂ

تاہم ز دل بُرد کافر ادائی
بالا بلندی، کوتہ قبائی

خوشنود شوی، چون دلِ خوشنود نیابی
ترسم، کہ زیان کارِ کسی، سود نیابی

۷۔ غزلیات کا تنقیدی جائزہ

یہ نہ تو مناسب معلوم ہوتا ہے اور نہ ممکن، کہ میں قصائد کی طرح، غالب کی ۴۳۳ غزلوں کا تفصیلی جائزہ پیش کروں، میری رائے ہے کہ اُس کی بہترین شاعری کا نمونہ اس کے قصائد ہیں اور یہ کہ اُس کی شاعری کا مکمل اندازہ کرنے کے لئے، قصائد سے رجوع ناگزیر ہے، اسی بنا پر میں نے اس کے قصائد کا تفصیلی و تنقیدی احاطہ کرنے کی کوشش کی، جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے، میں نے اپنے مطالعہ کے مطابق انھیں چار طبقات میں تقسیم کیا ہے،

(۱) وہ غزلیات جن میں پرشکوہ تغزل ہے،
(۲) وہ غزلیں جن میں موسیقی غالب ہے،
(۳) وہ غزلیں جن میں رومانی جوش ہے،
(۴) وہ غزلیں جو تصوف کے مضامین پر ہیں،

(۱) تغزّل

تقریباً نوّے غزلیات احساس کی گرمی و درخشانی، اور طرز بیان، روانی اور زور کی آئینہ دار ہیں، ان میں شیریں جست و خیز اور زیر و بم ہے، خیالات بلند ہیں، بعض غزلوں میں یہ جملہ اوصاف یکجا ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ غزل جس کا مطلع ہے:

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بگردشِ رطل گران بگردانیم

یہ غزل محاسن کے علاوہ لب ولہجہ اور معنویت کے اعتبار سے بڑی باغیانہ ہے اور انگریزی شاعر سوِن برن کی دو نظموں — "وقت[۳۲] کی فتح" اور "الوداع[۴۳]" یاد دلاتی ہیں، سوِن برن کا ہندی نژاد معاصر، دنیا کو انوکھے انداز میں فتح کرنا چاہتا ہے، یہ غزل ہمارے شاعر کے ناقابلِ تسخیر حوصلے کی ایک جھلک ہے، جو بختِ بے مہر کی چیرہ دستیوں سے عاجز آکر، ایک نیا سماجی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے، جس میں آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ عمل سرِفہرست ہو، علامہ اقبال نے اِس غزل کو جاوید نامہ میں لافانی بنا دیا ہے،

موسیقی کی خاموش شیرینی، واضح اور برجستہ تخیل، احساس کی گہرائی اور خلوص اور اس کا جرأت مندانہ لہجہ اس غزل کو غالب کے شاہکاروں میں شامل کرتا ہے، اس غزل میں حافظ کی آواز بازگشت سُنائی دیتی ہے، اس کا مطلع ہے:

بیا، تا گل بیفشانیم، و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم، و طرح دیگر اندازیم

خود حافظ اپنے ساز پر اس سے بہتر نغمہ نہیں گا سکتا تھا، جو ہمارے بیباک اور

ھ۳۲ THE TRIUMPH OF TIME

ھ۳۳ LEAVE TAKING

پُر حوصلہ مغنّی نے سُنایا، یہ ممتاز غزل ماحول وقت کا ردّ عمل ہے،
معلوم ہوتا ہے، کہ یہ غزل کلکتہ میں لکھی گئی، کیونکہ اس کے لب و لہجہ میں اُن تلخیوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جو وہاں غالبؔ کے تجربہ میں آئیں،
ایک اور غزل کا مطلع ہے:-

دُودِ سودای تُتُق بست، آسمان نامیدمش
دیدہ برخوابِ پریشان زد، جہان نامیدمش

اس غزل میں غالبؔ بڑے سے بڑے اساتذہ کا ہم پلہ نظر آتا ہے، یہ غزل نادر خیالات اور صنائع کا مرقع ہے، یہ شاعر کی بہترین غزلوں میں سے ہے، اس کی خصوصیات روانی، شکوہ، سادہ اور پرشوکت اسلوب اور بلند آہنگ خیالات ہیں، پوری غزل رعنائی کا مرقع ہے، جس میں باوقار، حقیقت پسندانہ، شگفتہ اور نادر استعارات و تشبیہات موتیوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں، اس میں شاعر نے شاعرانہ آزادہ روی پوری طرح برتی ہے۔

ایک اور غزل، جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے، اعلی شاعری کا نمونہ ہے:

خواست کز ما رنجد و تقریبِ رنجیدن نداشت
جرم غیر از دوست پرسیدم دپرسیدن نداشت

یہ ظہوری کی ایک غزل پر ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

دوش آن بے صبر خود رنجید و رنجیدن نداشت
بیزبانی عذرہا می گفت و نشنیدن نداشت

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

بُرد آدم از امانت ہرچہ گردون برنتافت
ریخت می برخاک، چون در جام گُنجیدن نداشت

یہ شعر حافظؔ کے اِس شعر کی یاد دلاتا ہے

آسمان، بارِ امانت، نتوانست کشید　　قُرعۂ فال، بنامِ من دیوانہ زدند

غزل نمبر ۸۲ کا مطلع دیکھئے:

دل برد، وحق آنست، کہ دلبر نتوان گفت
بیداد توان زیست، وستمگر نتوان گفت

یہ غزل بھی اعلیٰ فن پارہ ہے یہ حزیںؔ کی زمین میں تخلیق کی گئی ہے،

اسرار تو با زاہد و مُلّا نتوان گفت
با کوردلان نُورِ تجلّیٰ نتوان گفت

غالباً حزیںؔ نے رومیؔ کا تتبع کیا ہے:-

دردیست درین دل، کہ ہویدا نتوان گفت
سرّیست درین سینہ، کہ پیدا نتوان گفت

یہ شعر اِس غزل کی جان ہے:-

آن راز کہ در سینہ نہانست، نہ وعظ است
بردار توان گفت، و بہ منبر نتوان گفت

غزلیات نمبر ۱۷۹ اور ۳۲۲، شاید غالبؔ کی بہترین غزلیں ہیں، جن کا ہر شعر آبِ کوثر میں دُھلا ہُوا ہے، یہ غزلیں امیر خسروؔ اور انوریؔ کی مشہور زمینوں میں ہیں، غالبؔ کی غزلوں کے مطلعے حسب ذیل ہیں:-

چہ غم، ار بجد گرفتی، ز من احتراز کردن
نتوان گرفت از من، بگذشتہ ناز کردن

دیدہ ور آن کہ تا نہد دل بشمار دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقص بُتان آذری

خسروؔ کا مطلع ہے:

چہ بلاست، از دو چشمت، نظرِ نیاز کردن
مِژہ را کشاد دادن، درِ فتنہ باز کردن

نظیری کا مطلع یوں ہے:۔

چہ خوش است از دو یکدل سرِ حرف باز کردن
سخن گزشتہ گفتن، گلۂ دراز کردن

حزیں کی غزل یوں شروع ہوتی ہے:۔

چہ خوش است با خیال تو نہفتہ راز کردن
بزبانِ بے زبانی سرِ شکوہ باز کردن

اقبال کی دلکش غزل کا مطلع یہ ہے:۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمی گداز کردن

معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے نظیری کی پیروی کی ہے، کیونکہ اس شعر میں اس کا اشارہ موجود ہے:

ہلہ تازہ گشتہ غالب روشِ نظیری از تو
سزد این چنین غزل را بسفینہ ناز کردن

دوسری غزل انوری کے بہترین قصیدہ پر ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

ای مسلمانان فغان زین دورِ چرخِ چنبری
وز نفاق تیر و قصدِ ماہ و کیدِ مشتری

(ب) موسیقی

غزلیات نمبر ۳۵، ۶۲، ۱۰۳، ۱۱۵، ۱۸۶، ۱۹۲، ۲۷۸ اور ۳۲۲ موسیقی سے لبریز ہیں، اور مترنم بحروں میں ہیں۔ ان کے زیر و بم، اور زبان کی مٹھاس، ستھری اور خوشنما تشبیہوں سے ایک طرح کی خوش آہنگی اور بلندی پیدا ہو گئی ہے، مندرجہ ذیل مطلع میں الفاظ کا قدم قدم مارچ ملاحظہ فرمایئے:۔

بادۂ مشکوی ما، بید و کنار کشت ما کوثر و سلسبیل ما، طوبیٰ ما بہشت ما

پوری غزل ساز موسیقی کے مانند معلوم ہوتی ہے، جس کی ضربیں آسماں تک پہنچتی ہیں، اور جس پر ہر شخص کا دل دھڑکتا ہے:۔

غزل نمبر ۶۲ کی بحر بیحد مترنّم اور شگفتہ ہے، مطلع ہے:

هر چه فلک نخواست است، هیچکس از فلک نخواست
ظرفِ فقیهه می نجُست، بادهٔ ماگزک نخواست

یہ غزل نظیری کی زمین میں کہی گئی ہے، مطلع ہے:

کس نخورد جرُعۂ، کز جگرم گزک نخواست
بی نمکی نہ گفت کس، کز سخنم نمک نخواست

غزلیات نمبر ۱۸۵ اور ۱۸۶ جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں بے پناہ روانی اور موسیقی کے ساتھ، نوجوانی کے جوشیلے جذبات کی آئینہ دار ہیں، مطلعے یہ ہیں:۔

بُتی دارم، ز شنگی روزگاران خوُبهاران بر
بمستی، خویش را گِر دآر، وگوی ز هوشیاران بر

مژده، ای ذوقِ خرابی، که بهاراست، بهار
خردِ آشوب تراز جلوهٔ یاراست، بهار

پہلی غزل میں محبوب کی دلکش تصویر کشی ہے، اور دوسری غزل میں مسرّت کے زمانے، یعنی بہار کی آمد کا ذکر ہے، پہلی غزل میں شاعر اپنے آئینۂ دل میں محبوب کا حسنِ بلاخیز دیکھ کر، عالم نشاط میں کھو جاتا ہے، دوسری غزل دلکش تشبیہات کا نگارخانہ ہے، ان غزلوں میں ع

عشق بازی، وجوانی و شرابِ لعل فام

کی جیتی جاگتی تصویر ہے،

(ج) رومانیت

بنیادی طور پر، غالبؔ رومان کا شاعر نہیں، لیکن اِس کے باوجود چند غزلیں ایسی ہیں، جو "جلوۂ جانان دراین کار داشت" کی مظہر ہیں، رکاکت اور ابتذال سے منزّا، یہ غزلیں پاک اور سنجیدہ خیال سے بھرپور ہیں، یہاں پر غالبؔ کے متعلق ایک نکتہ کی وضاحت کر دینا لازمی ہے، اس نے اوروں کی طرح محبوب کا عُریاں سراپا نہیں کھینچا، غزلیات نمبر ۶۷، ۸۲، ۸۴، ۹۳، ۱۸۵، ۲۴۰، ۲۷۱، ۲۹۲، ۳۰۹ اور ۳۱۴ رومانی شاعری کے بہترین نمونے ہیں،

(د) تصوّف

بقول غالبؔ

زمن حذر نکنی گر لباسِ دین دارم
نہفتہ کافرم و بُت در آستین دارم

غالبؔ، مذہب کے ظاہری رسوم کا پابند نہیں تھا، لیکن یہ حقیقت، کہ وہ اپنے گناہوں کا معترف تھا، اس کے پیدائشی عقائد سے خلوص کا بین ثبوت ہے، وہ کہتا ہے:۔

طاعتم می گذرد اندر خمیر نیست باقی ذوقِ عصیان نیز ہم

ایک جگہ اور کہا ہے

بشرع آویز وحق می جو، کم از مجنون نہ باری
دلش با محمل است، امّا زبان با ساربان دارد

غالبؔ لازمی طور پر صوفی تھا، اس کے قطعات، قصائد، غزلیات اور مثنویات متصوفانہ خیالات سے بھرے ہوئے ہیں، اس کی ایسی چند ہی غزلیں ہوں گی، جن میں تصوّف کے اثرات نہ ہوں، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا، تو میں غزلیات میں متصوفانہ رجحانات کا تفصیلی جائزہ لیتا،

غزلیات نمبر ۱، ۶۱، ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۴، ۱۷۰، ۲۰۱، ۲۰۸، ۲۱۳، ۲۲۸، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۶۰، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۹۱، ۲۹۷، ۳۰۱، ۳۲۸ اور ۳۳۰ سنجیدہ کیفیات میں کہی گئی ہیں۔ اِن میں سے نمبر ۱، ۱۲۷، ۲۰۱، ۲۰۸، ۲۴۵، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۹۷، ۳۰۱، ۳۲۸ اور ۳۳۰ زیادہ ـ ممتاز ہیں،

۸۔ اِنتخابِ غزلیات

چند رنگین نکتۂ دلکش، تکلف برطرف
دیدہ ام دیوانِ غالبؔ، انتخابی بیش نیست

آخر میں چیدہ چیدہ غزلیات کے چیدہ چیدہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے،

طرۂ پُرخم

ای بہ خلا و ملا خوی تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بی ہمہ در ماجرا
شاہد حسن ترا در روش دلبری — طرۂ پرخم صفات موی میان ماسوا
دیدہ وران را کند دید تو بینش فزون — از نگہ تیز رو گشتہ نگہ توتیا
آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہدر — جان نہ پذیری بہ ہیچ نقد خضر ناروا
بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
نکبتیان ترا قافلہ بی آب و نان — نعمتیان ترا مائدہ بی انتہا
گرمیٔ نبض کسی کز تو بدل داشت سوز — سوختہ در مغز خاک ریشۂ دارو گیا
مصرف زہر ستم دادہ بیاد توام — سبز بود جای من در دہن اژدہا
کم مشمر گریہ ام زانکہ بہ علم ازل — بودہ درین جوی آب گردش ہفت آسیا
سادہ و علم و عمل مہر تو ورزیدہ ایم — مستیٔ ما پایدار بادۂ ما ناشتا

خلد بہ غالب سپارزان کہ بدان روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نو آئین نوا

زھر یر سینہ

نمی بینیم در عالم نشاطی کاسمان مارا
چو نور از چشم نابینا ز ساغر رفت صہبا را

مکن نازوادا چندین ولی بستان وجانی ہم
دماغ نازک من برنمی تابد تقاضا را

سراب آتش از افسردگی چون شمع تصویرم
فریب عشق بازی میدھم اہل تماشا را

من وذوق تماشائی کسی کز تاب رخسارش
جگر بر تابہ چسپید آفتاب عالم آرا را

چہ لب تشنہ است خاکم کاستین گرد باد من
چو اشک چہرہ از روی زمین برچید دریا را

خیالش را بساطی بہر پا انداز می جستم
پسندیدم بہ مستی محمل خواب زلیخا را

دل مایوس را تسکین بمردن میتوان دادن
چہ امیدست آخر خضر وادریس ومسیحا را

بہار انست وخاک از جلوۂ گل امتلا دارد
بہ برگ نیشتر زن از خرام ناز صحرا را

سرو کارم بود با ساقئی کز تندئی خویش ست
نفس در سینہ میلرزد ز موج بادہ پیما را

خطی بر ہستئ عالم کشیدیم از مژہ بستن
زخود رفتیم وہم باخویشتن بردیم دنیا را

در آغوش تغافل عرض یکرنگی توان دادن
تہی تا میکنی پہلو بما بنمودۂ جا را

نمی رنجد کہ در دام تغافل می تپد صیدش
نمی دانم چہ پیش آمد نگاہ بی محابا را

زمین گوئیست کو مجنون کہ من بردم ز میدانش
غبارم در نورد خود فرو پیچیدہ صحرا را

ازین بیگانگیہا می تراود آشنائیہا
حیا می ورزد و در پردہ رسوا می کند ما را

حذر از زھر یر سینۂ آسودگان غالب
چہ منتہا کہ بر دل نیست جان ناشکیبا را

باغ وبہار

درگرد غربت آئینہ دار خودیم ما
یعنی ز بیکسان دیار خودیم ما

دیگر زساز بیخودیٔ ما صدا مجوی — آوازی از گسستن تار خودیم ما
از بسکه خاطر ہوس گل عزیز بود — خون گشته ایم و باغ و بہار خودیم ما
ما جمله وقف خویش و دل ما ز ما پرست — گوئی ہجوم حسرت کار خودیم ما
از جوش قطره ہمچو سرشک آب گشته ایم — اما ہمان بجیب و کنار خودیم ما
مشت غبار ماست پراگنده سو بسو — یارب بدہر در چه شمار خودیم ما
با چون توئی معامله بر خویش منت است — از شکوهٔ تو شکر گذار خودیم ما
روی سیاه خویش زخود ہم نهفته ایم — شمع خموش کلبهٔ تار خودیم ما
در کار ماست ناله و ما در ہوای او — پروانه چراغ مزار خودیم ما
خاک وجود ماست بخون جگر خمیر — رنگینیٔ تماشش غبار خودیم ما
ہر کس خبر ز حوصلهٔ خویش می دہد — بدمستیٔ حریف و خمار خودیم ما
تا رنگاه پیرو ما ملک گوہرست — رفتار پای آبله دار خودیم ما

غالب چو شخص و عکس در آئینهٔ خیال
با خویشتن یکی و دو چار خودیم ما

بادهٔ مشکبو

بادهٔ مشکبو ما بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما طوبیٰ ما بہشت ما
بسکه غم تو بوده است تعبیه در سرشت ما — نسخهٔ فتنه می برد چرخ ز سر نوشت ما
حسرت وصل از چه رو چول بخیال سرخوشیم — ابر اگر بایستد بر لب جوست کشت ما
نور خرد در آگہی خواہش تن پدید کرد — صرف زقوم دوزخ ست نامیه در بہشت ما
این ہمه از عتاب تو ایمنیٔ عدو چراست — ای به بدی و ناخوشی خوی تو سر نوشت ما
برده صدا ربعین بسر بر سر صد ہزار خم — گر بنهی در آفتاب باده چکد ز خشت ما
بی خطر از خودی بر آ لب به انا الصنم کشا — شیوهٔ گیر و دار نیست در کنش کنشت ما
باده اگر بود حرام بذله خلاف شرع نیست — دل ننهی بخوب ما طعنه مزن بزشت ما

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ این غزل
شاد بہیچ میشود طبع وفا سرشت ما

تقلید

نگویم تازه دارم شیوهٔ جادو بیانان را
ولی در خویش بینم کارگر جادوی آنان را
همانا پیشکار بخت ناسازم به تنهائی
ستوده آورده ام از چاره جوئی مهربانان را
ندارد حاجت لعل و گهر حسن خداداد ت
عبث در آب و آتش راندهٔ بازرگانان را
چه بی برگیست جان دادن بزخمی زآن دم خنجر
هلاکستم فراخیهای عیش سخت جانان را
عوض دارد گر آزارد دلم آزرده می خواهم
به قتل خویش دست و ساعد نازک میانان را
سراغ فتنه های زهره سوز از خویشتن گیرم
رگ اندیشه کار نبض باشد کاردانان را
به لفظ عشق صدره کوه دریا در میان گفتن
بیاموزید تا پیشش برید افسانه خوانان را
نه بینی برگ رز زرگشت و گل کبریت احمر شد
کند پائیز گوئی کیمیا گر باغبانان را
مرنج از نارواِئی بی نیازی عالمی دارد
حکایت ها بود با خویشتن مر بیزبانان را
نگیرد دیگران را حق بجرمی کز یکی بخشد

سرت گردم شفیعی روز محشر دلستانان را

نداند قدر غم تا در نماند کس بدان غالب

مسرت خیزد از تقلید پیران را جوانان را

شانِ رسولؐ

حق جلوه گر ز طرز بیان محمدؐ ست
آری کلام حق بزبان محمدؐ ست

آئینه دار پرتو مهر ست آفتاب
شان حق آشکار ز شان محمدؐ ست

تیر قضا هر آئینه در ترکش حق ست
اما کشاد آن ز کمان محمدؐ ست

دانی اگر بمعنی لولاک وارسی
خود هر چه از حقست از آن محمدؐ ست

هر کس قسم بدانچه عزیز ست می خورد
سوگند کردگار بجان محمدؐ ست

واعظ حدیث سایهٔ طوبیٰ فرو گذار
کاین جا سخن ز سرو روان محمدؐ ست

بنگر دو نیمه گشتن ماه تمام را
کان نیمه جنبشی به زبان محمدؐ ست

ور خود ز نقش مهر نبوت سخن رود
آن نیز نامور ز نشان محمدؐ ست

غالب ثنای خواجه به یزدان گزاشتم

کان ذات پاک مرتبه دان محمدؐ ست

گمان زیست

چه فتنه ها که در اندازهٔ گمان تو نیست

قیامت ست دل دیر مهربان تو نیست

فریب آشتی ده وظفر مبارک باد

دل ستم زده در بند امتحان تو نیست

مگر ز پارهٔ سنگم که ریزدت دم تیغ

بکش مترس که در سود من زیان تو نیست

دلم بعہد وفائی فریفت نامہ سپار
خوش ست وعدۂ تو گرچہ از زبان تونیست
شکستہ رنگ تو از عشق خوش تماشائیست
بہار دھر بہ رنگینیٔ خزان تونیست
شباہتیست مرآن راکہ برنیامدہ است
وگرنہ موی بہ باریکیٔ میان تونیست
زحق مرنج ودر ابروز خشم چین مفگن
خوش ست وعدۂ تو گرچہ از زبان تونیست
عتاب ومہر تماشائیان حوصلہ اند
بہ ہیچ عربدہ اندیشہ رازدان تونیست
روان فدای تو نامی کہ پردۂ ناصح
زہی لطافت ذوقی کہ درمیان تونیست
دل از خموشی لعلت امیدوار چراست
چہ گفتہ ای بزبانی کہ در دھان تونیست
گمان زیست بود برمنت زبیدردی
بداست مرگ، ولی بدتر از گمان تونیست
عیار آتش سوزان گرفتہ ام صدبار
بسینہ تابی داغ غم نہان تونیست
تغافل تو دلیل تجاہل افتادست
تو وخدای تو غالب زیندگان تونیست

تار پود ہستی

منع ما از بادہ عرض احتسابی بیش نیست

محتسب افشردهٔ انگور آبی بیش نیست
رنج وراحت برطرف شاہد پرستانیم ما
دوزخ از سرگرمئ نازش عتابی بیش نیست
خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گزشت
رشتۂ عمر خضر مدِ حسابی بیش نیست
قطرہ وموج وکف وگرداب جیحون ست وبس
این من ومائی کہ می بالد حجابی بیش نیست
خویش را صورت پرستان ہرزہ رسوا کردہ اند
جلوہ می نامند و در معنی نقابی بیش نیست
شوخئ اندیشۂ خویش ست سرتا پای ما
تار و پودِ ہستی ما پیچ و تابی بیش نیست
زخم دل لب تشنۂ شور تبسم ہای تست
این نمکدانہا بچشم ما سرابی بیش نیست
نامہ برازپیشگاہ ناز مکتوب مرا
پاسخی آوردہ است اما جوابی بیش نیست
جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم
حسن با این تابناکی آفتابی بیش نیست
چند رنگین نکتۂ دلکش تکلف برطرف
دیدہ ام دیوان غالب انتخابی بیش نیست

بردار توان گفت

دل بردو حق آنست کہ دلبر نتوان گفت
بیداد توان دید وستمگر نتوان گفت
دررزم گہش ناچخ وخنجر نتوان بود
دربزم گہش بادہ وساغر نتوان گفت

زخشندگیٔ ساعد و گردن نتوان جُست — زیبندگی یاره و پرگر نتوان گفت
پیوسته دہد بادہ و ساقی نتوان خواند — ہموارہ تراشد بت و آزر نتوان گفت
از حوصلہ یاری مطلب صاعقہ تیز است — پروانہ شو این جا ز سمندر نتوان گفت
ہنگامہ سرآمد چہ زنی دم ز تظلم — گر خود ستمی رفت بمحشر نتوان گفت
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت
آن راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ ست — بر دار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت

کاری عجب افتاد بدین شیفتہ ما را
مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

بار امانت

خواست کز رنجد و تقریب رنجیدن نداشت
جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت
آمد و از تنگیٔ جا جبہہ پر چین کرد و رفت
بر خود از ذوق قدوم دوست بالیدن نداشت
شد فگار از نازکی چندان کہ رفتارش نماند
نازنین پایش بکوی غیر بوسیدن نداشت
گل فراوان بود و می پر زور و دو شم بر بساط
خود بخود پیمانہ می گردید و گردیدن نداشت
دیر خواندی سوی خویش و زود فہمیدم دریغ
بیش ازین پایم ز گرد راہ پیچیدن نداشت
جوش حسرت بر سر خاکم زبس جا تنگ کرد
ہمچو نبض مردہ دور شمع جنبیدن نداشت
گر منافق وصل ناخوش، ور موافق ہجر تلخ

دیده داغم کرد روی دوستان دیدن نداشت

برد آدم از امانت هرچه گردون بر نتافت

ریخت می بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

گر نیم آزاد خود را در تعلق باختم

سود زیر کوه دامانی که برچیدن نداشت

نامرادی بود لوحی آبرو غالب دریغ

در هلاک خویش کوشیدیم و کوشیدن نداشت

کشت امید

نقشم گرفته دوست نمودن چه احتیاج؟ آئینهٔ مرا بزدودن چه احتیاج؟

با پیرهن ز ناز فرو می رود بدل بند قبای دوست کشودن چه احتیاج؟

چون میتوان برهگذر دوست خاک شد بر خاک راه ناصیه سودن چه احتیاج؟

بنگر که شعله از نفسم بال میزند دیگر ز من فسانه شنودن چه احتیاج؟

از خود بذوق زمزمه میتوان گزشت چندین هزار پرده سرودن چه احتیاج؟

در دست دیگریست سفید و سیاه ما با روز و شب بعربده بودن چه احتیاج؟

تا لب کشودهٔ مزه در دل دویده است بوس لب ترا بربودن چه احتیاج؟

بفگن در آتش و تب و تابم نظاره کن غمنامهٔ مرا بکشودن چه احتیاج؟

آن کن که در نگاهٔ کسان محتشم شوی برخویش هم زخویش فزودن چه احتیاج؟

خواب است وجهٔ همت آواره بینشان محو رخ ترا بغنودن چه احتیاج؟

تاب سموم فتنه گرانیست غالبا

کشت امید را بدرودن چه احتیاج؟

خامهٔ گنجینه فشان

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب هرزه سرایم بستند　　دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکده ز آتش نفسم بخشیدند　　ریخت بتخانه ز ناقوس فغانم دادند
گهر از رایت شاهان عجم برچیدند　　بعوض خامهٔ گنجینهٔ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند　　به سخن ناصیهٔ فرکیانم دادند
گوهر از تاج گسستند و بدانش بستند　　هرچه بردند به پیدا به نهانم دادند
هرچه در جزیه ز گبران میِ ناب آوردند　　بشب جمعهٔ ماهٔ رمضانم دادند
هرچه از دستگه پارس به یغما بردند　　تابنالم هم از آن جمله زبانم دادند
دل ز غم مرده و من زنده همانا این مرگ　　بود از زنده بماتم که امانم دادند

هم ز آغاز بخوف و خطر ستم غالب
طالع از قوس و شمار از سرطانم دادند

ستمهای عزیزان

تا کیم دود شکایت زبیان برخیزد　　بزن آتش که شنیدن زمیان برخیزد
می رمی از من و خلقی بگمانست از تو　　بی محابا شو و بنشین که گمان برخیزد
گرد هم شرح عتابی که بدلها داری　　دود از کارگهٔ شیشه گران برخیزد
باقدت سرو چو شخصیست که ناگه یکبار　　بیخود از جا ز ہجوم خفقان برخیزد
بچه گیرند عیار هوس و عشق دگر　　رسم بیداد مبادا ز جهان برخیزد
گشته دعوی پیدائی خویشیم همه　　وای گر پرده ازین راز نهان برخیزد
زینهار از تعب دوزخ جاوید مترس　　خوش بهاریست کز و بیم خزان برخیزد
ناله برخاست دم جستن از آتش زسپند　　کوشگرفی که چو ما از سر جان برخیزد
جز وی از عالم و از همه عالم بیشم　　همچو موئی که بتان راز میان برخیزد
عمرها چرخ بگردد که جگر سوخته ای　　چون من از دودهٔ آذر نفسان برخیزد
گرد هم شرح ستمهائی عزیزان غالب　　رسم امید همانا ز جهان برخیزد

شیوه‌های شاعر

چه عیش از وعده چون باور ز عنوانم نمی آید
بنوعی گفت "می آیم" که میدانم نمی آید

بویرانی خوشم لیکن جهان چون بی تو ویران ست
اگر باشم به چمن یاد از بیابانم نمی آید

گوشتم زآنکه بر زخم دل صد پاره خون گرید
خود او را خنده بر چاک گریبانم نمی آید

روش نگسسته و در سایهٔ دیوار بنشسته
بکویش رشک بر مهر درخشانم نمی آید

دعای خیر شد در حق من نفرین بجا کردن
ز نفرین بسکه میرنجد بلب جانم نمی آید

زآن بدخو ندانم چون دهد از لاله در پیدا
نویدی کز نوازش‌های پنهانم نمی آید

براهٔ کعبه زادم نیست شادم کز سبکساری
برفتن پای بر خارِ مغیلانم نمی آید

دلش خواهد که تنها سوی من روی آورد لیکن
فریب همرهان دانم ز نادانم نمی آید

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوه‌ها درم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

شود برهم ولی نز مهر پندارد که در خوابم
شبی کاو ز نالیدن ز زندانم نمی آید

ندارم باده غالب گر سحر گاهش سر راهی
به بینی مست دانی کز شبستانم نمی آید

میخانهٔ توفیق

نومیدئ ما گردش ایام ندارد — روزی که سیه شد سحر و شام ندارد
بوسم لب دلدار و گزیدن نتوانم — نرم ست دلم حوصلهٔ کام ندارد
مفرست بطوف حرم دوست نسیمی — کز نکهت گل جامهٔ احرام ندارد
هر ذرهٔ خاکم ز تو رقصان بهوائیست — دیوانگئ شوق سر انجام ندارد
رو تن به بلا ده که دگر بیم بلا نیست — مرغ قفسی کشمکش دام ندارد
قاصد خبر آورد و همان خشک دماغم — ظرف قدحش رشحهٔ پیغام ندارد
بی نقش وجود تو سراپای من از ضعف — چون بستر خواب است که اندام ندارد
گردید نشانها هدف تیر بلا ها — آسایش عنقا که بجز نام ندارد
بلبل بچمن بنگرد پروانه به محفل — شوق است که در وصل هم آرام ندارد
تلخست رگ ذوق کبابی که بسوزد — زان رشک که سوز جگر خام ندارد
آیا بدلت ولولهٔ کسب هوا نیست — یا آنکه سرای تو لب بام ندارد
بوسی که ربایند به مستی ز لب یار — نغز است ولی لذت دشنام ندارد
هر رشحه باندازهٔ هر حوصله ریزند — میخانهٔ توفیق خم و جام ندارد

غالب که به است از غزلم مصرع استاد
”بادام صفای گل با دام ندارد“

خوبرویان جفا پیشه

دلستانان بجلند از چه جفا نیز کنند — از وفائی که نکردند حیا نیز کنند
چون به بینند بترسند و بیزدان گروند — رحم خود نیست که بر حال گدا نیز کنند
خسته تا جان ندهد وعدهٔ دیدار دهند — عشوه خواهند که در کار قضا نیز کنند
خون ناکامئ سی ساله هدر خواهد بود — مهر با ما اگر از بهر خدا نیز کنند
اندر آن روز که پرسش رود از هر چه گذشت — کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

از درختان خزان دیده نباشم کاینها | نازبرتازگی برگ و نوا نیز کنند
گر بود کوتهی از عمر تو دانی و اجل | گفتهٔ کار بهنگام روا نیز کنند
نشوی رنجه ز زندان بصبوحی کاین قوم | نفس باد سحر غالیه سا نیز کنند
گفته باشی که ز ما خواهش دیدار خطاست | این خطائیست که در روز جزا نیز کنند

حلق غالب نگر و دشنهٔ سعدی که سرود
"خوبرویان جفا پیشه وفا نیز کنند"

سرگرم تلاش

بهر خواری بسکه سرگرم تلاشم کرده اند
پاره ای نزدیک در هر دور باشم کرده اند
ترسم از رسوائیم آخر پشیمانی کشید
رازم و این شاهدان مست فاشم کرده اند
چرخ هر روزم غم فردا بخوردن می دهد
تا قیامت فارغ از فکر معاشم کرده اند
غیر گفتی روشناس چشم گوهر بار هست
رازدان نالهٔ الماس پاشم کرده اند
هرچه از بیطاقتی مزد ثباتم داده اند
هرچه از اندوه صرف انتعاشم کرده اند
از تف داغت بدل دوزخ سرشتم خوانده اند
وز دم تیغت بتن مینو قماشم کرده اند
هم بصحرای جنون مجنون خطابم داده اند
هم بکوه بی ستون خارا تراشم کرده اند
چشم نبوم از چه رو خارم بجیب افشانده اند

دل نباشم تا چرا رزق خراشم کردہ اند
از چہ غالب خواجگیہای جہان ننگ من ست
گر نہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

بہارست بہار

مژدہ ای ذوق خرابی کہ بہارست بہار
خرد آشوب تراز جلوۂ یارست بہار

چہ جنون ناز ہوائی گل و خارست بہار
کاین چنین قطرہ زن ابر بہارست بہار

نازم آئین کرم را کہ بسر گرمیٔ خویش
دشت را شمع و چراغ شب تارست بہار

شوخیٔ خوی ترا قاعدہ دانست خزان
خوبیٔ روی ترا آئینہ دارست بہار

در غمت غازۂ رخسارۂ ہوش ست جنون
در رہت شانہ گیسوی غبارست بہار

ہم حریفان ترا طرف بساط ست چمن
ہم شہیدان ترا شمع مزارست بہار

جعد مشکین ترا غالیہ سایست نسیم
رخ رنگین ترا غازہ نگارست بہار

وحشتی می دمد از گرد پرافشانیٔ رنگ
از کمین گاہ کہ رم خوردہ شکارست بہار

بجہان گرمیٔ ہنگامۂ حسن ست زعشق
شورش اندوز زغوغای ہزارست بہار

سنبل و گل همه از گلشنیان ست چه غم
بهر ما گلخنیان دود و شرارست بهار

خارها در ره سودا زدگان خواهد ریخت
ورنه در کوه و بیابان بچه کارست بهار

می توان یافتن از ریزش شبنم غالب
که زرشک نفسم در چه فشارست بهار

قلقل مینا

ای ذوق نواسنجی بازم بخروش آور
غوغای شبیخونی بر بنگهٔ هوش آور

گر خود نجهد از سر از دیده فرو بارم
دل خون کن و آن خون را در سینه بجوش آور

هان همدم فرزانه دانی رهٔ ویرانه
شمعی که نخواهد شد از باد خموش آور

شورابهٔ این وادی تلخ ست اگر رادی
از شهر بسوی من سرچشمهٔ نوش آور

دانم که زری داری هرجا گذری داری
می گر ندهد سلطان از باده فروش آور

ترمغ به کدو ریزد بر کف نه و راهی شو
ور شه به سبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحان دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آن در ره چشم افگن این از پئ گوش آور

گاهی به سبکدستی از باده زخویشم بر

گاہی ز سیہ مستی از نغمہ بہوش آور
غالب کہ بقایش باد ہمپای تو گر ناید
باری غزلی فردی زآن موینہ پوش آور

کاشانہ نشین

کاشانہ نشین عشوہ گری راچہ کند کس ؟
بی فتنہ سر رہگزری راچہ کند کس ؟
بگداخت دل از نالہ مگر این ہمہ بس نیست
بیہودہ امید اثری راچہ کند کس ؟
کیموس مپیمای وز اخلاط مفرمای
تا دشنہ نباشد جگری راچہ کند کس ؟
در ہدیہ دل و دین بصد ابرام پزیرد
منت نہ سرمایہ پری راچہ کند کس ؟
انصاف دہم چون نگرایدبمن از مہر
دلدادۂ آشفتہ سری راچہ کند کس ؟
باخویشتن از رشک مدارا نتوان کرد
در راہ محبت خضری راچہ کند کس ؟
گر سرخوشی از بادہ مراد است بیاشام
واعظ تو دیز دان خبری راچہ کند کس ؟
نایافتہ یارم نہ نہ راندن چہ شکیبم
گیرم کہ خود از تست دری راچہ کند کس ؟
آن نیست کہ صحرای سخن جادہ ندارد
۱۰ اشوار، روش، کج نگری راچہ کند کس ؟

غالب بجهان بادشهان از پئی دادند
فرمان دهٔ بیدادگری راچه کند کس؟

طوطئی هندوستان

دود سودائی تُتُق بست، آسمان نامیدمش
دیده برخواب پریشان زد، جهان نامیدمش
وهم خاکی ریخت درچشم بیابان، دیدمش
قطرهٔ بگداخت، بحر بیکران نامیدمش
باد دامن زد بر آتش، نوبهاران خواندمش
داغ گشت آن شعله از مستی، خزان نامیدمش
قطرهٔ خونی گره گردید، دل دانستمش
موج زهرآبی بطوفان زد، زبان نامیدمش
غربتم ناسازگار آمد، وطن فهمیدمش
کرد تنگی حلقهٔ دام، آشیان نامیدمش
بود در پهلو به تمکینی، که دل می گفتمش
رفت از شوخی به آئینی که جان نامیدمش
هرچه از جان کاست در مستی به سود افزودمش
هرچه با من ماند از هستی، زیان نامیدمش
تا ز من بگسست عمری، خوش دلش پنداشتم
چون بمن پیوست لختی، بدگمان نامیدمش
او بفکر کشتن من بود آه از من که من
لاابالی خواندمش، نامهربان نامیدمش
تا نهم بر روی سپاس خدمتی از خویشتن

بود صاحب خانه اما، میهمان نامیدمش
دل زبان را رازدان آشنا پنهان نخواست
گاه مهمان گفتمش، گاهی فلان نامیدمش
هم نگه جان می ستاند هم تغافل می کشد
آن دم شمشیر، و این پشت کمان نامیدمش
در سلوک از هر چه پیش آمد، گزشتن داشتم
کعبه دیدم، نقش پای رهروان نامیدمش
بر امید شیوهٔ صبر آزمائی زیستم
تو بریدی از من و، من امتحان نامیدمش
بود غالب عندلیبی از گلستان عجم
من ز غفلت، طوطیٔ هندوستان نامیدمش

ذوق بلا

چون عکس پل بسیل بذوق بلا برقص
جا را نگاه دار و هم از خود جدا برقص
نبود وفائی عهد دمی خوش غنیمت ست
از شاہدان به نازش عهد و وفا برقص
ذوقیست جستجو چه زنی دم ز قطع راه
رفتار کم کن و به صدای درا برقص
سرسبزه بوده و بچمن پاچمیده ایم
ای شعله در گداز خس و خار ما برقص
هم بر نوای چغد طریق سماع گیر
هم در هوای جنبش بال هما برقص
در عشق انبساط بپایان نمی رسد
چون گرد باد خاک شو و در هوا برقص
فرسوده رسمهای عزیزان فرو گزار
در سور نوحه خوان و به بزم عزا برقص
چون خشم صالحان وولای منافقان
در نفس خود مباش ولی بر ملا برقص
از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوی
بیهوده در کنار سموم و صبا برقص
غالب بدین نشاط که وابستهٔ کهٔ
بر خویشتن ببال و به بند بلا برقص

تکیه بر عهد زبان

تکیه بر عهد زبان تو، غلط بود غلط — کاین خود از طرز بیان تو، غلط بود غلط
آنکه گفت از من دلخسته به پیش تو رقیب — که غلط بود بجان تو، غلط بود غلط
غنچه را نیک نظر کردم، ادائی دارد — دین که مانند بدهان تو، غلط بود غلط
دل نهادن به پیام تو، خطا بود خطا — کام جستن ز لبان تو، غلط بود غلط
این مسلّم که لب هیچ مگوی داری — خاطر هیچمدان تو، غلط بود غلط
هر جفای تو بپاداش وفائیست هنوز — دعوی ما بگمان تو، غلط بود غلط
آخر ای بوقلمون جلوه کجائی کاینجا — هر چه دادند نشان تو، غلط بود غلط
شوق می تافت سررشتهٔ وهمی ورنه — هستی ما و میان تو، غلط بود غلط
آن تو باشی که نظیر تو، عدم بود عدم — سایه در سرو روان تو، غلط بود غلط

می پسندی که بدین زمزمه میرد غالب
تکیه بر عهد زبان تو، غلط بود غلط

فرط تمنا

ای کرده غرقم بی خبر، شوزین نشانها یکطرف
رختم بساحل، یکطرف شستم، بدریا یکطرف
از عشق و حسن ما و تو با همدگر در گفتگو
خسرو، به مجنون یکطرف، شیرین به لیلی یکطرف
تا دل بدنیا داده ام در کشمکش افتاده ام
اندوه فرصت یکطرف، ذوق تماشا یکطرف
ای بسته در بزم اثر بر غارت هوشم کمر
مطرب بالحان یکطرف، ساقی به صهبا یکطرف
خارافگنان در راهٔ من، ترسان ز برق آهٔ من

طفلان نادان، یکطرف پیران دانا یکطرف

واماندہ در راہ وفا، از بیخودی ہا جا بجا
نقدم بمنزل یکطرف، رختم بصحرا یکطرف

با دیدہ و دل از دو سو، ماندم بہ بند غم فرد
اندوہ پنہان یکطرف، آشوب پیدا یکطرف

ہم مہر دارد ہم حیا، بر نعشم آریدش چرا
خویشان بہ شیون یکطرف، خصمان بغوغا یکطرف

ای آئینہ پیش نظر، مستانہ بر خود جلوہ گر
رحمی بجان خویش کن، غمخواری ما یکطرف

غالب چہ تسکینم دہی، در ہجر آن سرو سہی
رشک رقیبم می کشد، فرط تمنا یکطرف

ہجوم تمنّا

مرد آن کہ در ہجوم تمنا شود ہلاک — از رشک تشنہ کہ بدریا شود ہلاک

کردم ہلاک فرہ فرجام رہروی — کاندر تلاش منزل عنقا شود ہلاک

نازم کہ کشتہ کہ چو یابد دوبارہ عمر — در عذر التفات مسیحا شود ہلاک

دارم بہ کنج غمکدہ رشک کسی کہ او — در جلوہ گاہ دوست بہ غوغا شود ہلاک

متمای رخ بما کہ بدعوی نشستہ ایم — در خلوتی کہ ذوق تماشا شود ہلاک

نامرد را بہ لخلخہ آسائش مشام — مرد از تف سموم بہ صحرا شود ہلاک

با خضر گر نمی روم از بیم ناکسیست — ترسم ز ننگ ہمرہئی ما شود ہلاک

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آن — پنہان نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک

غالب ستم نگر کہ چو دلیم فریزری
زینسان بہ چہرہ دستی اعدا شود ہلاک

ذوق نظاره

رفتم که کهنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو نمطی دیگر افگنم

در وجد اهل صومعه ذوق نظاره نیست
ناهید را بزمزمه از منظر افگنم

معشوقه را ز ناله بد انسان کنم حزین
کز لاغری ز ساعد او زیور افگنم

هنگامه را جحیم جنون بر جگر زنم
اندیشه را هوای فسون در سر افگنم

نخلم که هم بجای رطب طوطیٔ ورم
ابرم که هم بروی زمین گوهر افگنم

با غازیان ز شرح غم کارزار نفس
شمشیر را برعشه ز تن جوهر افگنم

با دیریان ز شکوهٔ بیداد اهل دین
مهدی ز خویشتن بدل کافر افگنم

ضعفم به کعبه مرتبهٔ قرب خاص داد
سجاده گستری تو و من بستر افگنم

تا باده تلخ تر شود و سینه ریش تر
بگدازم آبگینه و در ساغر افگنم

راهی ز گنج دیر به مینو کشوده ام
از خم کشم پیاله و در کوثر افگنم

منصور فرقهٔ علی اللهیان منم
آوازهٔ انا اسدالله در افگنم

ارزنده گوهری چو من اندر زمانه نیست
خود را بخاک ره گزر حیدر افگنم

غالب به طرح منقبت عاشقانه ای
رفتم که کهنگی ز تماشا برافگنم

کاش که

تا فصلی از حقیقت اشیا نوشته ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشته ایم

ایمان به غیب تفرقه ها رفت از ضمیر
ز اسما گزشته ایم و مسمی نوشته ایم

عنوان راز نامهٔ اندوه ساده بود
سطر شکست رنگ به سیما نوشته ایم

قلزم فشانی مژہ از پہلوی دلست
این ابر را برات بدریا نوشتہ ایم
خاکی بروی نامہ نیفشاندہ ایم ما
رخصت بدان حریف خود آرا نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنی لفظ امید نیست
فرہنگ نامہ ہای تمنا نوشتہ ایم
آیندہ و گزشتہ تمنا و حسرت ست
یک "کاشکہ"، بودی کہ بصد جا نوشتہ ایم
دارد رُخت بخون تماشا خطی ز حسن
روشن سواد این ورق نانوشتہ ایم
رنگ شکستہ عرض سپاس بلای تست
پنہان سپردۂ غم و پیدا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سر خاری بخون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم
غالب الف ہمان علم وحدت خودست
برلا چہ بر فزود گر اِلّا نوشتہ ایم

چشم آفرین

زمن حذر نہ کنی، گر لباس دین دارم
نہفتہ کافرم، و بت در آستین دارم
زمردین نبود خاتم گدا، دریاب
کہ خود چہ زہر بود کان تہ نگین دارم
اگر بطالع من سوخت خرمنم چہ عجب

عجب ز قسمت یک شہر خوشہ چین دارم

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ و ہنوز
ہزار دزد بہر گوشہ در کمین دارم

ز وعدہ دوزخیان را نیاز ارند
توقعی عجب از آہ آتشین دارم

ترا نگفتم اگر جان و عمر معذورم
کہ من وفای تو با خویشتن یقین دارم

بمطلعم بود آہنگ زلہ بندی مدح
ز قحط ذوق غزل خویش رابرین دارم

طلوع قافیہ در مطلع از جبین دارم
بذکر سجدۂ شہ حرف دلنشین دارم

علی عالی اعلیٰ کہ در طواف درش
خرام بر فلک و پا بر زمین دارم

از آنچہ بر لب او رفتہ در شفاعت من
فسانہ ای بلب جوی انگبین دارم

بدشمنان ز خلاف و بدوستان ز حسد
بحکم مہر تو با روزگار کین دارم

بکوثر از تو کرا ظرف بیش قسمت بیش
ببادہ خوی کنم عقل دوربین دارم

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ
خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

قاعدہ آسمان بگردانیم

بیا! کہ قاعدہ آسمان بگردانیم　　　قضا بہ گردش رطل گران بگردانیم

زچشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم　　زجان و تن بمدارا زبان بگردانیم
بگوشہ ای بنشینیم و در فراز کنیم　　بکوچہ بر سر رہ پاسبان بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار، نندیشیم　　وگر ز شاہ رسد میہمان بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزبان، سخن نکنیم　　وگر خلیل شود میہمان بگردانیم
گل افگنیم و گلابی برہگذر پاشیم　　می آوریم و قدح درمیان بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم　　بکار و بار زنی کاردان بگردانیم
گہی بہ لابہ سخن با ادا بیاویزیم　　گہی بہ بوسہ زبان در دہان بگردانیم
نہیم شرم بیک سوی و باہم آویزیم　　بشوخیٔ کہ رخ اختران بگردانیم
زجوش سینہ سحر را نفس فروبندیم　　بلای گرمی روز از جہان بگردانیم
بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　زنیمہ ماہ رمہ را شبان بگردانیم
بجنگ باج ستانان شاخساری را　　تہی سبد، ز در گلستان بگردانیم
بہ صلح بال فشانان صبح گاہی را　　ز شاخسار سوی آشیان بگردانیم
زحیدریم من و تو ز ما عجب نبود　　گر آفتاب سوی خاوران بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیا! کہ قاعدہ آسمان بگردانیم

خوش نفسان

ہا پری شیوہ غزالان وز مردم رم شان　　دل مردم بخم طرہ خم در خم شان
کافرانند جہان جوی کہ ہرگز نبود　　طرہ حور دلاویز تر از پرچم شان
آشکارا کش و بدنام و نکونامی جوی　　آہ ازین طائفہ و آنکس کہ بود محرم شان
رشک بر تشنہ تنہا روِ وادی دارم　　نہ بر آسودہ دلان حرم و زمزم شان
بگذر از خستہ دلانی کہ ندانی ہشدار　　خستگانند کہ داری و نداری غم شان
داغ خون گرمی این چارہ گرانم گوئی　　آتش ست آتش اگر پنبہ دگر مرہم شان

ای که راندی سخن از نکته سرایان عجم
چه بما منت بسیار نهی از کم شان

هند را خوش نفسانند سخنور که بود
باد در خلوت شان مشکفشان از دم شان

مومن و نیر و صهبائی و علوی وانگاه
حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شان

غالب سوخته جان گرچه نیرزد به شمار
هست در بزم همنفس و همدم شان

رگ گفتار

دل زان مژه تیز بیک بار کشیدن
دامن بدرشتی بود از خار کشیدن

دارم سر این رشته بدانسان که زدیرم
تا کعبه توان برد بزنار کشیدن

در خلد ز شادی چه رود بر سرم آیا
چون کم نشود باده زبسیار کشیدن

حق گویم و نادان بزبانم دهد آزار
یا رب چه شد آن فتوی بردار کشیدن

گنجینه حسن ست طلسمی که کس از وی
چون عقده نیارد گهر از تار کشیدن

ز آسایش دل گرچه مرادی دگرم نیست
باری نفس چند به هنجار کشیدن

از بس که دلاویز بود جادهٔ راهش
زحمت دهدم پای ز رفتار کشیدن

از مطلع تابنده نهم پارهٔ لعلی
در رشته دم گوهر شهوار کشیدن

جان دادم و داغم که پس از من ز که خواهی
خجلت ز گرانجانی اغیار کشیدن

مشتاق قبولم من و دل تاب نیارد
آری زلب نازک دلدار کشیدن

من کافر زنهاری شاهم بمن ارزد
می در مه رمضان بر سر بازار کشیدن

فرجام سخنگوئی غالب بتو گویم
خون جگرست از رگ گفتار کشیدن

راحت جاوید

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایمان زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن

شیوهٔ رندان بی پرواه خرام از من مپرس
اینقدر دانم که دشوارست آسان زیستن

بردگوی خرمی از هر دو عالم هرکه یافت
در بیابان مردن و در قصر و ایوان زیستن

راحت جاوید ترک اختلاط مردم ست
چون خضر باید زچشم خلق پنهان زیستن

تا چه راز اندر ته این پرده پنهان کرده اند
مرگ مکتوبی بود کو راست عنوان زیستن

روز وصل یار جان ده ورنه عمری بعد ازین
همچو ما از زیستن خواهی پشیمان زیستن

با رقیبان همنفسیم اما بدعوی گاه شوق
مردن ست از ما وزین مشتی گرانجان زیستن

دیده گر روشن سواد ظلمت و نورست چیست
فارغ از اهرمن و غافل زیزدان زیستن

ابتذالی دارد این مضمون توارد عیب نیست
نگزرد در خاطر نازک خیالان زیستن

غالب از هندوستان بگریز فرصت مفت تست
در نجف مردن خوش ست و در صفاهان زیستن

تازگی شوق

خیره کند مرد را مهر درم داشتن
حیف زهمچون خودی چشم کرم داشتن

وای زدل مردگی خوی بد انگیختن
آه از افسردگی روی دژم داشتن

جوهر ایمان ز دل پاک فرا روفتن
گردی ازان در خیال بهر قسم داشتن

تازگی شوق چیست؟ رنگ طرب ریختن چہرہ زخوناب چشم رشک ارم داشتن
باہمہ اشکستگی دم ز درستی زدن باہمہ دلخستگی تاب ستم داشتن
در خم دام بلا بال فشان زیستن با سر زلف دوتا عربدہ ہم داشتن
بہر فریب از ریا دام تواضع مچین دل نہ باید ہمی تیغ زخم داشتن
نقش پیٔ رفتگان جادہ بود در جہان ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن
بانگہ خویشتن چہرہ نیاراست شد عشوہ دہد گر حیاست ز آئینہ رم داشتن
اشک چنان بی اثر نالہ چنین نارسا دیدہ و دل را سزد ماتم ہم داشتن
خجلت کردار زشت گشت لعاصی بہشت باج ز کوثر گرفت جبہہ ز نم داشتن

غالب آوارہ نیست گرچہ بہ بخشش سزا
خوش بود از چون توئی چشم کرم داشتن

روش نظیری

چہ غم؟ ار بہ جد گرفتی ز من احتراز کردن
نتوان گرفت از من بگزشتہ ناز کردن
نگہت بموشگافی ز فریب رم نخوردن
نفسم بدام بانی ز سخن دراز کردن
تو و در کنار شوقم گرہ از جبین کشادن
من و بر رخ دو عالم در دل فراز کردن
مژہ را ز خونفشانی بدلست ہمزبانی
کہ شمار دم بدامن ستم گداز کردن
بہ نورد پاس رازت خجل از غبار خویشم
کہ ز پردہ ریخت بیرون غم نالہ ساز کردن
زغم تو باد شرمم کہ چہ مایہ شوخ چشمی ست

زشکست رنگ بر رخ در خلد باز کردن
نفسم گداخت شوقت ستم ست گر تو دانی
کہ ز تاب نالہ خون شد نہ زپاس راز کردن
بفشار رشک بزمت نہ چنان گداخت گلشن
کہ میانۂ گل و مل رسد امتیاز کردن
رخ گل ز غازہ کاری بہ نگاہ بند آئین
نرسد بہ خس شکایت ز چمن طراز کردن
ہمہ تن ز شوق چشمم کہ چو دل فشاندہ گردد
بہ سرشک مایہ بخشم ز جگر گداز کردن
ہلہ تازہ گشتہ غالب روش نظیری از تو
سزد این چنین غزل را بہ سفینہ ناز کردن

میخانہ غالب

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این می از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی دادہ اند
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
ہم سواد صفحہ مشک سودہ خواہد بیختن
ہم دواتم ناف آہوی ختن خواہد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمی کہ خواہد زد نوا
چاکہا ایثار جیب پیرھن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

ہی! چہ میگویم اگر اینست وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن
آنکہ صور نالہ از شور نفس موزون دمید
کاش دیدی کاین نشید شوق فن خواہد شدن
کاش سنجیدی کہ بہر قتل معنی یک قلم
جلوۂ کلک ورقم دار و رسن خواہد شدن
چشم کور آئینہ دعوی یکف خواہد گرفت
دست شل مشاطۂ زلف سخن خواہد شدن
شاہد مضمون کہ اینک شہری جان و دل ست
روستا آوارۂ کام و دھن خواہد شدن
زاغ زاغ اندر ہوای نغمہ بال و پر زنان
ہمنوای پردہ سنجان چمن خواہد شدن
شاد باش ای دل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست
شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید
ہم بساط بزم ہستی پر شکن خواہد شدن
از تب و تاب فنا یکبارہ چون مستی سپند
ہر یکی گرم و داع خویشتن خواہد شدن
حسن را از جلوۂ نازش نفس خواہد گداخت
نغمہ را از پردۂ ساز کفن خواہد شدن
دھر بی پروا عیار شیوہا خواہد گرفت
داوری خون در نہاد ما و من خواہد شدن
پردہ ہا از روی کار ہمد گر خواہد فتاد

خلوت گبر و مسلمان انجمن خواهد شدن
هم بفرش خاک حرمان ابد خواهند ریخت
مرگ عام این بیستون را کوهکن خواهد شدن
گرد پندار وجود از رهگزر خواهد نشست
بحر توحید عیانی موجزن خواهد شدن
در تهٔ هر حرف غالب چیده ام میخانه ای
تا ز دیوانم که سرمست سخن خواهد شدن

جلوه و نظاره

چون زبانها لال وجانها پُر ز غوغا کرده ای
بایدت از خویش پرُسید آنچه باما کرده ای
گرنه ای مشتاق عرض دستگاهٔ حسن خویش
جان فدایت دیده را بهر چه بینا کرده ای
هفت دوزخ در نهاد شرمساری مضمرست
انتقام ست این که با مجرم مدارا کرده ای
صد کشاد آن را که هم امروز رخ بنموده ای
مژده باد آن را که محو ذوق فردا کرده ای
خوبرویان چون مذاق خوی ترکان داشتند
آفرینش را بر ایشان خوان یغما کرده ای
خستگان را دل به پرستشهای پنهان برده ای
یا درستان گر نوازش های پیدا کرده ای
چشمهٔ نوش ست از زهر عتابت کام جان
تلخئ می در مذاق ما گوارا کرده ای

ذره ای را روشناس صد بیابان گفته ای
قطره ای را آشنای هفت دریا کرده ای
دجله می جوشد همانا دیده ها جویای تست
شعله می بالد مگر در سینه ها جا کرده ای
جلوه و نظاره پنداری که از یک گوهر ست
خویش را در پردهٔ خلقی تماشا کرده ای
چاره در سنگ و گیاه و رنج با جاندار بود
پیش از آن کاین در رسد آن را مهیا کرده ای
دیده می گرید زبان می نالد و دل می تپد
عقده ها از کار غالب سربسر وا کرده ای

ذوق خداداد

خشنود شوی چون دل خشنود نیابی
ترسم که زبان کار کسی سود نیابی
از قافلهٔ گرم روان تو نباشد
رختی که به سیلش شرر اندود نیابی
فرقیست نه اندک ز دلم تا بدل تو
معذوری اگر حرف مرا زود نیابی
بر ذوق خداداد نظر دوختگانیم
در سینهٔ ما زخم نمک سود نیابی
در وجد به هنجار نفس دست فشانیم
در حلقهٔ ما رقص دف و عود نیابی
در مشرب ما خواهش فردوس نجوئی

در مجمع ما طالع مسعود نیابی

در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی
در آتش ہنگامہ ما دود نیابی

چوں آخر حسن ست بما ساز کہ دیگر
باہم کششی مانع مقصود نیابی

آن شرم کہ در پردہ گری بود نداری
آن شوق کہ در پردہ دری بود نیابی

غالب بہ دکانی کہ بامید کشودیم
سرمایۂ ما جز ہوس سود نیابی

دیدہ ور آن کہ

دیدہ ور آن کہ تا نہد دل بشمار دلبری
در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری

فیض نتیجۂ ورع از می و نغمہ یافتیم
زہرۂ ما برین افق دادہ فروغ مشتری

تا نبود بلطف و قہر ہیچ بہانہ درمیان
شکر گرفت نارسا شکوہ شمرد سرسری

ای تو کہ ہیچ ذرہ را جز بروئی تو روی نیست
در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری

در کہ دلست در برش داغ تو رو دیدش ز دل
تا چو بدیگری دہد باز بری بداوری

بسکہ بہ فن عاشقی غیرت غیر جان گزاشت
با تو خوشم کہ جز تو نیست روی بہر کہ آوری

رشک ملک چه وچراچون بتورهٔ نمی برد
بیهده در هوای تومی بود از سبکسری
حیف که من بخون تپم وزتو سخن رود که تو
اشک بدیده بشمری ناله به سینه بنگری
کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبی نمی
طوبیٰ اگر زمن شود هیمه کشم زبی بری
درد ترا بوقت جنگ قاعدهٔ تهمتنی
فکر مرا بزیر زنگ آئینه سکندری
بینیم از گداز دل در جگر آتشی چو سیل
غالب اگر دم سخن ره به ضمیر من بری

فصل ششم

مثنویات

سخن را خود آن گونہ دانم سرود
کزین نیز خوشتر توانم سرود

جیسا کہ کلیات سے ظاہر ہوتا ہے، غالب، بنیادی اور لازمی طور پر قصیدہ اور تغزل کا دلدادہ تھا، طویل نظموں کے لئے نہ ذوق وشوق تھا، اور نہ ہی حوصلہ اور استقلال ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طویل و مسلسل نظمیں کہنے کی صلاحیت اُس میں موجود تھی،

غالب نے کُل گیارہ مثنویاں لکھی ہیں، جن کی مجموعی تعداد اشعار تقریباً ۲۱۰۰ ہے، یہ نظمیں مختصر مگر مکمل ہیں، اور ان میں مکمل تکنیک کے ساتھ ساتھ اعلیٰ شاعری کا حُسن موجود ہے،

اِس صنفِ شاعری میں غالب، عرفی، حزین اور بیدل کے ہم مرتبہ ہی، ان باکمالوں نے بھی مختصر، مگر بڑی عمدہ مثنویاں لکھی ہیں،

کلیات میں پہلی، دوسری اور چوتھی مثنویاں ماورائی ہیں، تیسری مثنوی میں بنارس کی رنگین اور دلکش فوٹوگرافی ہے، پانچویں "معذرت نامہ" یا "آشتی نامہ" ہے، چھٹی مثنوی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے موضوع پر ہے، ایک مثنوی "آیئن اکبری" کی تقریظ ہے، اور آخری اور بہترین مثنوی "ابرِ گہر بار"

سب سے طویل اور بہت سے موضوعات پر مشتمل ہے، جو ماورائی نوعیت کے بھی ہیں، اور مادّی بھی، ہم صرف ممتاز مثنویوں پر بحث کریں گے،

چراغ دیر (تیسری مثنوی)

یہ مثنوی تغزّل سے بھرپور بیانیہ نظم ہے، اور شاعر کے بنارس کے مختصر قیام کے دوران لکھی گئی، اس وقت غالب ریعانِ شباب کی منزل میں تھا، پوری نظم حسن و شباب کی رنگینیوں سے بھرپور ہے، اور گنگا کے کنارے نہانے والی حسیناؤں کی واضح اور جذبات انگیز قلمی تصویروں کا نگار خانہ ہے،

جیسا کہ باب اول میں لکھا جا چکا ہے، غالب کلکتہ جاتے ہوئے کچھ عرصہ کے لئے بنارس ٹھہرا تھا، قیام کا اصلی سبب، یہاں کے پرمسرّت ماحول کے بجائے، علی حزین کا مدفن تھا، غالب نے جلد ہی محسوس کر لیا، کہ بنارس رنگا رنگ اور نکہت آمیز پھولوں کے کثرت اور دیگر رنگینیوں کی وجہ سے باغ و بہار کا مرقع ہے، مزید برآں دعوت نظارہ دیتی ہوئی گلیوں اور سحر آفرین دوشیزاؤں کی دیدنے، غالب کے شاعرانہ جذبات کو بیدار کیا، اور اس نے وہ نظم کہی، جو فارسی ادب کا اعلیٰ نمونہ اور قوّت متخیلہ کا زندہ جاوید شاہکار ہے،

یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مثنوی خسرو شیرین اور مُلّا عبدالرحمٰن جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کی بحرِ ہزج مسدّس مکسور محذوف میں ہے، اور قیامت خیز خلوت کا نتیجہ ہے، مندرجہ ذیل اشعار کا تیکھا پن اور جامعیت ملاحظہ ہو،

نفس با صور دم ساز است امروز
خموشی محشر راز است امروز

رگ سنگم شراری می نویسم
کف خاکم غباری می نویسم

دل از شورِ شکایت ہا بجوش است
حباب بینوا طوفاں خروش است

بلب دارم ضمیر آلا بیانی
نفس خون کن جگر بالا فغانی

دیارِ جنگ و بو میں تنہا بیٹھا ہوا شاعر اپنے رفیقانِ صحبت کو یاد کرتا ہے، اور قسمت کے ہاتھوں دہلی سے نکل کر بادیہ پیمائی کرنے پر افسردہ دکھائی دیتا ہے، وہ شکوہ کرتا ہے:

پریشاں تر ز زلفم داستانیست	بدعویٰ ہر سر مویم فغانیست
در آتش از نوای ساز خویشم	کباب شعلۂ آواز خویشم
کس از اہل وطن غمخوار من نیست	مرا در دھر پنداری وطن نیست

ابتدا میں شاعر پر یاس غالب نظر آتی ہے، لیکن پھر وہ اِس تصور میں سکون پاتا ہے، کہ اپنے شہر کے رفقا نے اُسے بھلا دیا تو کیا غم ہے، وہ اگر چاہے، تو بنارس میں مستقل قیام کر سکتا ہے، کیونکہ اس شہر کی سحر انگیزی اور سیر بینی ماورای بیان ہے،

یہ نظم آرٹ کا خوبصورت نمونہ ہے، اس میں ایک ناکام آرزو شاعر کی روح بول رہی ہے، جو ماورای حصول پر کمند ڈالتا رہا، بنارس اور اس کی دوشیزاؤں کی جذبات انگیز تصویر کشی، دلاویز محاکات اور زورِ بیان، قابل غور ہے:

تعالیٰ اللہ! بنارس چشم بد دور	بہشت خرم و فردوس معمور
بنارس را کسی گفتہ کہ چین است	ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
تناسخ مشربان چون لب کشایند	بکیش خویش کاشی را ستایند

که هرکس کاندران گلشن بمیرد — دگر پیوند جسمانی نگیرد
عبادت خانهٔ ناقوسیانست — همانا کعبهٔ ہندوستان است
مگر گوئی بنارس شاہدی ہست — زگنگش صبح و شام آئینہ در دست
بیابان در بیابان لاله زارش — گلستان در گلستان نوبهارش
بلند افتاده تمکین بنارس — بود بر اوج او اندیشه نارس

شاعر نے شہر کے مناظر اور آب و ہوا کا ذکر کیا ہے، پھر صنفِ نازک کے سحر آگیں حُسن کی مزے لے لے تصویر کشی کی ہے، جس میں جزوی تفصیل موجود ہے، تمام مستقیم و مُنحنی خطوط، تمام نشیب و فراز، تمام خد و خال حقیقت یہ ہے کہ غالب نے دوشیزگانِ بنارس کے غسل کی محاکات میں کامیابی کے ساتھ نظامی کی ہمسری کی ہے،

یہاں غالب اپنے اصلی روپ میں نظر آتا ہے، اُس کے شعرانہ تخیّل کی جادوئی قالین پر اڑتے ہوئے، ہم ایک ایسی پرستان میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں تموزِ عشق و محبت کے ساتھ، گرمیٔ نظارہ بھی دستور میں شامل ہے، اور جہاں غم و حرماں کا شائبہ تک نہیں، مندرجہ ذیل اشعار میں غالب کی رفعتِ تخیل عروج پر نظر آتی ہے، ہیجان خیز تخیل نے صحیح عکاسی کو حقیقت سے ہمکنار کر دیا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

همه جانهای بی تن کن تماشا — ندارد آب و خاک این جلوه حاشا
نهادشان چون بوی گل گران نیست — همه جانند جسمی در میان نیست
بتانش را هیولیٰ شعلهٔ طور — سراپا نوریزدان چشم بد دور
میانها نازک و دلها توانا — زنادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکه در لبها طبیعیست — دهنها رشک گلزار ربیعیست
ادائی یک گلستان جلوه سرشار — خرامی، صد قیامت فتنه دربار
بلطف، از موج کوثر نرم روتر — بناز، از خون عاشق گرم روتر

زانگیز قد انداز خرامی
بپای گلبنی گسترده دامی
زرنگین جلوۂ غارت گر ہوش
"بہار بستر"، و "نوروز آغوش"
بسامان دو عالم گلستان رنگ
زتاب رخ چراغان لب گنگ
رسانده از ادای شست وشوئی
بہر موجی نوید آبروئی
قیامت قامتان، مژگان درازان
زمژگان برصف دل نیزہ بازان
بمستی موج را فرمودہ آرام
زنغزی آب را بخشیدہ اندام
زتاب جلوہ ہا بیتاب گشتہ
گہرہا در صدف ہا آب گشتہ
بہارستان حسن لا ابالیست
یکشور ہا سمر در بیمثالیست

بادِ مخالف یا آشتی نامہ (پانچویں مثنوی)

یہ مختصر مثنوی ۱۵۴ اشعار پر مشتمل "معذرت نامہ" ہے، جس کو غالب نے کلکتہ میں ۱۸۲۹ء کے لگ بھگ لکھا، جب کہ وہ ایک خود ساختہ ادبی معرکہ میں گھرا ہوا تھا، اور جس کی بنا پر قتیل کو مستند ماننے والے شعرا اُس کے دُشمنِ جان ہو گئے تھے، غالب کے خلاف طوفانِ بے تمیزی کا تجزیہ بابِ اول میں کیا گیا ہے،

ہمارا شاعر ان مخالفین کا بیجا روّیہ برداشت نہ کرسکا، مگر انکی ہیچمدانی کی نقاب کشائی کرنے کے بجائے، اُس نے قتیل اور اُس کے ہمنواؤں کے پرخچے اڑانا شروع کر دیئے، قدرتی طور پر وہ لوگ آپے سے باہر ہو گئے، نوبت باین جارسید کہ طوفانِ بے تمیزی بپا ہو گیا،

اب دو پارٹیاں ہو گئیں، اور صورت حال خطرناک نظر آنے لگی، غالب ضدی اور بے لچک فطرت کی بنا پر معترضین کا جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اُس کے ہمنواؤں نے اِس بازیٔ طفلانہ کو ختم کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ اس نے بادلِ ناخواستہ یہ مثنوی لکھی، جو معذرت نامہ بھی ہے اور

ہجوِ ملیح بھی، اس میں معترضین کے جذبۂ خود نمائی کی تسکین بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ طوفان کچھ عرصہ کے لئے دب گیا۔ لیکن آگے چل کر "برہان قاطع"، کا قضیّہ بن کر پھر ابھرا،

مثنوی کی تقسیم موضوع یوں ہے :۔

(۱) معترضین سے خطاب
(۲) شاعر کی بیچارگی
(۳) اعتراضات کے جوابات
(۴) اِعتراف جرم
(۵) قتیل کی ہجوِ ملیح
(۶) اپنے پسندیدہ شعراء کی تعریف
(۷) قتیلؔ کی سند سے دبے الفاظ میں انکار
(۸) معذرت

ہم نے اس مثنوی پر سیر حاصل تبصرہ بابِ اوّل میں کیا ہے،

ابر گہر بار (گیارہویں مثنوی)

یہ مثنوی سب سے بہتر اور طویل ہے، اس میں گیارہ سو چھہتر [۱۱۷۶] اشعار ہیں، اور اور شاہنامۂ فردوسی اور سکندر نامۂ نظامی کی رزمیہ بحرِ متقارب مثمن محذوف مکسور میں لکھی گئی ہے،

بقول حالی غالب کی یہ دلی خواہش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات، غزوات اور معجزات پر مشتمل ایک طویل مثنوی لکھی جائے، لیکن کہولت اور آلام و مصائب کی بنا پر یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہی، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اِس مثنوی کا آغاز ۱۸۴۷ء میں کیا گیا، اور ۱۸۶۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، جب کہ غالب کی عمر سترّ سال کی تھی،

اِس مثنوی کو سات منزلوں پر منقسم کیا گیا ہے :۔

(۱) حمد ——— ۱۱۴ ——— اشعار

(۲) مناجات ——— ۲۲۵ ——— اشعار
(۳) نعت ——— ۶۷ ——— 〃
(۴) بیانِ معراج ——— ۳۴۷ ——— 〃
(۵) منقبت ——— ۱۲۸ ——— 〃
(۶) مغنی نامہ ——— ۱۴۰ ——— 〃
(۷) ساقی نامہ ——— ۱۵۵ ——— 〃

حمد

ایک سو چودہ اشعار آبدار میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کا بیان ہے، جس میں قدرت کی بوقلمیوں کی مصوری کی گئی ہے، اِس حصے میں اندازِ بیان، انتخابِ الفاظ اور ترتیب مہتمم بالشان ہے، توحید پر اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جہان داور دانش آموزگار — بخود روشنائی دہ روزگار
کشایندۂ گوہر آگین پرند — زپروین پہنای آن نقشبند
رگ ابر را اشکباری ازوست — دم برق را بیقراری ازوست
دوئی بی کفن مردۂ درہش — خودی دادگر شحنۂ درگہش
زہی مستیٔ محض وعین وجود — کہ نازد بیکتائیش ہست و بود
مناجاتیان پیش وی در نماز — خراباتیان را بدو چشم باز
جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی — فضای نظر گاہ وجہ اللہی

چون این جملہ را گفتہ، عالم اوست [1]
بگفت آنچہ ہرگز نیاید ہم اوست

آخری شعر کے معنی یہ ہیں، کہ خدا قادرِ مطلق ہے، اور "ہمہ" سے زیادہ، بلکہ

---

[1] مولانائے جلال الدین رومی فرماتے ہیں:۔

ہرچہ اندیشی، پذیرای فناست — آنچہ اندر وہم ناید، آن خداست

اس سے بھی زیادہ پر قادِر ہے،

مناجات

یہ دُعائیہ ۲۲۵-اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں کرب و درد کی ایسی رو ہے، جس سے جسم کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان اشعار کا مقابلہ آسانی سے "سکندر نامہ" اور "یوسف زلیخا" کے ہم موضوع اشعار سے کیا جا سکتا ہے، شاعر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے، اور عاجزانہ اور پُر وقار انداز میں رحمتِ الہٰی کا طالب ہوتا ہے، یہاں قوت گویائی ناکام ہوتی نظر آتی ہے، مگر قوتِ استدلال مدد کو پہنچتی ہے، اور سرگوشی کرتی ہے:

چو پیدا تو باشی نہان ہم توئی　　اگر پردہ باشد آن ہم توئی
بہر پردہ دمساز کس جز تو نیست　　شناسندۂ راز کس جز تو نیست

اب شاعر گُستاخی پر اُتر آتا ہے، اور کہتا ہے:-

چہ باشد چنین پردہ ہا ساختن؟　　شگافی بہر پردہ انداختن؟
بدین روی روشن نقاب از چہ رو؟　　چو کس جز تو نبود حجاب از چہ رو؟

لیکن جواب خود اس کے ذہن پر طلوع ہوتا ہے:

بنہ چرخ والائی و برتری　　بکار آخشیج آدمی پیکری
بہ یزدانیان فرۂ ایزدی　　بیونیایان بہرۂ بخوردی
بکشور کشایان دم گیرودار　　بمسکین گدایان غم پود و تار
بناہیدیان بادۂ بیغمی　　بکیوانیان گونہ ماتمی
بہ ابر از پی خاک آب حیات　　بخاک از نم ابر جوش نبات
بمی در فروغی کہ چون بر دھد　　زسیمای میخوارہ عنبر دھد

خدا کی آفاقیت کا تذکرہ کرنے کے بعد، شاعر مخلوقات و موجودات میں حُسنِ ازل کی تقسیم کا ذکر کرتا ہے، ہر شعر میں حُسنِ پاک کی ایک جھلک نظر آتی ہے:

ہمانا از آنجا کہ توقیع ذات　　بود فرد فہرست حسن صفات

تقاضای فرمانروائی دروست | ظہور شئون خدائی دروست
زفرماندھی خاست فرمانبری | شناساوری شد شناساگری
بہ نی در نوائی کہ چون برکشد | بہ آواز آن نالہ ساغر کشد
بساقی خرامی کہ از دلبری | زشاہد بردل بساقی گری
بشاہد ادائی کہ از سرخوشی | بساقی دہد داروی بیہشی
بہ آزادہ دستی کہ ساغر زند | بہ افتادہ سنگی کہ برسر زند

انسان اشرف المخلوقات، اور خاک کا مظہر اتم ہے، فرشتوں سے بالاتر، وجوہات ملاحظہ ہوں، اوّل تو فرشتے جو نُور سے مرکّب ہیں، گناہ نہیں کر سکتے، دوم یہ کہ دوسری طرف شیطان ہے، جس سے نیکی سرزد نہیں ہو سکتی، یہ تو صرف خاک کا پُتلا ابن آدم ہے، جو اعلیٰ اور اسفل پر قادر ہے، اعلیٰ علیین اور اسفل السافلین اُس کی زد میں ہیں، کیونکہ وہ مشاغلِ زندگی اور گناہانِ بیشمار کے باوجود اپنے خالق کو نہیں بھولتا، اور اگر بغرضِ محال کچھ وقفے کے لئے بھول بھی جاتا ہے، تو پھر بھی ایسا لمحہ ضرور آتا ہے، جب وہ پشیمان ہوتا ہے، اور اشک ندامت بہا کر حضور الٰہی میں سربسجود ہو جاتا ہے، غالب نے اِس خیال کو اختصار اور فنکارانہ وقار کے ساتھ ان اشعار میں نظم کیا ہے :-

گناہ آنقدر ہا برون از شمار | کہ رنجد یمین سر وش یسار
اگر کاسۂ قیس مسکین شکست | صدای زلیلیٰ در آن کاسہ ہست

اِس مقام پر غالب نے تمثیل نگاری سے کام لیا ہے، ایک بادشاہ نے ایک سرکش سردار پر حملہ کیا، اور اُس کو مغلوب کر کے فاتحانہ انداز میں اپنے وطن لوٹا، کسی نے بادشاہ کی آمد کی اطلاع کی، اس کی آمد کے روز شہر کو دلہن کے مانند سجایا گیا، یہاں غالب فردوسی کے اُن اشعار کا مقابلہ کرتا ہے جو اُس نے کیخسرو کے دربار میں الماس سے مرصّع درخت کے بارے میں نظم کئے ہیں، ملاحظہ ہو:-

بروزیکہ بایستی از شاہراہ | بایوان خرامد خدا وند گاہ

ہم از شام مشعل بر افروختند ۔۔۔ امینان بکوشش نفس سوختند
بمہتاب شستند سیمای خاک ۔۔۔ فشاندند پروین بدیبای خاک
ببازار ہا سو بسو صف بہ صف ۔۔۔ بہ پیرایہ بندی کشودند کف
زہر پردہ نقشی بر انگیختند ۔۔۔ بہر گوشہ چینی در آویختند
بدان گونہ آئینہ ہا ساختند ۔۔۔ کہ بینندگان چشم و دل باختند
سحرگاہ چون داد بار آفتاب ۔۔۔ زہر گوشہ سر زد ہزار آفتاب
زمین را زگرمی بجوشید مغز ۔۔۔ برون کرد از کان گہرہای نغز
بہ آرایش جادۂ راہگزار ۔۔۔ صدف ریختت از بحر در بر کنار
تو گوئی زتاب گہرہای بروز ۔۔۔ کہ نگسستہ پیرایۂ شب ہنوز

تماشائیوں میں کچھ پیرہن دریدہ قیدی بھی تھے، جو اس نظارے دیکھ کر زار زار رونے لگے، شاعر کہتا ہے:۔

جگر گون نگاہان خونین نوا ۔۔۔ گرفتند چون داغ بر سینہ ہا
زاشک فرو خوردہ مشتی گہر ۔۔۔ فلک را فشاندند بر رہگزر
زخون گشتہ پنہان ہوسہای خویش ۔۔۔ کشیدند خوانہای یاقوت خویش

بادشاہ اِس منظر سے متأثر ہوتا ہے، اور قیدیوں کی رہائی کا حکم جاری کرتا ہے:۔

خموشی بدلجوئی آواز شد ۔۔۔ ترحّم بگفتار دمساز شد
لب از جوشِ دل چشمۂ نوش ریخت ۔۔۔ نویدِ رہائی بسر جوشِ ریخت

ایک گستاخ درباری نے اس برتاؤ پر ناراضگی کا اظہار کیا، بادشاہ کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

کاینان جگر خستگان منند ۔۔۔ بہ آہن فرو بستگان منند
بجز موی و ناخن کہ بینی دراز ۔۔۔ زبان کوتہ از دعویٔ برگ و ساز
لباس از گلیم، زرہ از آہن است ۔۔۔ گر آہن ز من ور گلیم از من است

نیا وردہ اند آنچہ آوردہ اند زمین بردہ اند آنچہ آوردہ اند
بہ آئین در آئینۂ انجمن مرا کردہ اند آشکارا بمن
ازآن رو کہ درتب وتاب مننذ ہمان ذرۂ آفتاب مننذ

غالب کی آہ و بُکا

غالبؔ نے اِس تمثیل کو اپنی ذات پر اور خدا پر منطبق کیا ہے، بادشاہ خدا ہے، جو قیامت کے دن اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے، اور گنہگار قیدی ہیں، جن میں خود شاعر بھی ہے، جب اس کی باری آتی ہے، تو وُہ تخت کی جانب بڑھتا ہے، اور جب حساب کے لئے حکم ہوتا ہے، تو وُہ بے اختیار گریہ وزاری شروع کردیتا ہے اور ایسا منظر پیدا کرتا ہے کہ فرشتے بھی دنگ رہ جاتے ہیں، وُہ کہتا ہے:۔

بہ بخشای بر ناکسیہای من تہی دست و درماندہ ام وای من
بدوش ترازو منہ بار من نسنجیدہ بگزار کردار من
بگردار سنجی میفزائ رنج گران بارئ دردعمرم بسنج

چہ پرسی چو آن رنج و درد از تو بود غمی تازہ و رہ نورد از تو بود
مبادا بگیتی چو من ہیچکس جحیمی دل و زہر یری نفس
بہ پرسش مرا در ہم افشردہ گیر پرکاہ را صرصری مردہ گیر
پس آنکہ بدوزخ فرستادہ دان در آتش خس از باد افتادہ دان

اگر نالم از غم زغوغای من نہ پیچد بفردوس آوای من
مرا نیز یارای گفتار دہ چو گویم بر آن گفتہ زنہار دہ

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم
مگرمی کہ آتش بگورم از وست بہنگامہ پرواز مورم از وست

من اندوهگین و می اندهربای   چه میکردم ای بنده پرورخدای؟
حساب من و رامش و رنگ و بوی   زجمشید و بهرام و پرویز جوی
نه از من که از تاب می گاه گاه   بدریوزه رخ کرده باشم سیاه

نه بستانسرای نه میخانه ای   نه دستانسرای نه جانانه ای
نه رقص پری پیکران بر بساط   نه غوغای رامشگران در رباط

چگویم چو هنگام گفتن گزشت   زعمر گرانمایه بر من گزشت
بسا روزگاران به دلدادگی   بسا نوبهاران به بی بادگی
افقها پر از ابر بهمن مهی   سفالینه جام من از می تهی
جهان از گل و لاله پر بوی و رنگ   من و حجره و دامنی زیر سنگ
اگر تافتم رشته، گوهر شکست   دگر یافتم باده، ساغر شکست
چه خواهی ز دلق می آلود من؟   ببین جسم خمیازه فرسود من!

بگیتی درم بینوا ساختی   دلم را اسیر هوا ساختی
نه بخشنده شاهی که بارم دهد   بهر بار زر پیل بارم دهد
نه نازک نگاری که نازش کشم   بهر بوسه زلف درازش کشم
بدان عمر ناخوش که من داشتم   زجان خار در پیرهن داشتم

چو آن نامرادی بیاد آیدم   بفردوس هم دل نیاسایدم
دلی را که کمتر شکیبد بباغ   در آتش چه سوزی بسوزنده داغ؟

چو پرسش رگی را بکاود ز دل   دو صد دجله خونم تراود ز دل

بہر جرم کز روی دفتر رسد | زمن حسرتی در برابر رسد
بفرمای کاین داوری چون بود؟ | کہ از جرم من حسرت افزون بود؟

بہ بند امید استواری فرست
بہ غالب خط رستگاری فرست

کیا اِن اشعار کے حسن، زور اور ندرت کا ساری فارسی شاعری میں جواب مل سکتا ہے؟

بیانِ معراج

۳۴۷ اشعار کا یہ کینٹو (حصّہ)، اِس مثنوی میں سب سے زیادہ طویل ہے، اس کا آغاز ایک دُعا سے ہوتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے، کہ موقع کے اعتبار سے شاعر کی قوت متخیلہ کو شیریں بیانی عطا ہو، تاکہ وہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کر سکے :-

بنام ایزدای کلک قدسی صریر
بہر جنبش از غیب نیرو پذیر
دلاویز تو جنبشی ساز کن
بجنبش رقم سنجی آغاز کن
درودی بعنوان دفتر نویس
بدیباچہ نعت پیمبر نویس

مدح کے اشعار میں ہمارا شاعر ہماری توقعات پر پُورا نہیں اُترتا، جامی کے "سراپا" کے مقابلے میں یہ سعی لاحاصل معلوم ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں "یوسف زلیخا" میں جامی کے اِس نوع کے اشعار چڑھتے ہوئے سمندر کی کیفیت رکھتے ہیں، اور غالب کے اشعار ایک ہلکی موج سے زیادہ نہیں۔

نعت کے بعد معراج کا بیان شروع ہوتا ہے، جو سراسر مرصّع ہے، اور جو نظامی یا خسرو یا جامی کے ایسے ہی بیانیہ کے ہمسر ہے، رات کا منظر، بُراق

اور جبریل کی تصویریں، آسمانی سفر کا مکمل اور جزئیاتی بیان، استدلال اور تعمیمی نظریات، فارسی ادب کا بیش بہا اور قابل فخر ورثہ ہے ایسے ہی ٹکڑے غالب کی صحیح نقاب کشائی کرتے ہیں، نغموں سے بھرپور شاعرانہ تخیل، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت، اور پُر شکوہ اندازِ بیان دنیائے ادب میں شاعر کی قد آور شخصیت میں چار چاند لگاتی ہے، ایسے اشعار کی بنا پر غالب، صف اوّل کے شعراء کی کہکشاں کے اُفق پر سب سے زیادہ درخشندہ ستارہ بن کر اُبھرتا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب اُسے اپنا اصلی مقام حاصل ہو جائے، اور وہ فارسی ادب کے آسمان پر آفتاب جہانتاب بن کر چمکے، اِس ضمن میں ہمّت، کوشش اور اہلِ علم و دانش کی قدردانی شرط ہے، حکومت کی سرپرستی میں یہ کام فوراً سر انجام ہو سکتا ہے، کاش غالب کا یہ خواب کہ

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

جلد شرمندۂ تکمیل ہو جائے، آمین، میرے ذہن میں اس سے متعلق پروگرام کا خاکہ موجود ہے، اگر عمر نے وفا کی تو انشاء اللہ ایک بار غالب کی فارسی تصنیفات کو نئی ترتیب سے دنیائے ادب سے متعارف کرانے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔

شبِ معراج سے متعلق اشعار مُلاحظہ ہوں :۔

همانا در اندیشۂ روزگار　　شبی بود سر جوش لیل و نہار
شبی دیدہ روشن کن دلفروز　　زاجزای خود سرمۂ چشم روز
شبی فرد فہرست آثار عید　　بیاضش زجوش رقم ناپدید
زایام فیض سحر یافتہ　　بشبگیر خورشید دریافتہ
نگویم شبی ماہ وش دلبری　　خور از زیور پیکرش گوہری
زبس ریزش نور بالای نور　　بگیتی روان بود دریای نور

براق سے متعلق لکھا ہے :۔

چو خاطر بگفتار خویشش کشید | ہما سایہ رخشی بہ پیشش کشید
بروحانیان پرورش یافتہ | ز ریحان مینو خورش یافتہ
ہیونی کہ تا دم ز مستی زند | ز بالا قدم سوی پستی زند
شتابش برفتار ز آن حد گزشت | کہ تا گوئی "آید" ز "آمد" گزشت
ہم از باد صبحی سبک خیز تو | ہم از نکہت گل دلاویز تو

آسمانوں کی سیر کے بیان کے بعد، شاعر حجلۂ عشاق کا پردہ اٹھاتا ہے، خدائے ذوالجلال اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ——— وہ دیکھتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، بشری خصوصیات سے منزہ، مجسمہ نور بنے ہوئے، وجودِ مطلق کے حضور استادہ ہیں اور ہدایات ربانی حاصل کر رہے ہیں، اس ملاقات اور انقلاب جسمانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے :۔

در آورد بی کلفت سمت و سوی | بنور السماوات والارض سوی
تماشا ہلاک جمال بسیط | فروغ نظر موجۂ ز آن محیط
شنیدن شہید کلامی شگرف | منزہ ز آمیزش صوت و حرف
در آن خلوت آباد راز و نیاز | بروی دوئی بود چون در فراز
نماند اندر احمد ز میمش اثر | کہ آن حلقۂ بود بیرون در
احد جلوہ گر با شئون و صفات | نبی محو حق چون صف عین ذات
ز خورشید ناگشتہ پرتو جدا | محیط ضیا خود محیط ضیا
احد کسوت احمدی یافتہ | دم دولت سرمدی یافتہ
بہر گونہ بخشش سرافراز گشت | ہم از حضرت حق بحق باز گشت

مغنی نامہ

منقبت کا تجزیہ باب اوّل میں کیا گیا ہے، "مغنی نامہ" میں مطرب سے خطاب ہوتا ہے۔ اور خواجہ حافظ کی گرم نوائی، جوش، شگفتگی اور شیرینی کی یاد

دِلاتا ہے، پہلا شعر ہے:۔

مغنی دگر نغمہ بر تار زن
گُل از نغمۂ تر بدستار زن

اِس کے بعد شعر و خرد کا مُوازنہ کیا گیا ہے، جو دونوں کے محاسن پر مبنی ہے، مگر بات یہ ہے کہ اس باب میں غالب نظامی کا مقابلہ نہیں کر سکا، اشعار ملاحظہ ہوں،

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است | خرد را دلی تابشی دیگر است
خرد چشمۂ زندگانی بود | خرد را بہ پیری جوانی بود
زہی کیمیای معانی سخن | بخود زندہ جاودانی سخن
سخن را ازآن دوست دارم کہ دوست | بہ تصدیق از ما طلبگار اوست
سخن گرچہ خود گوہرین افسرست | سخن در سخن لعل با گوہر ست
سخن بادہ، اندیشہ مینای او | زبان بی سخن لای وپالای اُو

شاعر مغنی سے بربط کے تار چھیڑنے کی فرمائش کرتا ہے، اور ایسے نغموں کا مشتاق ہے جن کی خلاگیر تانوں میں، بے مہریٔ زمانہ، غمِ حیات اور ہجوم افکار غرق ہو جائیں، کیونکہ موسیقی عشق و حسن کی طرح ایسی صہبائے تند ہے جو ذہن کو وہ سکون عطا کرتی ہے جس کا نام مسرت آگیں بے حسی ہے، بقول شیکسپیر موسیقی غذائے روحانی ہے، یہ ہمیں زندگی کی گھٹتی ہوئی فضا سے اٹھا کر فضائے نیلگوں میں اچھال دیتی ہے یہ ایک مشروب فرح بخش ہے، آب حیات ہے، اور اکسیر ہے، تمام روحانی امراض کے لئے مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر مغنی سے نغماتِ نو بنو کا طلب گار ہوتا ہے۔

بنغم خوش دلم غمگسارم غم ست | بہ پیدائشی پردہ دارم غم ست
زمن جوی در بد نکو زیستن | جگر خوردن و تازہ روی زیستن
ز دل خار خار غم انگیختن | خسک در گزار قفس ریختن

سخن چیدن و در راہ انداختن — دل افشردن و درچہ انداختن
روان کردن از چشم ہموارہ خون — بہ شورابہ شستن زرخسارہ خون
بدین جادہ کاندیشہ پیمودہ است — غم خضر راہِ سخن بودہ است

مگر، مندرجۂ ذیل اشعار میں شاعر کہتا ہے کہ وہ نہ تو نظامی ہے نہ زلالی، جنھیں اپنے کمال کا پورا پورا معاوضہ ملا۔ وہ اس خیال میں تسکین پاتا ہے کہ اس کی کوہ کنی ہی اس کا انعام ہے۔ اسے اس خیال میں مخفی سکون ملتا ہے کہ گو وہ ہندوستان میں پیدا ہوا اور ایسے زمانے میں جب قدر دانوں کا فقدان ہے، اس نے شاعری کے پرچم کو سربلند اور اس کے ایوان کو محکم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

نظامی نیم کز خضر در خیال — بیا موزم آئین سحر حلال
زلالی نیم کز نظامی بخواب — بگلزار دانش برم جوی آب
من از خویشتن با دل دردمند — نوای غزل برکشیدہ بلند
غزل را چو از من نوائی رسید — زدالا پسیچی بجائی رسید
کہ نشگفت کاین خسروانی سرود — شود وحی و بر من آید فرود
کسم در سخن کارفرمائی نیست — بہ بخشندگی ہمت افزائی نیست
چراغی کہ بی روغن افروختم — دلی بود کز تاب غم سوختم

ساقی نامہ

آخری رُوح پرور حصے میں ساقی سے خطاب ہے، جو فارسی کا ایک اہم پہلو ہے، نظامی ساقی نامہ کا موجد ہے، حافظ نے اسے فنِ لطیف بنا دیا، ظہوری نے اس کی تکمیل کی، اقبال نے اردو میں ساقی نامہ لکھا، بظاہر ساقی کو مخاطب کیا گیا ہے، مگر دراصل اشعار خدا کی عظمت اور جبروت سے متعلق ہیں، ساقی لُطف خدا ہے، اور مے سے مُراد حسنِ ازل ہے،

اگرچہ نظامی نے "ساقی نامہ" ایجاد کیا، لیکن تمام عمر اُس نے شراب کو

مُنہ نہیں لگایا، جیسا کہ سکندر نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:۔

وگرنہ، بہ ایزد کہ تا بُودہ ام بمی دامنِ لب نیالودہ ام
گر، از می شدی، ہرگز آلودہ کام حلالِ خدا، بر نظامی حرام

شروع میں شاعر بزم آرائی کی فرمائش کرتا ہے، تاکہ ستار کی ہنگامہ زالے پر جام کا دور چلے، لکھا ہے:

بیا ساقی آئین جم تازہ کن طراز بساط کرم تازہ کن
مبادا نظامی ز راہت برد بدستان سوی خانقاہت برد
فریبش مخور چون می آشام نیست ستمدیدۂ گردش جام نیست

ساقی کا "سراپا" ملاحظہ ہو:۔

فروہشتہ از دو سو بر عذار شکن در شکن طرۂ مشکبار
تو آن چشمۂ کز خضر آب خورد سکندر ز لب تشنگی تاب خورد
بہ آرایش باغ روی آوری در آن باغ از دجلہ جو آوری
دمانی گل و نرگس از روی خاک نشاطی بطرف چمن سرو خاک
نواگر کنی مرغ بر شاخسار بموج آوری آب در جویبار
در اندیشہ پنہان و پیدا توئی گل و بلبل و گلشن آرا توئی

کہا جاتا ہے کہ ہر جذبہ اور عمل ہمارے وجود کے اندر ہے اور کوئی نیکی یا بدی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ نکتہ مندرجہ ذیل اشعار میں کمال وضاحت اور چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے:

دو گیتی از آن جو نمی بیش نیست ازل تا ابد خود دمی بیش نیست
رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست بر عارفان جز خدا ہیچ نیست
نشانہای راز خیال خودیم نواہای ساز خیال خودیم

اسی ترنگ میں شاعر اقوال ناصح کو پرکھتا ہے اور ایک عام اصول پیش کرتا ہے:

ندانی کہ دانش بگفتار نیست	درین پردہ آواز را بار نیست

سخن

سخن کے بارے میں اِرشاد ہوتا ہے:

زشاہان سخن گر گہر سفتن است	سخن گفتن از حق جگر سفتن است
نہ نالی زغم گر جگر سفتہ شد	سخنہای حق بین کہ چون گفتہ است

اِس مثنوی کی بابت لکھا ہے :-

خود این نام فہرستِ رازِ حق است	درون و برونش طراز حق است

بڑھاپے اور کمزوری کے باوصف، شاعر دل میں نوجوانی کی ترنگ محسوس کرتا ہے، لیکن اس خیال سے خوف زدہ بھی ہے کہ اضمحلال قویٰ کے باعث وہ شاعری کے بال وپر سمیٹنے پر مجبور ہے۔ اور اب وہ صرف ان دلوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتا رہیگا، جب شیلیؔ کے "طائرِ فلک رس" کی طرح، اس کی فکر غزل خواں تھی۔

سخن را خود آنگونہ دانم سرود	کزین نیز خوشتر توانم سرود
دلی تاب در خود نیابم کنون	صریر قلم بر نتابم کنون
کنون نیست ظل ہمایم بسر	بہ پیری فتاد این ہوایم بسر
دریغ از ترقیٔ معکوس من	کہ باشد سر من بپابوس من

ان اشعار میں غالبؔ کی ضعیف العمری کا رونا ہے۔ "سٹھیا جانے" کے تصور سے اس کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ خیال تسکین دیتا ہے کہ گو اعضا جواب دے گئے، لیکن ذہن پہلے سے زیادہ مستعد ہے۔

ننالم ز پیری جوانم بہ رای	ہنوزم بود طبع زور آزمای
سخن سنج معنی طرازم ہنوز	بشیوائیٔ شیوہ نازم ہنوز
ہنوزم جگر موج خون می زند	زدل نیش غم سر برون میزند
توانم کہ در کارگاہ ہنر	بہ نیروی یزدان ہیروزگر

زہم بگسلم باستانی طراز　　سخن را دہم جاودانی طراز

آخر میں شاعر توفیقِ الٰہی کا طالب ہے، تاکہ جس نیک مقصد کو وہ لے کر اُٹھا ہے، اُس کو بخیر وخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکے، شعر ملاحظہ ہوں:۔

باقبال ایمان و نیروی دین　　سخن رانم از سید المرسلینؐ

بمستی توان نغز گفتار کرد　　مرا باید از خویش ہشیار کرد

درین بزم اوباش را بار نیست　　می و ساغر و زخمہ و تار نیست

ترا بخت در کار یاری دہاد

بہ پیوند دین استواری دہاد

۱۹۶۹ء میں ماہ نو کے اوّلین اڈیٹر جناب رفیق خاور نے اِس مثنوی کا منظوم ترجمہ اردو میں مع حواشی کے شائع کیا ہے، یہ ترجمہ میر حسنؔ کی مثنوی سحرالبیان کی بحر میں ہے، خاور صاحب لائق مبارکباد ہیں،

فصلِ ہفتم

قطعات

این قطعہ بین کہ کرد اسد اللہ خان رقم

غالبؔ نے کُل ملا کر ایک سو سولہ[116] قطعات لکھے ہیں، جن میں چالیس[40] تاریخی اور دیگر مختلف واقعات سے متعلق ہیں، بقیہ قطعات میں متعدد موضوعات نظم کئے گئے ہیں، ان بے تکلف نظموں میں بھی ساٹھ متعدد معاصرین کی مدح یا ہجو میں ہیں، بادشاہ، شاہزادے، حکام، دوست اور مدّاح ان اشعار کے مخاطب ہیں، ان میں چند حریفوں، مثلاً ذوقؔ اور احمد علی کلکتوی پر مختصر چوٹیں اور طنز بھی ہیں، غالبؔ کے ہجو یہ کلام کا لب و لہجہ عالمانہ اور فاضلانہ ہے، الوریؔ، سوزنیؔ اور عبید زاکانیؔ کی طرح ناشائستہ اور غیر مہذب زبان کا شائبہ نہیں، نہ اِن میں مہمل، رکیک اور اخلاق سے گرے ہوئے خیالات ہیں، جن سے تنفّر پیدا ہو، شاعر کی خاندانی نجابت و شرافت ہر مقام پر نمایاں ہے،

اس صنف میں غالبؔ نے رودکیؔ، مسعودؔ، الوریؔ، خاقانیؔ، ظہیرؔ اور حزیںؔ کی پیروی کی ہے، ان اساتذہ کے قطعات بیشتر مدحیہ ہیں، اور حقیقی مرکزی خیال سے ہٹ کر ہیں، معلوم ہوتا ہے، کہ یا تو غالبؔ نے ابن یمین کے قطعات دیکھے نہیں، یا اُس کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھا، ورنہ اُس کے قطعات کہیں بلند تر ہوتے، ابنِ یمینؔ کے قطعات کلاسیکی ادب کا جزو بن چکے ہیں، اس نے اپنے قطعات میں جہاں سماجی بُرائیوں کا خاکہ اڑایا ہے، اُن کا علاج بھی تجویز کیا ہے،

غالبؔ کے قطعات کا وہی رنگ ہے، جو اس کے قصائد اور غزلیات کا طُرّۂ امتیاز ہے، وہی ذاتی لمس، وہی مقامی ماحول، وہی انداز بیان، اور وہی بلند پایہ خیالات، بعض قطعات تو غزلیات کے مقابلہ میں لائے جاسکتے ہیں، چند قطعات اُس کی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں،

کلیاتؔ کا پہلا قطعہ حزیںؔ کے قطعے کی تتبع میں کہا گیا ہے، حزیںؔ کا قطعہ یوُں شروع ہوتا ہے:-

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست
خویشتن را ہمی سپاس کنم

اِس قطعہ میں ناقدردانی کا رونا رویا گیا ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ غالبؔ نے شاعری کیوں اختیار کی، اس نے صاف کہدیا ہے کہ وہ کسی کے دباؤ میں آکر شعر نہیں کہتا، وہ حزیںؔ کی طرح زمانے کی قدر ناشناسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، بقول اُس کے وہ بھٹّی نہیں کرسکتا، وہ خلاق معانی تھا، فارسی اُس کی باندی تھی، لُغت اُس کی حرزِ جان تھی، وہ منفرد ہستی تھی، وہ زمانے کا بہت بڑا مجتہد تھا، وُہ اپنی مرضی کا مالک تھا، اس کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا تھا، اس قطعہ میں وہ کہتا ہے:-

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش — از فسونِ کسی ہراس کنم
نتوانم کہ از نصیحت و وعظ — عالمی را فسون شناس کنم
نہ کہ ز آثارِ ہر چہ مشہور است — اثری تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از حُلہ ہای بہشت — ترک آرائش لباس کنم
بر مدارا گر مدار نہم — کاخ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید ز من گفتار — مدحت لالہ سُور داس کنم

اپنے ذاتی عظمت کے متعلق کہا ہے:-

ہمچو سرو از غمِ خزان برہد — گلبُنی را کہ من مساس کنم

کسی دوسرے قطعہ میں یوں تعلّی کی ہے:

آنم، کہ در بزم، صریرِ قلمِ من
در رقص در آوردہ، سپہرِ نہمین را
رضوان کند از ریزۂ کلکم بہ تبرّک
پیوندگری نخلۂ فردوسِ برین را
ہر ناوک اندیشہ کہ از شست گشادم
بر رہگزر وحی رہ افتادہ کمین را
بر محضرِ استادیٔ من بسکہ زندہ مُہر
بر خاتمِ انجم سُودہ شود نقشِ نگین را

غالب نے ہجو گوئی سے اجتناب برتا، ہاں، جب جان پر بن جاتی تو ایسا مسکت جواب دیتا، کہ حریف توبہ توبہ کرتا، قطعات نمبر ۴، ۶، ۷، ۱۲ اور ۱۳ میں ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا خاکہ اڑایا ہے، ساتواں قطعہ تو اسکا بہترین قطعہ ہے، اس قطعے میں اُس نے ازراہِ تمسخر اپنے اردو کلام کو گرا کر دکھایا ہے، اور فارسی کلام کو بڑھ چڑھ کر دکھایا ہے، چوتھے قطعے میں معاصرین پر چوٹیں کی ہیں ملاحظہ ہوں:-

منکرانِ شعرِ من، ہاں تا نگوئی حاسدند
کاین قیاس از بہرِ شان سامانِ نازی بودہ است
رشک از کالا شناسی خیزد، وآن مایہ ایست
کاش باشد رشک کان را ہم جوازی بودہ است
خویش را چون من، مرا چون خویش، می دانستہ اند
چون ہمی بینند کاین را سوز و سازی بودہ است
لاجرم بر فکرِ خود ہم اعتمادی کردہ اند
دین نمی دانند، کاخر امتیازی بودہ است

باغ و زندان راغنائی و عنائی بودہ اند
کوہ و ہامون رانشیبی و فرازی بودہ است

مکرّر کہا

ہزار معنیٔ سرجوش، خاص نطقِ منست
کزاہلِ ذوقِ دل وگوئی ازعسل بردہ است
مراست ننگ، ولی فخر اوست، کان بسخن
بسعی وفکر رسا جا بدان محل بُردہ است

حریفوں کے فن کا سکہ کم عیار سمجھ کر تمسخرانہ کہا، نشتریت ملاحظہ ہو:-

غالب دراین زمانہ بہرکس کہ وارسی
مضمونِ غیر، ولفظ خودش، برزبان اوست
مضمونِ ہرکرا خوش ادامی کند بناز
گوئی، بہ بزمِ اہل سخن، ترجمان اوست
جز من کسی بدُزد سخن وا نمی رسد
گوخوش بخوان، کہ انجمنی مدح خوان اوست
آری، نہ چک بود، نہ تمسّک زہر کہ ہست
نی دستخط، نہ مُہر، نہ نام ونشان اوست
مضمونِ شعر لوٹ بود، نی زمانتا
یعنی بدست ہرکہ بیفتاد، آنِ اوست

ساتویں قطعے میں ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے زوربیان کی داد دی ہے اور اُس کی خوب خوب خبرلی ہے، یہ قطعہ سہرے کے سلسلے کی آخری کڑی ہے، اس قطعہ میں بھی اپنے فارسی شعر کی تعریف کی ہے اور اُردو شعر کو گرا کر دکھایا ہے، اس نظم کا ہر شعر تیر ہے، تفنگ ہے، نشتر ہے،
ملاحظہ فرمایئے:-

نیست نقصان، یک دو جزو است، از سوادِ ریختہ
کان دِژم برگی، ز نخلستانِ فرہنگِ من است
فارسی بین، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو، کہ بیرنگ من است
فارسی بین، تا بدانی، کاندرین اقلیم خیال
مانی و ارژنگم، و آن نسخۂ ارتنگِ من است
دُشمنی را ہمفنی شرط است، و آن دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در سازی، کہ در چنگِ من است
در سخن چُون ہمزبان و ہمنوای من نئہ
چُون دِلت را پیچ و تاب، از رشک، آہنگِ من است
راست می گُویم من، و از راست سر نتوان کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تُست، آن ننگ من است
انوری و عُرفی و خاقانیٔ سلطان منم
پادشاہ طہورث و جمشید و ہوشنگِ من است

غالب کا یہ بہترین قطعہ ہے،
سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا، آگے چل کر قطعات نمبر ۱۲، ۱۳ اور ۱۶ میں مزید طنز کا مظاہرہ ہوتا ہے، بارہویں قطعہ میں لکھا:۔

ای کہ خواہی کہ بعد ازین باشم
مخلص و صادق الولای تو، من
گر ترا شیوۂ شاہدی بودی
کردمی جان و دل، فدای تو، من
ور ترا پیشہ شاعری بُودی
سُودمی چشم و سر، بپای تو، من

چوں از ینہا نئہ، مرا چہ ضرور؟
که شوم ہرزہ، مبتلای تو، من

تیرھویں قطعے کے اہم اشعار ہیں:۔

ایا! بی ہُنر، دشمنِ دیوسار
چہ نازی بہنگامۂ زُور و زر؟
زما باش فارغ، کہ ما فارغیم
نداریم پروای این شور و شر
ترا شیوہ دُزدی، و ما بینوا
تو بدروی، و بدگوی، و ما کورُو کر

سولھویں قطعے میں دل کی بھڑاس یوں نکالی ہے:۔

کردۂ جہدی، کہ در ویرانئ کاشانہ ام
چرخ در آرایشِ ہنگامۂ عالم، نکرد
ہمچو تو ناقابلی، در صُلبِ آدم دیدہ بود
زان سبب ابلیسِ ملعون، سجدہ بر آدم نکرد
حاشا للہ! بودنت در صُلبِ آدم، تہمت است
پیشِ ہر کس گفتم این اندیشہ، باور ہم نکرد

معرکۂ "برہان قاطع" کے محرک مولوی احمد علی احمد کا خاکہ "سبد چین" میں شامل شدہ قطعہ میں اُڑایا ہے، اس قطعہ کا ہر شعر زہر میں ڈوبا ہوا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مولوی احمد علی احمد تخلص، نسخہٴ
در خصوصِ گفتگوی پارسی، انشاء کردہ است
در جہان تو امِ بُدی، رُوی دی و پُشتِ قتیل
پیشوای خویش ہندو زادۂ را کردہ است

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ کار؟
خالقش در کشور ہنگالہ، پیدا کردہ است
صاحبِ علم و ادب، وانگہ زافراطِ غضب
چُون سفیہان دفترِ نفرین و ذم، وا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سُوقیان باشد، بلی
ننگ دارد علم، از کاری کہ آغا کردہ است
میکند تائید "برہان"، لیک بُرہان ناپدید
نیست جز تسلیم قولش، ہرچہ انشاء کردہ است
لغو، وحشو، وادّعای محض، و اطنابِ مُمل
مار و مُوش و سُوسمار و گربہ، یکجا کردہ است
بگزر از معنی، ہمین الفاظِ برہم، بستہ بین
بادہ نبود، شیشہ و ساغر، مہیّا کردہ است
غازیان ہمراہ خویش آوردہ از بہرِ جہاد
تا نہ پنداری کہ این پیکار تنہا کردہ است

آخر میں اپنے آپ کو بری الذّمہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :-

من سپاہی زادہ ام، گفتار من باید دُرُشت
وای بروی گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است

غالب کو اپنی تلخ نوائی کا احساس ہے، جس کو یوں ادا کیا گیا :-

زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام
شوخئ طبعی کہ دارم، این تقاضا کردہ است

معترضین کے اِن الزامات کے جواب میں کہ وہ رندِ دُرم آشام تھا، غالب ان اشعار میں اپنی مدافعت کرتا ہے، اور کہتا ہے :-

حق گُوئی، کہ با کلامِ مجیدت رجوع نیست

دِل تیرہ شد ز کلفتِ این گفتگو مرا
حق است مصحف د بود از رُوی اعتقاد
در عزتِ کلامِ الٰہی غُلو مرا
ہر صفحہ زان صحیفۂ مشکین رقم بچشم
باشد نکوتر از خطِ رُوی نکو مرا

دسواں قطعہ کلکتہ میں لکھا گیا اور کلکتہ سے متعلق ہے، اور ساقی سے خطاب ہے، یہ صنعت "سوال و جواب" میں لکھا گیا ہے، زبان کی روانی اور صنائع کی فراوانی اس کی خصوصیات ہیں، قطعہ ملاحظہ ہو

گفتمش: "چیست منشاء سفرم؟" گفت: "جور و جفای اہلِ وطن"
حالِ کلکتہ باز جُستم، گفت "باید اقلیم ہشتمش گفتن"
گفتم: "این جا شغل سوُد دہد؟" گفت: "از ہر کس ترسیدن"
گفتم: "از بہرِ داد آمدہ ام" گفت: "بگزر و سر بسنگ مزن"

مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ قطعہ "بادِ مخالف" کے بعد لکھا گیا تھا، ملاحظہ ہو:

گفتم: "این جا چہ کار باید کرد؟" گفت: "قطع نظر ز شعر و سخن"

سلسلہ جاری رکھتے ہوئے لکھا:-

گفتم: "ای محرمِ سرای سُرور از ادب دُور نیست پُرسیدن
اوّل از دعوئ وجود بگو" گفت: "کفر است در طریقت من"
گفتمش: "با مخالفان چہ کنم؟" گفت: "طرح بنای صلح افگن"
گفتم: "این حُبِّ جاہ و منصب چیست؟" گفت: "دامِ فریب اہرمن"

دہلی، بنارس اور لندن اور ان کے حسیناؤں کے متعلق لکھا ہے:-

گفتمش: "بگو کہ دہلی چیست؟"
گفت: "جہان است و این جہانش تن"

گفتمش: "چیست این بنارس؟"
گفت: "شاہدی مست محوِ گل چیدن"
گفتم: "این ماہ پیکران چہ کس اند؟"
گفت: "خوبانِ کشورِ لندن"
گفتم: "اینان مگر دلی دارند؟"
گفت: "دارند، لیکن از آہن"

اُنیسواں قطعہ "گربۂ پاکیزہ نہاد" یعنی پالتو بلّی پر لکھا گیا ہے، روانی ملاحظہ ہو:-

دارم بجہان گربۂ پاکیزہ نہادی
کز بال پریزاد بود موج رم اُو
سرمست ادا چو بزمین باز خرامد
از خاک دمد غنچہ زنقشِ قدم اُو
چوُن صورت آئینہ ز افراطِ لطافت
آید بنظر بچۂ اُو در شکم اُو
آری بود، از غیرت انداز خرامش
بر کبک و تدرو است اگر خود ستم اُو
رخشندہ ادیم تنش از لطف زبانش
گوئی بہ اثر تاب سہیل است نمِ اُو
تا چہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر
با داکفِ دستِ من و پشتِ شکمِ او

غالب نے اُنیس قصیدے اور اٹھارہ قطعات حکام وقت کی شان میں لکھے ہیں، اِن میں ٹامسن، میکناٹن، ایڈمانسٹن، سیسل بیڈن جنرل جیکب، پرنسپ اور اسٹرلنگ شامل ہیں، ایک قطعہ میں جیکب

کا زائچہ بیان کیا ہے،

قطعات پچیسواں اور چھبیسواں نواب ذوالفقار الدولہ کی شان میں لکھے گئے، پہلا قطعہ میں نظیری کی اُس غزل کا تتبع کیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

یادم نمی کنی و زیادم نمی روی
عمرت دراز باد، فراموش کارِ من

قطعہ یہ ہے:-

ای نیلگون حصار فلک بارگاہ تو
وی بارگاہ تو زحوادث حصار من
ای نوبہار باغ جنان گرد راہ تو
وی گرد راہ تو بجہان نوبہار من
رویت بیاض صفحہ نگار یمین تو
مویت بیاض نامہ نویس یسار من
از دستہ دستہ سنبل و گل رختخواب تو
وز پشتہ پشتہ دود و شرر پود و تار من
ای صد ہزار فصل ربیعی نثار تو
وی بیشمار مرگ طبیعی دو چار من
"یادم نمی کنی و زیادم نمی روی
عمرت دراز باد فراموش کار من"

دوسرے قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

مرا در بیخودی نظارہ گاہیست — تعالیٰ اللہ شانہٗ اللہ اکبر
نہ باغستی کہ در پہناش بینی — گل و ریحان و شمشاد و صنوبر
محبت نام نورانی بنائیست — زسیمای نکویان دلکشاتر
فضایش را صباحی جلوہ بالا — بساطش را نسیمی روح پرور

نسیمش رنگ و بوی ہشت گلشن صباحش آبروی ہفت کشور

غالب نے چھ قطعات بہادر شاہ ثانی اور تین قطعات ولیعہد کی شان میں لکھے ہیں، موسم بہار کا نقشہ یوں کھینچا ہے :-

نوروز و مہرگان نبود در طریق ما
اما شگفتہ روی گلہای تو خوش است
از باد زمہریر بگیتی نشان نماند
جوش گل و نشاط نسیم سحر خوش است
بویش مشام پرور و رنگش نظر فروز
خوش باد وقت گل کہ جہان سربسر خوش است
از رنگ رنگ ترہ و از گونہ گون گل
گلزار و شہر و بیشہ و کوہ و کمر خوش است
دریا خوش و شراب خوش و کوہسار خوش
منزل خوش است و توشہ خوش است و سفر خوش است

شاہِ اودھ نصیر الدین حیدر کی شادی کے موقعہ پر غالب نے ۱۸۲۸ء میں ایک شاندار قطعہ پیش کیا تھا، مناسبتِ حال یوں بیان کی گئی :-

لوحش اللہ ز جوشِ گل کہ دمد
عرضِ گنجینۂ صبا و شمال
بخت گوید بخرمی کہ بناز
عیش پیچد بتازگی کہ ببال
رنگ را بو رسد بعذر قدوم
لالہ را گل دود باستقبال
ہمہ می میچکد ز مغزِ غبار
ہمہ گل میدمد ز شاخِ غزال

باغ از نقشهای رنگارنگ
نیکوان راست نامۂ اعمال
داغ از لاله ہای گوناگون
عاشقان راست کارگاہِ خیال
سروہا در ہجوم جنبش شاخ
پرّیان زمرّدین پر و بال
شاخہا در نمایش شبنم
حُلّہ پوشانِ گوہرین تمثال
دہر گوئی شد سرتاسر
بزم طوبی شۂ ستودہ خصال
چون چنین شاہ را چنین جشنی
آمد آرایشِ دوامِ جمال

فصل ہشتم

عام جائزہ

سخن از پیشروان ماند، ہمانا زین پس
ما نمانیم بگیتی، سخن از ما ماند

جذباتی اور دماغی شاعری

ہم نے شاعری کو دو صنفوں میں تقسیم کیا ہے، جذباتی اور دماغی، جذباتی شاعری جوانی کا ردِّ عمل ہوتی ہے، جب کہ شاعر اپنے تخیّل کے حسین دنیا میں محو و مست ہوتا ہے، زندگی کے اس دَور میں اس کی رگ و پے میں شباب کروٹ لیتا ہے، اور وُہ بے خوف و خطر تخیل کے حسین پہلوؤں پر طبع آزمائی کرتا ہے، اور اس کے برانگیختہ جذبات عشق و محبّت سے مملو اشعار کی صورت میں موجزن ہوتے ہیں، یہ صُورت اتنی مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہے، کہ قارئین کو مسرور و محظوظ کر دیتی ہے۔

اِس کے برعکس، دماغی یا علمی شاعری زندگی کی دشوار گذار وادیوں اور پگڈنڈیوں سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، کیونکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ جذبات کی برانگیختگی میں کمی آجاتی ہے، اور دل کی دھڑکنوں میں سکون پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے میں شاعر جذبات سے ہٹ کر گردِ و پیش کے ماحول کو اصلی رنگ اور رُوپ میں دیکھنے اور پرکھنے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت خیالات میں پختگی اور تدبّر کارفرما ہوتا ہے، اور اندازِ بیان خیالات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے،

غالبؔ کی شاعری کا بھی یہی حال ہے، اس کی ابتدائی مشق اور بعد کی کاوشوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، اس کی شروع کی شاعری میں دل کی گوناگوں کیفیات کا ایک عالم ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے جوالا مکھی "لاوا" اُگل رہا ہے، اس برانگیختگی اور وارفتگی کے مقابلہ میں ۱۸۳۵ء کے بعد کے کلام کے مطالعہ سے غالبؔ کی پختہ خیالی، سنجیدگی، متانت، تجربہ کاری، ذہانت اور بلند آہنگی صاف طور پر نمایاں ہے، اور سِن کا تقاضا بھی یہی تھا، کہ عمر کے ساتھ تبحّر اور پختہ دماغی میں اِضافہ ہو، اور جذبات کی برشتگی اور شیفتگی میں کمی آجائے، تاکہ ادراک پیدا ہو، اور پرواز میں بلندی، خیال میں وسعت، الفاظ میں شُستگی اور شگفتگی، بندشوں میں چُستی اور برجستگی پیدا ہو،

غالبؔ کے لئے شاعری فطری تھی، اِکتسابی نہیں، نیچرل تھی، تدریسی نہیں، اور یہی تھی، ذریعۂ عزت یا معاش نہیں تھی، سراپا انبساط تھی، اِلہامی تھی، بقول خود

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

یہی وجہ ہے، کہ اس نے شاعری کو شاعری کے لگاؤ میں اختیار کیا، اس کو نفسِ مضمون سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، وہ تو زبان کی شیرینی اور موزونی اور خیالات کی دلپذیر ترجمانی کا قائل تھا، اس کے اشعار میں عظمتِ خیال کے بغیر بھی شوکتِ الفاظ میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی، اس کے نزدیک، شاعری محض خفتہ جذبات کو بیدار کرنے کا ذریعہ نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ دنیا کو انسانیت، حقانیت، شرافت اور محبت کا پیغام دیا جا سکتا ہے، اور لوگوں کو روزمرہ کے آلام و مصائب سے کچھ عرصہ کے لئے نجات بھی دلائی جا سکتی ہے،

ممتاز خصوصیات

غالبؔ اردو غزلِ سہرا کا مؤجد بھی ہے اور علمبردار بھی، فارسی میں نغانیؔ کے طرز کو

از سرِ نو زندہ کرنے کے علاوہ اس نے کسی صنفِ شاعری کا اِضافہ نہیں کیا، یہ بات ضرور ہے، کہ پُرانی طرز میں نئی روح پھونک دی، اور ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی، اُس نے اپنی انفرادی اور انقلابی شخصیت کی جھلک دکھا کر تخیل کی پرواز اور نفاست اور نزہت کی چاشنی ملا کر اس کو پہلے سے زیادہ مؤثر بنا دیا، اس کے کلام کے ہر شعر میں انفرادیت کی جھلک موجود ہے، وہ خود کہتا ہے: ع

درتہ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ

ہم مانتے ہیں کہ سعدیؔ، امیر خسروؔ اور شکسپیئرؔ کی عالمگیر شہرت، ملٹنؔ اور جامیؔ کا تبحّر، میر تقی میرؔ اور ورڈزورتھؔ کا سوز و گداز، عرفیؔ کا زورِ بیان، ٹینی سنؔ کی لطافت قاآنیؔ کی رنگینی، حافظؔ اور نظیریؔ کا جوش، عمر خیامؔ اور ٹامس ہارڈیؔ کی سخت کوشی، ہومرؔ اور فردوسیؔ کا اعلیٰ مقصد، انوریؔ، خاقانیؔ اور ظہیرؔ کی باریک بینی، عطارؔ، سنائیؔ اور رومیؔ کا تصوف، ڈانٹےؔ اور اقبالؔ کی انفرادیت، مسلّم الثبوت ہے، مگر غالبؔ کے کلام کی ہمہ گیری بالکل نرالی ہے، اُس میں ان مشاہیر کے تمام اوصاف موجود ہیں، جیسا کہ اس نے کہا ہے:۔

ہزار زمزمہ دارم، ہمیں نہ یک سخن است
کہ چُون تمام شود آن سخن، ز سر گویم

غالبؔ کی شاعری کی ممتاز ترین خصوصیات یہ ہیں:۔

تنوّع، جدت پسندی، زورِ بیان، روانی اور موزونیِ الفاظ، اندازِ بیان میں اشاریت، منظر نگاری، تخیل کی بلند پروازی، مزاح اور طنز، قدامت پسندی، محبت اور رحم، مشاہدۂ نفس، سوز و گداز، تصوف اور معنی آفرینی،

آیئے، ان میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً جائزہ لیں،

تنوع

غالبؔ ایک عالمگیر شخصیت کا حامل تھا، اس نے اردو اور فارسی زبانوں میں

شاعری بھی کی اور نثر بھی لکھی، اس نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور مختلف طریقوں سے اظہارِ خیال کیا ہے، بانسری کی طرح اُس نے ہر راگ گایا ہے، اور پھر ہر ایک میں رنگینیاں پیدا کی ہیں، اس کی شاعری اُس کی شخصیت کی طرح پہلو دار ہے، اور ہر پہلو اپنی جگہ پر جداگانہ انفرادیت کا حامل ہے، قصیدہ ہو یا غزل، قطعہ ہو یا مثنوی، اس نے ہر صنف کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے، اور اپنے مخصوص اندازِ فن کی بڑی مہارت سے آبیاری کی ہے، وہ کہتا ہے :-

فرجامِ سخنگوئی غالبؔ بتو گویم
خون جگر است، از رگ گفتار کشیدن

جدّت پسندی

انفرادیت غالبؔ کی شاعری کی جان ہے، انقلاب اُس کی گھٹی میں تھا، اس نے زمانے کے مسموم اور مذموم ماحول میں رہ کر بھی بالکل نئے اور اچھوتے خیال نظم کئے ہیں، ایک وقت تھا، جب وہ فرسودگی اور واماندگی کا شکار ہو گیا تھا، مگر وہ جلد ہی اِس پھندے سے نکل آیا، اور فغانی کے طرزِ فکر کی تجدید کر کے غزل میں ایک نئی تازگی اور ایک نیا جذبہ بخش دیا، اس کی زبان ٹکسالی ہے، اس لحاظ سے وہ قدامت پسند ہے، مگر اُس نے انہی الفاظ کو بالکل انوکھے اور نئے ڈھنگ سے پیش کر کے معنی بدل دیئے ہیں، اور ان میں نئی روح پھونک دی ہے، اور ان میں ذاتی جھلک پیدا کر دی ہے،

غالبؔ کے خیال کی گہرائیوں تک پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں، اس نے قدما کی پیروی ضرور کی ہے، لیکن اِس میں بھی اس کا ایک الگ طرز کار فرما رہا، اور اُس کی انفرادیت قائم رہی، یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں شگفتگی پیدا ہو گئی،

غالبؔ جدّت کا امام تھا، اس کی جدّت طرازی تخیل اور بیان تک محدود نہیں ہے، اس کی تشبیہیں، استعارے اور دوسرے صنائع گلاب کی نرم و نازک

پنکھڑیوں پر پڑی ہوئی شبنم کی طرح تازہ ہیں، اس کے تخیل کی بلند پروازی اور اور انداز بیان کی جدّت فرسودہ سے فرسودہ خیال میں بھی چستی اور نیا پن پیدا کردیتی ہے، غالبؔ نے عمر بھر جدّت کی آبیاری کی اور جدّت کو آخر دم تک ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

غالبؔ جب شعر و شاعری کے میدان میں اترا تو تقلید کورُ کورانہ نقّالی کی حد تک پہنچ چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کی فارسی شاعری بے کیف ہو کر رہ گئی، غالبؔ نے شاعری میں مصوّری ہی نہیں کی بلکہ اُس نے اپنی شخصیت اور انفرادیت کو غالب کرکے اپنی شاعری میں چار چاند لگا دیئے، اس بنا پر یہ کہنا بالکل جائز ہوگا کہ غالبؔ نے اپنے لئے اپنی جدّت طرازی کے بل بوتے پر ایک خاص مقام بنا لیا ہے، وہ خیال، زبان، صنائع و بدائع کے استعمال میں پورا پورا جدّت طراز ہے، کہا ہے:۔

لفظِ کہن و معنیٰ نو در وَرقِ من
گوئی کہ جہان است و بہار است جہان را

در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی
در آتشِ ہنگامۂ ما دُود نیابی

زورِ بیان اور روانیٔ الفاظ

آنم کہ درین بزم صریرِ قلم من
در رقص در آوردہ سپہر نہین را

غالبؔ کی شاعری کی سب سے ممتاز خصوصیت شوکتِ الفاظ ہے، ابہام اور اشاریت کی بنا پر کبھی کبھی اس کے انداز بیان میں وہ رفعت نہیں رہتی مگر اس کے باوجود اُن کے قصائد اور غزلیات شوکت الفاظ، چست بندشوں اور شگفتہ بیانی کے نادر نمونے ہیں، اور آمد اُس کے اشعار میں نغمگی، شیرینی اور تازگی

پیدا کرتی ہے، ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں اُس کے کلام میں بے ساختگی اور وارفتگی نہ ہو، مگر اس سے اُس پر آورد کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ ہر بار رگِ جان کو نشتر لگاتا رہتا ہے؟ اُس کا انتخابِ الفاظ، بہترین محاورے اور تراکیب کا موزوں استعمال، تشبیہات اور استعارات کی نُدرت غالبؔ کو اس عالی مقام پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پر کم شاعر کا گذر ہوتا ہے، صنفِ سخن خواہ کوئی بھی ہو، وہ الفاظ کو اُس شکوہ اور احتیاط سے استعمال کرتا ہے، کہ حُسنِ بیان اور حسُن خیال میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، زبان پر بے پناہ قدرت کی بنا پر وہ مطالب کو جس طرح اور جس رنگ میں چاہتا ہے، بیان کرتا ہے،

ہمارے شاعر نے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ اور خیال کو نظم کرنے سے اجتناب اور احتراز برتا ہے، اس کی بندشوں میں بھُولے سے بھی ڈھیلا پن یا جھول نہیں آنے پاتا کیونکہ وہ بے جان اور بے کیف الفاظ استعمال نہیں کرتا، حُسنِ خیال اور حسُنِ بیان کا امتزاج اس کی شاعری کی جان ہے، وُہ جس طرح چاہتا الفاظ سے کھیلتا، اُن کو جس طرح چاہتے استعمال کرتا، اُس کے پاس الفاظ کا بیش بہا خزانہ تھا اور اس خزانے کو وہ ہمیشہ مناسب موقعوں پر انسب طریقوں سے استعمال کرتا، وہ ہنسانے، رُلانے، زخم لگانے اور مرہم رکھنے پر یکساں قادِر تھا، اس کی شاعری بیہودہ مبالغہ آمیزی، دُور از کار تمثیلوں اور بے کیف و بے سرُور لفاظی سے پاک ہے، اس کی بیشتر نظموں میں زورِ بیاں برابر قایم رہتا ہے، جس سے اُس کے کلام میں ایک شان پیدا ہو جاتی ہے،

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غالبؔ کی شاعری میں وُہ زور اور دوامیت نہیں ہے، جو اُس کو امیر خسرو اور میرزا بیدلؔ کی صف میں جگہ دے، تو یہ اُن کی لا علمی اور تعصب ہے، جہاں تک روانی، زور اور صحت الفاظ کا تعلق ہے، بیدلؔ ہمارے شاعر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا، غالبؔ ایک تخلیقی فنکار تھا، اُس کا شاندار فن اعلیٰ طور پر شاندار رہے،

غالب نے بڑی لاپرواہی سے زندگی بسر کی، مگر وہ اپنے فن سے کبھی لاپرواہ نہیں رہا، اُس کو ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہی، کہ حسنِ خیال اور حسنِ بیان کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے، حقیقت میں اُس کا فن محسوسات کی عکاسی اور حقیقت نگاری کا سنگم ہے،

منظر نگاری

منظر نگاری غالب کی شاعری کا ایک ممتاز پہلو ہے، بالخصوص جب وہ مناظرِ قدرت، گل و بوستان، لیل و نہار، اور شمس و قمر سے ہمکلام ہوتا ہے، اگرچہ اس نے پھولوں، درختوں، دریاؤں اور کوہساروں کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا، اور یہ بھی صحیح ہے، کہ نہ تو ورڈز ورتھ تھا، اور نہ ہی قاآنی، مگر اس نے اپنی حد میں رہ کر مختصر طریق بیان میں فطرت کی پوری پوری منظر کشی کی ہے، اس کے قصائد کے تشبیب اور مثنویات سے اس کی منظر نگاری کے بیّن ثبوت ہیں۔

یاسیّت

مشاہدۂ نفس، اشاریت، پروازِ تخیل، زورِ بیان، تصوّف، مزاح و طنز سے متعلق اُوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کی شاعری کی ایک نمایاں اور ممتاز خصوصیت غم و اندوہ ہے، یہاں پر وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آتا ہے، حسرت و یاس کا امتزاج اس کی شاعری کو نمایاں کرتا ہے، اور امتیاز بخشتا ہے، غالب کی زندگی ایک مستقل المیہ معلوم ہوتی ہے، اُس کو دماغی سکون اور طمانیت قلب حاصل کرنے کے لئے بڑی جد و جہد کرنا پڑی، مگر دماغی سکون اور طمانیت قلب اس کو کبھی بھی نصیب نہ ہو سکے، غم و اندوہ سے اس کو کبھی چھٹکارا حاصل نہیں ہوا۔

تغزل کا یہ شہنشاہ شیلی کی طرح ہمیشہ آرزوں اور حسرتوں کا شکار رہا،

شاعری میں ہم کو اس کی تمام آرزوئیں خون ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، پھر بھی اس میں جوناتھن سوِفٹ اور ٹامس ہارڈی کی تلخی نہیں ہے، اس نے کبھی اپنے مقرر کردہ راستے سے انحراف نہیں کیا اور نہ کبھی اپنے اصولوں کی تبلیغ سے کوتاہی برتی، وہ اگر چیختا بھی ہے تو اتنے دور سے کہ کانوں پر بار نہ ہو، اور دل پر اثر انداز نہ ہو، یہی اس کی زندگی کا زبردست المیہ تھا، جس نے اس کے تخیل کو بلند پروازی بخشی اور اس کے فن میں خیال اور بیان کو ہم آہنگ کر دیا،

یہ غالبؔ کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے وقت پیدا ہوا، جب کہ فن تنزّل کی طرف جا رہا تھا، وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا، اس کی مثال اس بلبلِ ہزار داستان کے مانند ہے جو زمانے کی بے التفاتیوں کا خیال کئے بغیر عالم کو اپنے نغموں سے سرشار کرتی رہتی ہے، پیدائشی شاعر ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دل کی امنگوں کو دبا نہ سکا، اور ستایش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر اپنے اشعار پیش کرتا رہا، لیکن بہرحال وہ ایک انسان تھا، لوگوں کی بیرُخی اور زمانے کی بیرحمی دیکھ کر بیچ اُٹھا، ناکامی اور محرومی کا یہ احساس اس کے کلام میں یاسیت کی شکل میں نمودار ہوا، اور اس کی شاعری کا اہم جزو بن گیا، اس کا ہر مصرع اس کی غمناک زندگی کا آئینہ دار ہے، فرماتا ہے:

من خود عدیل خویشم و نبود عدیل من
چوُن خود مرا بہ غصّہ فنا کرد روزگار

مے پرستی

غالبؔ بلا کا دُرد آشام تھا، نظامی گنجوی اور ریاضؔ خیرآبادی نے فارسی اور اردو ادب میں خمریات کا اضافہ کیا، اِن کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا ہے، کہ ان کا دامن پاک رہا، مگر غالبؔ تو بلانوش تھا، اور اس نے اپنے کلام میں

"چشم خروس" اور "آبِ رز" کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے، اس کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وُہ علانیہ پیتا تھا، منافق نہیں تھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

در من ہوسِ بادہ طبیعیست کہ غالبؔ
پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

نشاطِ یکدمہ از عمر جاودان خوشتر
بگیر بادہ و بگذار آبِ حیوان را

دل خستۂ غمیم و بود می دوای ما
با خستگان حدیثِ حلال و حرام چیست

خوش است کوثر و پاک بادۂ کہ درُوست
ازان رحیقِ مقدّس درین خمار چہ حظّ

ترا بہ پہلوی میخانہ جا دہم غالبؔ
بشرطِ آن کہ قناعت کنی ببوُی رحیق

ہفت گنجینۂ پرویز نسنجم بہ دو جوُ
تشنۂ بادۂ نابم، نہ گدا پیشۂ مال

آنچہ میخواہم ازین توطیہ، دانی چہ بود؟
کنجی از باغ، وخمی از می، وجامی زسفال

گر نہ نوشم دیگر و در شیشہ دارم پیشِ رُوی
بُوی می از بس خوشی باشد روان آسای من

غالبم، از می پرستی، نگذرم غوطہ در گردابِ طوفان میزنم
غالبؔ عالمِ سرخوشی میں بھی ہوشیار رہتا تھا، ملاحظہ ہو
پیمانہ بر آن رند حرام است، کہ غالبؔ
در بیخودی اندازۂ گفتار نداند
اسی عالمِ بیخودی میں اس نے بہت کچھ کہا ہے، بلکہ اُس کے تمام جواہر پارے ”بادہ احمر“ کے رہینِ منت ہیں، جیسا کہ کہا:۔
بیا! کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم[۴۴]

۳۔ غالبؔ کا مقام

اب ہم نے دنیائے علم و ادب میں غالبؔ کا صحیح مقام متعین کرنا ہے، اس بارے میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کئے گئے ہیں:۔
(۱) غالب اپنی نظر میں

---

۴۴ مولانا حالیؔ نے غالبؔ کی شعر گوئی سے متعلق لکھا ہے:۔
”فکرِ شعر کا طریقہ یہ تھا، کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے، اور جب کوئی شعر سرانجام ہوجاتا تھا، تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے، اسی طرح، آٹھ، آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے، اور دوسرے دن، صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے“ یادگار صفحہ ۶۵

(۲) غالبؔ معاصرین کی نظر میں

(۳) ایرانی شعراء سے مؤازنہ

(۴) معاصرین سے مؤازنہ

(۵) بقائے دوام

غالب اپنی نظر میں

غالبؔ کا تمام "سرمایۂ حیات" تعلّی سے بھرپور ہے، وُہ استادانِ فن کا معتقد اور معترف تھا، اور اس نے فردوسی سے لے کر قاآنی کی کھُل کر تعریف کی ہے، اور نظامیؔ، سعدیؔ، سنائیؔ، عطارؔ، رومیؔ، انوریؔ، خاقانیؔ، ظہیرؔ، امیر خسروؔ، حافظؔ کمالؔ، فغانیؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، کلیمؔ، شفائیؔ، آملیؔ، زلالیؔ، صائبؔ، عرفیؔ، فیضیؔ، اسیرؔ اور حزیںؔ کی کامیاب پیروی کی ہے، اور حق ادا کیا ہے، مندرجہ ذیل اشعار بطور شہادت پیش کئے جاتے ہیں:۔

آن کہ پندارد حافظؔ بودہ است   غالبِ آشفتہ بُود آن نیز ہم

مسنج شوکت عرفیؔ کہ بُود شیرازی   مشو اسیرِ زلالیؔ کہ بُود خوانساری

بسومنات خیالم درآ، تا بینی   روان فروز بر دوشہای زُناری

میتوان پنجہ از نظامیؔ بُرد   پارۂ جمع گر حواس کنم

کوُ بلبلِ شیراز؟ و کجا طوطیٔ آملؔ   تا پایہ بسنجم نواسنجی ہم را

لا، بلکہ اگر خواہم، از ین ہر دو سخنور   تحسین روِش کلک دل آشوب رقم را

نزول من بجہان بعدِ یک ہزار و دو و بیست [۱۲۰۰]

ظہورِ سعدیؔ و خسروؔ بہ شش صد و پنجاہ [۶۵۰]

سخن زنکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی؟
چو من بخوبیٔ عہدِ توام زخویش گواہ
بہ فنّ شعر چہ نسبت بمن نظیری را
نظیر خود بسخن ہم منم، سخن کوتاہ

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر دہلی زمن بہ گنجہ و شروان برابر است

جادہٗ عرفی و رفتارِ شفائیٔ دارم دہلی و آگرہ، شیراز صفاہانِ منست

چنان نگاشتہ ام این ورق کہ گر نگردد
فتد زدست، قلم نقشبندِ شروان را
گزیدہ ام روشِ خاص، کاندرین ہنجار
بپویہ پای بلرزد ظہیر و سلمان را

درفن سخن دم مزن، از عرفی و طالب
این آیۂ خاص است کہ برمن شدہ نازل

غالب، بشعر کم زظہوری نیم، ولی
عادل شہٗ سخن رس و دریانوال کو؟

چون ننازد سخن از مرحمتِ دہر
کہ بُرد عرفی، و غالب بعوض باز دہد

بُود غالبؔ عندلیبی از گلستانِ عجم
من ز غفلت طوطئ ہندوستان نامیدمش

اندرین شیوۂ رفتار کہ داری غالبؔ
گر ترقی نکنی، شیخ علی را مانی

من خود عدیلِ خویشم، و نبود عدیل من
چوُن خود مرا بغُصّہ فنا کرد روزگار

عمرہا چرخ بگردد، کہ جگر سوختہ ٔ
چوُن من، از دوُدۂ آذر نفسان خیزد

غالبؔ معاصرین کی نظر میں

جیسا کہ اوُپر بیان کیا جاچکا ہے، غالبؔ کے دوست زیادہ اور دشمن کم تھے، اور دشمن بھی اُس نے خود بنائے تھے، بہر حال، استاد ذوقؔ اور اُس کے قرائن بشل آزادؔ اور ہُدہُد، گل محمد مکرانی ناطقؔ اور مولوی احمد علی احمدؔ نے اُس کے خلاف قلم اُٹھایا، اس کے برعکس، مولوی فضلِ حق خیرآبادی، آزردہؔ، شیفتہؔ، مولوی سراج الدین احمدؔ، کفایت خاں ہراتیؔ اور حالیؔ نے مخاصمین کے دانت کھٹے کر دیئے، حالیؔ نے تو یادگارِ غالبؔ میں آزادؔ کی غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں کا پول کھول کر رکھ دیا، بقولِ حالیؔ

"الغرض، مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے، کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفیؔ اور نظیریؔ کے لگ بھگ، اور ظہوریؔ سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوریؔ سے

لگ بھگ، اور عرفی اور نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے .... ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا، کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا۔ اور چونکہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے، اِس لئے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے، کہ قدیم طرز کی شاعری و انشاپردازی میں ایسے باکمال لوگ اِس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔" [1]

حکیم مومن خاں مومن، غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، رخشاں اور سید غلام علی خاں وحشت غالب کے کلام پر فریفتہ تھے، حالی نے لکھا ہے:-

"نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے، اور صائب و کلیم وغیرہ سے اُن کو بمراتب برتر و بالا سمجھتے تھے، نواب ضیاء الدین خان کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ترک لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی، اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا، سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے، کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا، تو عربی میں دُوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا، اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا، تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا"۔ [2]

ایرانی شعراء سے مؤازنہ

فارسی شاعری مشاہیرِ فن سے مالا مال ہے سعدی، خسرو اور جامی جامعیت

---

[1] یادگار، صفہ ۴۲۳، ۴۲۴، [2] ایضاً صفہ ۲۰۲، ۲۰۳،

ہیں، فردوسی اور نظامی رزمیہ شاعری ہیں، نظامی، خسرو اور جامی بزمیہ شاعری ہیں، سنائی، عطار اور رومی تصوف ہیں، مسعود سعد سلمان، فرخی، خاقانی، انوری، ظہیر، کمال، عرفی اور قاآنی قصیدہ گوئی ہیں، سعدی، خسرو، حافظ، فغانی، ظہوری اور نظیری غزلیات ہیں اور عمر خیامی رباعیات ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتے،

غالب نے ان سب کا کامیابی سے تتبع کیا ہے، اور ظہوری، نظیری، عرفی اور حزین کی ہمسری کی ہے، اس کا کلام ان کے کلام سے کسی طرح کم عیار نہیں ہے، غالب نے جامعیت ہیں سعدی کی تقلید کی ہے۔

فارسی گویانِ ہندوستان سے موازنہ

ہندوستان کی سرزمین سے سینکڑوں شاعر ایسے اُٹھے، جنھوں نے فارسی ہیں کمال کر دکھایا، اِن ہیں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، ابوالفرج رونی پیشرو اول تھا، مسعود سعد سلمان کے بعد امیر خسرو نے لاکھوں کی تعداد ہیں شعر کہے، اور ہر صنف ہیں طبع آزمائی کی، یہی وجہ ہے کہ طوطیٔ ہند کا خطاب پایا۔ فیضی، بیدل، آرزو، ٹیک چند بہار، مظہر جانجان، ناصر، شوکت، قتیل اور واقف نے بھی فارسی شعر کی خدمت کی، دورِ حاضر ہیں علامہ اقبال نے اپنی عظمت کا سکہ چار دانگِ عالم ہیں پھیلایا،

متقدمین کے علاوہ، غالب کا مقام دیگر شعرا سے افضل و اعلیٰ ہے، فارسی گویانِ ہند، بجز خسرو، فیضی اور اقبال اس کی خاکِ کف پا کو بھی نہیں پہنچتے، خود اقبال اُس کا معترف اور معتقد ہے،

حرفِ آخر

متذکرہ بالا خصوصیات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ غالب "نوائے شاعر فردا" ہے، اس کے فن کو ثباتِ دوام حاصل ہے، اور وہ دوسرے مشاہیر

فن کی طرح زندۂ جاوید رہے گا، بقولِ خود :۔

تا ز دیوانم، کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
این می از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ اند
شہرتِ شعرم بگیتی، بعدِ من خواہد شدن

غالبؔ میں شاعرِ فردا کی تمام خوبیاں اور خصوصیات موجود تھیں، یہ اور بات ہے کہ اُس کے اپنے زمانے نے اُس کی قدر نہیں کی، مگر آج وُہ اپنی وفات کے ایک سَو سال بعد دنیائے علم وادب کے اُفق پر آفتابِ عالمتاب بن کر چمک رہا ہے، اور جب تک اردو اور فارسی زبانوں کا رواج باقی ہے، وہ رہتی دنیا تک اسی آب وتاب سے چمکتا رہے گا،

کتابیات

اردو اور فارسی

ا

آب حیات	محمد حسین آزاد	دہلی ، ۱۸۹۶ء
اردو (مجلہ)	انجمن ترقی اردو (ہند)	دہلی ،
اردوئے معلیٰ	مرزا غالب	الہ آباد، ۱۹۲۷ء
آیاتِ غالب	سید نذیر علی شاہ	لاہور، ۱۹۶۹ء

ب

بیاض غالب	ادارۂ فروغ ادب	لاہور، ۱۹۶۹ء

ت

تذکرہ ،	الشعرائے اورنگ آباد	محمد سردار علی	حیدر آباد، ۱۹۲۶ء
" ،	الشعرائے بہار	عزیز الدین احمد	لکھنؤ ، ۱۹۲۷ء
" ،	دکن	عبدالجبار ملکاپوری آصفی	حیدر آباد،
" ،	الشعرائے دولتشاہ	دولت شاہ سمرقندی	لندن
" ،	جواہر سخن	محمد مبین چڑیا کوٹی	۱۹۳۵ء
" ،	چمنستان الشعرا	لچھمی نرائن شفیق	حیدر آباد ۱۹۱۱ء
" ،	خزانۂ عامرہ	میر غلام علی آزاد	لکھنؤ ۱۹۰۰ء
" ،	خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام	دہلی ۱۹۱۷ء
" ،	صبح گلشن	سید علی حسن بھوپالی	۱۸۷۷ء
" ،	طبقات الشعراء	مولوی کریم الدین	دہلی ۱۸۴۸ء
" ،	عقدِ ثریّا	غلام ہمدانی مصحفی	" ۱۹۳۴ء
" ،	کاکوری	حافظ محمد علی	لکھنؤ ۱۹۲۷ء

تذکرہ ، گل رعنا	سید عبدالحی			
،، ، گل عجائب	اسد علی خان تمنا			۱۳۴۲ھ
،، ، گلزار ابراہیم	نواب ابراہیم علی خان			
،، ، گلستان بیخزاں	قطب الدین باطن	لکھنؤ ،		۱۸۷۵ء
،، ، گلشن بیخار	نواب غلام مصطفیٰ خان شیفتہ	،، ،		۱۸۸۴ء
،، ، گلشن گفتار	سید محمد	حیدر آباد ،		۱۹۳۴ء
،، ، گلشن ہند	مرزا علی	علیگڑھ		
،، ، مآثر کرام (سرو آزاد)	میر غلام علی آزاد	حیدر آباد		۱۹۱۳ء
،، ، مخزن الشعراء	فائق			
،، ، مخزنِ نکات	قیام الدین قایم چاندپوری			۱۹۲۹ء
،، ، نکات الشعراء	میر تقی میر			
،، ، ہندو شعرار	عشرت لکھنوی	لکھنؤ		۱۹۳۱ء
،، ، ہند	میر حسن	دہلی		
،، ، ہندی گویان	ایم قدرت اللہ قدرت			
تیغ تیز	مرزا غالب			

چ

چند ہمعصر	مولوی عبدالحق	کراچی	۱۹۵۹ء
چہار مقالہ	نظامی عروضی	لاہور	۱۹۲۵ء

ح

حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	دہلی	۱۹۳۹ء

خ

خطوط غالب	مہیش پرشاد	الہ آباد	۱۹۴۱ء

د

دربارِ اکبری — محمد حسین آزاد
درفشِ کاویانی — مرزا غالب — دہلی ۱۸۶۵ء
دساتیرِ آسمانی (متن) — ملا فیروز کاؤس — بمبئی ۱۸۸۸ء
دیوان — ابوالفرج رونی — رونی — تہران ۱۳۰۴ شمسی
〃 حافظ — خواجہ شمس الدین محمد — خلخالی ایڈیشن
〃 خاقانی — خاقانی — تہران ۱۳۱۶ شمسی
〃 غالب (اردو) — مرزا غالب — متعدد ایڈیشن
〃 شمس تبریزی — مولانا جلال الدین رومی — نکلسن ایڈیشن لندن ۱۸۹۸ء
〃 صائب — مرزا محمد علی — نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۶ء
〃 ظہوری — نورالدین ترشیزی — نولکشور کانپور ۱۸۹۷ء
〃 قصائد و غزلیات عطار — فریدالدین عطار — تہران ۱۳۱۹ شمسی
〃 مسعودِ سعدِ سلمان — سلمان — 〃 ۱۳۱۸ شمسی
〃 نظیری — نظیری نیشاپوری — لاہور ۱۹۴۵ء

ذ

ذکرِ غالب — ڈاکٹر مالک رام — ۱۹۳۸ء اور ۱۹۶۴ء

ر

روحِ غالب — سید محی الدین زور — حیدرآباد ۱۹۳۹ء
ریاض السلاطین — ترجمہ غلام حسین سلیم — بمبئی ۱۹۳۰ء

ز

زمانہ (مجلہ)

س

سبد باغ دو در — مرزا غالب (وزیر الحسن عابدی) — لاہور ۱۹۶۰-۶۱ء

سیدچین	مرزا غالب (مالک رام)	دہلی	۱۹۳۸ء
سیر المصنفین	محمد یحییٰ تنہا	"	۱۹۲۴ء
ش			
شعر العجم	شبلی نعمانی	اعظم گڑھ	۱۹۲۱ء
شعر الہند	عبد السلام	"	
ع			
عود ہندی	مرزا غالب	لکھنؤ	۱۹۲۵ء
غ			
غالب	مولانا غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۳۹ء
غالب نامہ	شیخ محمد اکرام	"	"
ق			
قتیل و غالب	سید اسد علی انوری		۱۹۳۹ء
قصائد انوری	اوحد الدین	لکھنؤ	۱۸۹۷ء
" خاقانی	افضل الدین ابراہیم	علی گڑھ	۱۹۲۵ء
" ظہیر	ظہیر فاریابی	لکھنؤ	۱۹۱۳ء
" عرفی	سید جمال الدین شیرازی	"	۱۹۲۸ء
" قاآنی	حکیم حبیب	کلکتہ، حبل المتین پریس	
قطعات ابن یمین	امیر فخر الدین محمود فریومدی	تہران اڈیشن	

ک

کلیات	بیدل	مرزا عبدالقادر	بمبئی	
"	حزیں	شیخ علی حزیں	لکھنؤ	۱۸۹۳ء
"	سعدی	اقبال آشتیانی ایڈیشن	تہران، ۱۳۱۷ شمسی	
"	عراقی	فخر الدین	لکھنؤ	۱۹۰۹ء
"	عناصر دیوان خسرو	امیر خسرو	"	۱۹۱۶ء
"	نظم فارسی	مرزا غالب	"	۱۹۲۵ء
"	نثر فارسی	مرزا غالب	"	۱۸۸۷ء
"	نظیری	محمد حسین نیشاپوری	مخطوطہ، علی گڑھ	

ل

لطائف غیبی	مرزا غالب	دہلی	۱۸۶۴ء

م

مآثر غالب	قاضی عبدالودود	علی گڑھ	۱۹۴۹ء
محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری		۱۹۲۸ء
مرآۃ الشعراء	عبدالرحمٰن	دہلی	۱۹۳۶ء
مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق	لاہور	۱۹۴۵ء
معارف (مجلّہ)		اعظم گڑھ	
مکاتیب غالب	مولوی امتیاز علی عرشی	بمبئی	۱۹۳۷ء
مقدمۂ شعر و شاعری	حالی		
مقدمات عبدالحق	مولوی عبدالحق		

ن

نادرات غالب	آفاق حسین	کراچی	۱۹۴۹ء
نکات غالب	نظام بدایونی		
نگار، مجلّہ	غالب نمبر	جنوری	۱۹۳۲ء

ی

یادگار غالب	حالی	الہ آباد	۱۸۶۶ء
یوسف ہندی در قیدِ فرنگی	محسن شبیر	حیدر آباد	-

ENGLISH

B

Biographical Dictionary, Chamber's.

Bibliography of Persian, by Lt. Col. A. T. Wilson, 1930.

Biographical Notices of Persian Poets, by Sir Gore Ouseley, 1846.

C

Catalogue of Persian MSS in the Library of India Office R.E., the.

Catalogue of Arabic, Persian and Urdu MSS in the Library of the University of Bombay, by S. Abdul Qadir Sarfaraz.

Catalogue of Books and MSS in the Royal Asiatic Society, Bengal, by Ivanouv.

Catalogue of Arabic, Persian and Turkish MSS in the British Museum, by Dr. Charles Rieu.

Catalogue of Arabic and Persian MSS in the State Library of the Kings of Oudh, by Sprenger.

Chiefs, Rajas and Zamindars of Indian States, by L.N. Ghose, 1879.

D

Development of Metaphysics in Persia, by Dr. Sir M. Iqbal, London, 1908.

Dictionary of Indian Biography, by C.E. Buckland, 1906.

Dictionary of Islam, by A.W. Hughe's.

Dictionary of Oriental Biography, by T. W. Beale, 1894.

E

Early Persian Poets of Persia, by Iqbal Husain, Patna University, 1937.

Early Persian Poetry, by A. V. W. Jackson.

East India Guide, by Dr. John Gilchrist.

Encyclopeadia Brittannica, Editions XII and XIV.

Encyclopaedia of Islam.

H

Hindustan Review, Calcutta, 1873 to 1947.

History of Muslim Education in India, by Sayyid Mahmud.

History of Persian Language and Literature at the Mughal Court, by M.A. Ghani, Allahabad, 1930.

History of Urdu Literature, by Ram Babu Saksena, Allahabad, 1927.

I

Indian Musalmans, by W.W. Hunter, 1876.

Indian Princes, by M. Griffith, 1894.

Influence of Arabic Poetry on the Development of Persian Poetry, by Dr. U. M. Daudpota, Bombay, 1936.

Influence of English Literature, by Dr. S. A. Latif, London, 1924.

International Encyclopaedia.

L

Lectures and Addresses, by Garcion De Tacy, A. T. Urdu Edition.

Life and Works of Amir Khusru, by Dr. Waheed Mirza.

Literary History of the Arabs, by Dr. R. A. Nicholson, 1907.

Literary History of Persia, by Prof. E. G. Browne, 1930.

M

March of Education, by Dr. A. C. S. Gilani.

Muslim Dynasties, by G. Lane Poole, 1894.

Mughal Empire, by H. G. Keene, 1866.

N

National Biographical Dictionary.

P

Persia, Past and Present, by A. V. W. Jackson, 1906.

Persian Portraits, by Arbuthnot.

Princes of India, by Sir E. A. B. Sullivan.

Portraits of Princes, by Eden Emily.

Promotion of Learning, by N. N. Law, London, 1916.

S

Shaikh Muhammad Ali Hazin, His Life, Times and Works, by Sarfaraz Khan Khattak, Lahore, 1944.

R

Rajas of the Punjab, by M. Griffith.

T

Two Elementry Treatises on Arabic Syntax, by Captain A. Lockett, Calcutta, 1814.

Two Narratives of the Mutiny of Delhi, by C. T. Metcalfe, London, 1898.

اِشاریہ

I.

Indian [illegible], by W. W. Hunter, [illegible]

Indian [illegible] by [illegible]

[illegible]

[illegible] by [illegible]

[illegible] of English Literature, by [illegible]

[illegible]

[illegible] Encyclopaedia.

[illegible]

[illegible] by [illegible]

[illegible]

[illegible] History of the [illegible]

[illegible]

[illegible] History of [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] by [illegible]

N.

National Biographical Dictionary.

P.

[illegible] Past and Present, by [illegible]

[illegible] Portraits, by [illegible]

[illegible] of India, by [illegible]

Portraits of [illegible], by [illegible]

[illegible] of [illegible], by [illegible]

[illegible]

[illegible] by [illegible]

[illegible]

[illegible] by [illegible]

[illegible]

[illegible]

اِشاریہ

ا

ب

چ

ح

خ

د

ذ

ر

ز

س

ش

غ

ق

ک

گ

ل

م

ن

و

ہ

ی